

نفسیات وما بعد النفسیات

رئیس امر و ہوی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



نفسیات و مابعد النفسیات

حصہ اول - دوم - سوم (مکمل)

مرچو

اے مالکِ کُل میرے والدین پر رحم فرما کہیں امروہوی۔ آمین

CLASSIC BOOK STALL

UBL, GPO Chowk, Saddar,

Rwp. Mob: 0345-5092710

*** SUNDAY ONLY ***

ویکم بک پورٹ

اردو بازار کراچی، پاکستان

جملہ حقوق بحق پبلشر "ویلکم بک پورٹ" محفوظ ہیں
اس کتاب کے کسی بھی حصے کی فوٹو کاپی، اسکیننگ یا کسی بھی قسم
کی اشاعت پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔
قانونی مشیر: وحید نور

اشاعت : جنوری 2013ء
اہتمام : قرزی
کمپوزنگ : محمد آصف
قیمت : 600/- روپے

پبلشر
ویلکم بک پورٹ
بازار کراچی۔ پاکستان

فون : 021-32639581-32633151
اس : 021-32638086
ایمیل : welbooks@hotmail.com
wbp@welbooks.com
www.welbooks.com : ویب

فہرست مضامین

11	یہ کتاب !
25	پرسنل تذکرہ
29	پراسرار نقش قدم
31	زمان و مکان
35	انسانی ذہن
37	آدی اور خیال
40	جنگل کا قانون
43	حیوانی آدی
46	انسانم آرزوست
50	بھرم ساز عہد
52	پیساری کی دکان
57	ذہن کی تین کیفیات
62	مابعدالطبیات کا نقطہ نظر
63	روحیت
70	حیکر نور
73	جذبات کا رنگ روپ
76	متبادل طرز شخص

155	مشورے، تجربے، مشاہدے
156	الفاظ کی جادوگری
157	یہ فیصلہ
158	جس نے خود کو پہچانا
159	کراچی تک پرواز
160	آپ کو دیکھا کہ
160	ہم زاو کا عمل
161	حادثہ جانکاہ
161	تبدیلی قلب کے لئے
164	یہ بات
164	ہلڑ بالڑ کی
165	گوار کی دھار
167	کچ راہی بہت
168	دنیا جوان کی میرے ہمہ شباب میں
170	بے جنس ہوں
171	واحد علاج
172	مرد خوں کو دیکھ کر
174	ہولناک خواب
175	بخوشی دلہن بنو
177	جادو اور وظیفے
182	مرکی یا آسیب
183	نظر لگ گئی ہے
185	دانت پیستا

80	گلستان کا آغاز
85	دیدہ و ناریدہ
88	یہ کیا تضاد بشر
93	ایک عجیب تجربہ
95	احساس کتری
99	شعور برتر
107	مقتناطیسی دائرہ
112	ذاتی تحلیل نفسی
117	تعبیر خواب
120	نفس کا محافظ خانہ
124	نئی نسل کا کرب
126	فاسد خیالات کا جہوم
127	ازیت ناک
128	خودکشی کا ارادہ
129	اہم پہلو
133	دل کے معاملات
135	غلیظ عادت
135	جنسی مسئلہ
137	طلسمی گتہ
139	اپنی اصلاح پہلے
143	آتش خاموش
151	شیخ سعدی
154	خود تباہی

- 215 بات کی باتیں
- 216 نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں
- 217 چڑیل پر کیا گزری؟
- 218 آہ وہ اجنبی
- 220 شدت تاثر
- 220 ذہنی ڈرامہ سازی
- 221 س۔م۔کی تحلیل نفسی
- 223 ادا شناس
- 223 پر چھائیوں کا پیچھا
- 224 میں ایک مسئلہ ہوں
- 225 57 لڑکیاں
- 226 تبدیلی قلب
- 227 داستانِ عبرت
- 228 امید کی شمع
- 229 بے نام بی کے نام
- 230 تم آگ ہو
- 231 زینہ مقفل ہو گیا
- 232 لڑکے میں لڑکی
- 234 جی کی بھڑاس
- 235 کیا کیا جائے
- 236 نادرہ سنو
- 237 تعریف اس خدا کی
- 238 پورا اور بیزار

- 185 خواب خرابی
- 187 فساد کا آغاز
- 187 روحانی محبت
- 189 دماغی مرض
- 191 عورت کی قسمیں
- 192 چار چار قسمیں
- 194 خودکشی یا طلاق
- 196 زندگی ایک الیہ
- 196 آنکھیں۔ آنکھیں۔ آنکھیں
- 196 عجیب و غریب
- 198 پاگل نہیں ہوں
- 199 تل اور مس
- 200 شخصیت اور آنکھیں
- 201 خدائے خشن اور وہم
- 202 شاہ دولہ کے چوہے
- 205 رودادِ غم
- 206 چھٹی حس کی بیداری
- 207 خونی حادثہ
- 209 وہ چلے گئے
- 210 معالج و مریض
- 211 تنویری عملیات
- 213 نئی عورت کا ظہور
- 215 پر چھائیوں کے پیچھے

279	متفرقات
282	روح کا جنازہ
283	نیرھی اینٹ
285	خون میں لت پت
286	روحیت پسند
286	ماں یا داشتہ
287	پرچہ راستہ
288	مت جھانکے
289	خلام میں پرواز
290	جنس کی تبدیلی
292	وہی خلل دماغ
293	خدا را بچائیے
295	عجیب رقابت
296	بیادیں نہیں خور لڑائی
297	اندھا باپ
297	تو گنوار ہے
299	خودکشی کر لیں گے
300	ن احمد اکیلا
300	روشنی دکھائیے
301	حسن بلائے جان
301	روح کی روح
302	لو میرج
303	قلبی کیفیت

240	ہوائی قلعے
240	اے مجبور لڑکی
242	روشنی طبع
253	لکنت
254	کیا جواب دوں؟
255	ماسوں زاوہینش
257	بنات العلماء
258	بھالی یا؟
258	عشق اور اعتدال
260	خواب ہائے بیداری
261	ابتدا اور انتہا
262	دل و دماغ میں جگ
263	عشق کے بعد عقد
265	متفرقات
266	پتیل تلے
267	بے قراری کی حشر سامانیاں
268	نفاذ شریعت
270	نشان عصمت
271	شراب اور عیاشی
273	کاش صرف ایک بار
274	بے رنگ مادہ
275	خودکشی یا قتل
278	بات کا بتلگو

یہ کتاب!

اگست 1963ء میں کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر میں نے روزنامہ جنگ (کراچی، راولپنڈی، کوئٹہ اور لندن) میں نفسیات و مابعدالنفسیات پر ایک سلسلہ مضمون شروع کیا تھا، اس موضوع کو چھیڑتے وقت اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ سلسلہ نگارش خود بخود وقت کی کسی انجانی اُن دیکھی مگر حقیقی اور عملی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ اور سبب بن جائے گا اور لکھنے والے کا ہاتھ اندھیرے میں معاشرے کی کسی ایسی دکھتی رگ پر جا پڑے گا۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے اب تک محروم توجہ رہی ہے۔ یہ سلسلہ مضامین شروع کرنے کے چند ہفتے بعد ہی محسوس ہو گیا کہ نادانستگی میں

بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا گیا ہے۔ آپ اس فقرے پر مجھے ملامت کر سکتے ہیں اور شاید میں نے بھی یہ کہاوت بے موقع بلکہ گستاخی کے ساتھ استعمال کی ہے، مگر کیا کروں ”طبی نفسیات“ (جس کا تعلق ذہنی امراض اور اس کے علاج سے ہے) کے کسی پہلو پر آپ جب بھی غور کرنے بیٹھیں گے۔ یہی محسوس کریں گے کہ سماج کے گوشے گوشے میں ہر طرف ذہنی امراض کے تاریک سائے منڈلا رہے ہیں اور اس عہد کا ہر شخص اپنے دل میں کوئی نہ کوئی زخم چھپائے پھر رہا ہے۔

کس نے دیکھے ہیں تری روح کے رستے ہوئے زخم؟

کون اُترا ہے ترے ذہن کی گہرائی میں

ہاں تو نفسیات و مابعدالنفسیات کے موضوع پر ہفت روزہ مضامین کا یہ سلسلہ

303	محبت کی تحلیلی
305	عشق اور عقد
309	اگیا ہیتال
311	مقام قدانی
312	کتنی عجیب لڑکی
313	باریک بحث
316	بے وفا شوہر و محبوب
316	عقد ثانی
317	ل۔م کا بیان
318	دو سوال
319	نسل نو کے امراض
320	تائے کا لڑکا
323	صوبائی تعضات
323	اکیس مرتبہ
324	مانچسٹر سے
326	دو روحمیں

☆☆☆

اگست 1963ء میں شروع کیا گیا تھا۔ کچھ کم ڈھائی سو پختے سے برابر "جنگ" کی اشاعت یکشنبہ (سنڈے ایڈیشن) میں ایک موضوع پر طرح طرح سے قلم فرسائی ہو رہی ہے۔ لیکن تاحال نہ لکھنے والا آکٹایا پڑھنے والے!

حدیث شوق نے کتنے نکتے بنا ڈالے

بس ایک لفظ محبت کی داستان کے لئے

راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ یہ مضامین نہ ماہرانہ ہیں نہ مجتہدانہ! ان کی تحریر میں نہ ادبیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے نہ انشائیت کو، نہ یہ مقالے ہیں نہ انشائیے! بس چند مضمونچے ہیں۔ جنہیں قلم برداشتہ لکھا گیا ہے، ہر پختے چہار شنبہ کی صبح۔ ان مضامین کی تحریر و نگارش کے لئے مخصوص ہے۔ چہار شنبہ کی صبح طلوع ہوئی اور اس موضوع سے تعلق رکھنے والا جو مسئلہ ذہن میں ہوا۔ اس کو بغیر قصد و اہتمام کے لفظ و عبارت کی شکل میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ لکھتے وقت زیر بحث مسئلے کے چند پہلو کاغذ پر منتقل ہو گئے۔ چند گنگنک پہلو (جن کے بارے میں فکر خود واضح نہ تھی) ذہن کے اندر اٹک کر رہ گئے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کسی مضمون کی تحریر کے بعد اشعار کا طرہ محسوس کیا ہو ہر مرتبہ یہی خلش باقی رہی کہ ابھی بہت کچھ کہنے اور لکھنے سے رہ گیا ہے۔

انفاس سحر لاکھ سہی ترجمہ شوق

کچھ اور بھی کہنا ہے مجھے لہجہ شب میں

جی ہاں۔ ان مضامین سے آپ کسی جدت فکر و خیال، کسی فلسفہ طرازی یا کسی نظریہ حیات و کائنات کی وضاحت کی توقع نہ رکھیں۔ مصنف نہ آشنائے راز ہے نہ فلسفہ طرازا! اور اگر ہوتا بھی تو نفس انسانی کے گونا گوں پہلوؤں اور ہولکوں مظاہر کی ترجمانی اور ترجمہ۔ نہ کسی رازداں کے بس کی بات ہے نہ فلسفہ خواں کے! یہ ایک ایسا سرخفی ہے جس کے عارف صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سلسلہ معانی ہے جہاں الفاظ کے تمام شیرازے بکھر جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی کی تحقیق اب

تک نہ ہو سکی۔ جہاں بھی میں نے نادانی کی راہ سے نفس انسانی کی حقیقت کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں الفاظ و معانی کا سررشتہ گم ہو کر بکواس شروع ہو گئی ہے:

اے گوش وقت! سن کہ ادا کر رہا ہوں میں

وہ لفظ جس کے حرف فراموش ہو گئے

تاہم اب تک اس سلسلہ مضامین کی مقبولیت حیرت انگیز ہے کبھی کبھی تو مضمون نگار کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ مضامین زیر نظر کی پسند عام کے سلسلے میں کسی فریب حواس یا التباس خیال (خود فریبی) کے ذہنی بچاک (کام پلکس) میں مبتلا تو نہیں ہو گیا۔ بظاہر پڑھنے والے ان مضامین کو پسند کرتے ہیں، حقیقت حال کیا ہے نہیں معلوم۔

رموز ہستی ہیں سخت مبہم روایتوں کا یقین نہ کرنا

کہ راویان رموز ہستی روایتوں کے غلام بھی ہیں

پچھلے پانچ سال میں یہی اندازہ ہوا ہے کہ لاکھوں افراد ان مضامین کا مطالعہ نہایت مستعدی اور پابندی سے کرتے ہیں اور مطالعے کے سلسلے میں اس قدر چوکس رہتے ہیں کہ جہاں مصنف کوئی غلطی یا سادہ آرائی کرتا ہے اسے نوک دیتے ہیں اور اگر مضمون کا کوئی نکتہ یا پہلو پسند آ جاتا ہے پھر داد تحسین میں کی نہیں کرتے۔ متعدد مضامین کا ترجمہ سندھی، بنگالی، انگریزی میں ہو چکا ہے نہ جانے کتنے انجان دوست ایسے ہوں اور ایسے ہیں۔ جنہوں نے شروع سے اب تک اس سلسلہ مضامین کو کتابی شکل میں جمع کر لیا ہے۔ بعض نے ان مضامین کی تلخیص کر کے یعنی نیچوڑ کر، نفسیات و مابعدالطبیات کے ان تمام نکات کو (اگر وہ نکات ہیں) جواب تک زیر بحث آچکے ہیں رسالے کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ اس دوران میں ہزاروں خطوط پاکستان و بیرون پاکستان سے موصول ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط افراد کی اہم ترین نفسی اور نفسیاتی کیفیتوں اور ذہنی مظاہر پر مشتمل تھے (ہزار افسوس کہ میں نے خطوط کے اس نادر ترین ذخیرے کو اس اندیشے اور احتیاط کے سبب ضائع کر دیا کہ مبادا کسی کی نظر پڑ جائے۔ بہر حال میں ان خطوط کا امین تھا اور ہوں)

نفس جسمی امراض کا کوئی پہلو یا گوشہ ایسا نہیں ہے جسے ان خطوط میں بار بار طرح طرح سے نہ پیش کیا گیا ہو۔ نفس جسمی امراض وہ بیماریاں ہوتی ہیں جن میں نفس اور جسم دونوں مرض کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بیماریاں (ذہنی گریہاں اور جذباتی الجھاؤ کے نتیجے میں) نفس سے پیدا ہوتی ہیں مگر رفتہ رفتہ جسمانی روگ کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ مثلاً دماغی تشویش کے سبب بد ہضمی کا دورہ، یا شدت غم میں سپ (T.B) کا حملہ! ان خطوط کے علاوہ پچھلے بارہ سالوں میں اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں افراد کی براہ راست ذہنی چھان بین کا موقع ملا۔ ان سے تفصیلی گفتگو کی گئی، ان کے دکھ درد سنے گئے اپنے دکھ درد سنائے گئے اس طرح نفس انسانی کے بے شمار پہلو جن سے میں بے خبر تھا نگاہوں کے سامنے آ گئے:

سجے تھے ہم کہ عشق ہے اک حسن اتفاق

دیکھا تو واقعات کا اک سلسلہ ملا!

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں شروع میں کوئی اندازہ نہ تھا کہ نفس شناسی

(نفسیات کی اصطلاح استعمال کرنے جی نہیں چاہتا) اور مابعدالطبیات کی شمع ہاتھ میں لے کر مجھے اس وادی ظلمات کے کس گوشے میں سفر کرنا ہے؟ خدا شاہد ہے میں اپنی منزل مقصود سے بے خبر تھا۔ خدا شاہد ہے میں اپنی منزل مقصود سے بے خبر ہوں۔

گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

نفس شناسی کے سلسلے میں دوسرے حضرات کی طرح بہت حد تک میرا نقطہ نظر بھی کتابی رہا ہے۔ شروع مضامین میں تو مدرسیت اور مکثیت کی یہ شاگردانہ ذہنیت بُری طرح ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ شعور اور لاشعور کے متعلق جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے بس وہ صحیح ہے۔ نفسیات اور مابعدالطبیات کے بارے میں اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں۔ بس وہ حرف آخر ہے، ذہنی بیماریوں کے متعلق سکرنڈ، فرائڈ، ایڈلر اور نیگ نے تحقیقات کی ہیں

۱۔ قاری میں رواں شناسی کہتے ہیں

ان پر اضافہ ممکن نہیں۔ درحقیقت حیات و کائنات کے بنیادی قوانین کے بارے میں سب کچھ جان لینے کا یہ ادعا، انیسویں صدی کے طبیعیات دانوں نے کیا تھا۔ طبیعیات نے (جو سائنس کی تعریف پر سو فیصدی پوری اترتی ہے) اب اس دعوے کو ترک کر دیا۔ لیکن ہماری نام نہاد سائنسی نفسیات کے بعض مکاتیب فکر و خیال کے مدی اب تک نفس انسانی کی ہمدانی کے مدی ہیں حالانکہ یہ وہ مقام ہے کہ:

آئرا کہ خبر لحد۔ خبرش باز نیامد!

معرفت نفس اور معارف نفس کی حد تک مجھے کسی "خبر داری" کا دعویٰ نہیں ہے البتہ اس سفر (نفسیات و مابعدالطبیات کے سلسلہ مضامین) میں بہت سے عجائبات نظر سے گزرے ہیں۔ نفس انسانی کے عجیب و غریب زندہ تجربوں سے سابقہ پڑا ہے بہت سے فوق العادہ نفسی مظاہر کے مطالعے کا موقع ملا ہے اور "ذہنی اعمال" کے ناقابل قیاس میکا نزم کے بعض حیرت ناک پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوئی ہے۔

اعتدائے کار میں نفسیات کے فن کو میں بھی ایک سائنس سمجھتا تھا جس طرح طبیعیات اور کیمیا! مگر براہ راست مشاہدات و تجربات سے پتہ چلا کہ صحت مند اور غیر صحت مند انسانوں کی تحلیل نفسی اور مطالعہ ذہن کے سلسلے میں کسی طے شدہ اصول اور کسی لگے بندھے قاعدے پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس فن یعنی نفسیات کا جو موضوع ہے وہ الیکٹران کے قوانین جست و خیز کی طرح تا حال ہر طرح کے انسانی تجربے اور تجزیے کی حد سے ماورا ہے۔

ذو صوٹا پھرتا ہوں خود اپنی بصارت کی حدود

کھو گئی ہیں مری نظریں مری چٹائی میں

پیشک فن نفسیات کے مختلف دبستان خیال ابتدا میں انسانی رویے اور کردار کے

۱۔ جسے پتہ چل گیا پھر اس کا کہیں پتہ نہ چلا

متعلق بہت حد تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں مگر جوں جوں ہم نفس شناسی کے راستے میں آگے سے آگے کی طرف بڑھتے ہیں، ہر طرح کے نشان منزل پس منزل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پہلے منزل پس منزل پس منزل اور پھر

راستے ڈوب گئے عالم تنہائی میں!

نفس انسانی کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ مہاتما بدھ سے لے کر آج تک کسی عارف نے اس سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا، ہمارے صوفیاء نے تو یہ کہہ کر اس بحث کو ناتمام چھوڑ دیا کہ من عرف نفسم فقد عرف ربہ (جس نے اپنے کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا) جب عرفا کا یہ عالم ہے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔

آشنا را حال این خلد دئے بریگاہ

یہ ممکن ہے کہ ہم کائنات کے بارے میں رتی رتی حقیقت معلوم کر لیں اور شاید علم کائنات ہمارے دائرہ عمل میں داخل ہے۔ مگر علم حیات؟ (حیاتیات نہیں؟) اور علم انفس؟ (نفسیات نہیں؟) ان حقیقتوں کو جاننے کے لئے تو شاید ہمیں کچھ اور ہی چاہنا ہو۔ علم و خبر ایجاد کرنے بچے ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے آلات ایچ ایچ خلا کی گہرائیوں کو ناپ سکتے ہیں۔ یہ تک بتا سکتے ہیں کہ فضا کے فضاں بعید تر جیسے میں ہوا کا دباؤ اور برقی مقناطیسی لہروں کا وزن کتنا ہے؟ لیکن کیا ہم خوف کے جذبے اور جذبہ جنس کے پہچان کا بھی وزن (کمپیوٹر کے استعمال کے باوجود) دریافت کر سکتے ہیں۔ کیا ہم جذبات کے عمل کا کوئی ریاضیاتی دائرہ مقرر کر سکتے ہیں۔ راقم المعروف نے جتنی محنت سے نفسیات خاص کے عمل طبی نفسیات کی ضخیم کتابوں کو حرفا حرفا اور سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ اس سے زیادہ دلچسپی، سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ذہنی امراض کے علاج کے سلسلے میں مغربی تکنیک پر عمل کیا۔ لیکن نہ فراڈ کی تحلیل نفسی سے کسی بیمار ذہن کو صحت نصیب ہوئی (ہوئی تو عارضی طور پر) اور نہ تلازمہ خیال کی تکنیک پر عمل کر کے کسی کے روحانی بوجھ کو کم کیا جاسکا۔ جوں جوں مطالعے کا دائرہ اور تجربے کا افق وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ "نفس انسانی"

سے تعلق رکھنے والے دوسرے فنون یوگ، تصوف، تھیا سونی، فن تنویم، عملیات، جادوگری، روحانی طریق علاج اور انسانی سپرنارٹل مظاہر یعنی ٹیلی پتھی (اشراق) ادراک ماورائے حواس EXTRA SENSORY PERCEPTION کشف، پیش بینی اور رویائے صادقہ وغیرہ سے بحث کرنے والے علوم یا فنون (جو چاہے کہہ لیجئے) کے مطالعے سے علمی اور عملی دلچسپی پیدا ہونے لگی اور اس طرح ذہن میں "مابعد النفسیات" کی بنیاد پڑی۔ نفسیات کو میں "فن" تسلیم کرتا ہوں، لیکن اگر مابعد النفسیات کوئی فن ہے تو یہ ایجاد بندہ ہے۔ یورپ و امریکہ کی ہیرا سائیکالوجی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے ذہن میں "مابعد النفسیات" کے جو اصول اور نظریات ہیں وہ اپنے ذاتی مشاہدات اور اپنے قریب ترین رفقا کار کے تجربات کی روشنی میں خود بخود مدون ہو گئے ہیں۔ ان کو کسی نے مرتب کر کے نہیں دے دیا۔ یوں کہئے کہ وہ خود مابعد النفسیات کی خواہش تھی کہ اسے ایک فن کی شکل میں مرتب کیا جائے۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردون ماس

نفس انسانی کے مضمون اور اس کے مطالعے سے میرا شخص جس قدر بڑھتا چلا گیا نئی نئی حقیقتیں منکشف ہوتی چلی گئیں۔ آخر میں نے نفسیاتی طریق علاج کی ایک نئی تکنیک پر عمل شروع کیا، جس میں بلاشبہ نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ یورپ و امریکہ میں ذہنی اور دماغی امراض کے علاج کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بجلی کے جھٹکے، انسولین تھراپی، غددی علاج یعنی اگر کوئی شخص گلے کے غدد و ہیراتھائی رائیڈ گیٹنڈ (غددہ ورقیہ) کے ناقص کیمیائی عمل کے سبب کند ذہنی اور دماغی انحطاط میں مبتلا ہو گیا ہے تو انجکشنوں اور دواؤں کے ذریعے غذا ورقیہ کے ناقص کیمیائی عمل کی بحالی کا طریقہ یا خواب آور دوائیں مسکن اعصاب اور بے حس کر دینے والے یا پھر فریب حواس (HALLUCIN GGENIC DRUGS) پیدا کرنے والی گولیوں کا استعمال پاکستان کے نفسیاتی کلینکوں میں بھی اسی طرز علاج پر عمل کیا جاتا ہے۔ مگر دوا اور انجکشن کے ذریعے علاج کی

۱۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کمرۂ ارض پر نوب انسانیت کی مجموعی عمر کتنی ہے چپاس ہزار سال یا سو لاکھ سال)۔

نفس کی کارکردگی پر کیا روشنی ڈالتے ہیں۔ تعبیر خواب سے فرد کے کردار کی شناخت اور اس کے امراض کی تشخیص میں مدد لی جاسکتی ہے۔ روحانی شفا بخشی کے اصول کیا ہیں؟ وہ چیز جسے سپرنارٹل یا خارق العادت کہا جاتا ہے۔ کیا ہے کیوں ہے؟ مذہبی عقائد سے تعبیر نفس اور تزکیہ جذبات کے سلسلے میں کیا کیا فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ ان تمام مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ نفسیات کا فن بہت حد تک انسانی حواس خمسہ (بصرہ، شامہ، سامعہ، ذائقہ اور اہمہ) کے عمل اور رد عمل سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے بہت سے علماء علم النفس کے نزدیک، نفسیات کے فن کو عضویات سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ جدید نفسیات میں انسان کے باطنی حواس خمسہ (حافظہ، واہمہ، تخیلہ، مصورہ اور حس مشترک) سے یا تو اعتدائی نہیں کیا گیا اور کیا گیا ہے تو انہیں بھی حواس خمسہ ظاہری کا نتیجہ قرار دے کر اس بحث کو نامہ تمام چھوڑ دیا گیا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک طرف تو نفسیات کے فن کی یہ گہم بازاری ہے کہ خدا کی پناہ اور دوسری طرف نفسیاتی امراض کی شدت ہے کہ معاذ اللہ۔ نفسیات اطفال، نفسیات ذکور، نفسیات جنس، نفسیات اثاث، تعلیمی نفسیات، اجتماعی نفسیات، صنعتی نفسیات اور مہم جاننے والے ہزار قسم کے فنون نفسیات وجود میں آگئے ہیں۔ مہم جدید کی نفسیات، فرد کے مطالعہ کردار تک محدود ہے اور وہ بھی علمی حد تک! پھر فرد کے مطالعہ کردار سے، گروہوں کے مطالعہ کردار فن نے جنم لیا اور نفسیات کے پودے سے ایک شاخ تراش کر سماجیات کی الگ پود لگا دی گئی جو اب برگ و بار لاری ہے۔ میں سوشیالوجی اور سائیکالوجی کا مومن ہوں نہ کافر۔ اگر یہ فنون فرد اور جماعت کے لئے مفید ہیں تو بتائے صلح کے قانون کے تحت زندہ رہیں گے، زندہ رہنے کی صلاحیات نہیں ہے تو مرجائیں گے۔ میں نے اس کتاب میں جا بجا اپنی معلومات کی حد تک، نفس انسان کی مباحث اور مطالعہ کے سلسلے میں فن نفسیات کے اصول اور طریق کار کی وضاحت کی ہے۔ آئندہ کتابوں میں بھی استفادے کی یہ صورت برقرار رہے گی۔ لیکن یہ استفادہ برہنہ ضرورت ہے نہ کہ برہنہ حقیقت، کیونکہ اس تمام کارخانہ جسم و جان کی اصل کیا

ہے۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم اس سے بے خبر ہیں۔
حقیقت کیا ہے اس کرب، نہاں کی
یہ قیمت ہے تو کس جنس گراں کی؟

اس سلسلہ مضامین کے موضوعات بے شمار ہیں۔ تاہم اصل موضوع ہے انسان کی مخفی صلاحیتوں کو علمی انداز سے زیر بحث لانا۔ فرد کی مخفی صلاحیتیں یہ تینوں لفظ یعنی "فرد مخفی اور صلاحیتیں" بے حد مبہم ہیں، نہ ہم فرد سے واقف ہیں نہ اس کی مخفی صلاحیتوں کی حدود سے! تاہم حیاتیات، نفسیات، طب، ادب، شعر، نفسیات، سماجیات، فنون لطیفہ، سحر، تنویم، تصوف، مذہب، اخلاق، یوگ، تھیاسونی اور دوسرے زاویہ ہائے فکر نے، انسان کی تصویر جس جس انداز سے پیش کی ہے، اس کی عکس کشی کی کوشش کی گئی ہے۔ انسانی شخصیت کے علمی مطالعہ کے ساتھ اس کے علمی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مختلف تجربوں اور حوالوں کے بعد ایک کورس نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت SELF

CULTURAL TRAINING COURSE۔۔۔ امین کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کورس کے نمایاں خدوخال حسب ذیل ہیں۔ جس دم اور پاس انفاس (سانس) کی مختلف مشقوں کے ذریعے جسمانی صحت کو بحال کرنا، جسمانی صحت کی بحالی کے لئے دل و دماغ کی تنقید (اور غیر مستعمل) جذباتی توانائی کو آزاد کر کے ذہن کی اس مخفی قوت کو شخصیت کی تعمیر نو کے لئے استعمال کرنا۔ مجاہد نفس کے ذریعے فرد کو اس قابل بنانا کہ وہ شعور کی روشنی میں اپنے اندر اٹنے پاؤں سفر کر کے ان غلطیوں اور لغزشوں کی نشاندہی کر سکے جو اس کے ذہنی عدم توازن اور خلل اعصاب کی تہہ میں کام کر رہی ہیں۔ استغراق کی مشقوں اور مراقبہ کے ذریعے انسان کی تمام اعصابی اور دماغی توانائیوں کو ایک نقطے پر مرکوز کر کے اس کی کھوئی ہوئی خود اعتمادی

۱۔ اس کا مختلف S.C.T کے ۴۴ سے مشہور ہے اور ہزاروں افراد S.C.T سے ملابعدانہ تعلق رکھتے ہیں۔

اور خود شناسی کی صلاحیت کو برجا اور بحال کرنا، مجھے بار بار اپنا ذکر کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ خود نمائی اور خود ستائی قابلِ درگزر ہے۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ جب اس سلسلہ مضامین کے چرچے چاروں طرف پھیل گئے اور میں نے دوستوں کے اصرار پر اپنی بحالی اور تعمیر شخصیت کے لئے سانس، استغراق، محاسبہ نفس، خودنوٹشی، خودترغیبی، خودترغیبی، آزاد نگاری، ذاتی تحلیل نفسی، تنویم اور بعض دوسری مشقیں ضرورت مند افراد کو بتانی شروع کیں اور یہ محسوس کر لیا کہ ان مشقوں سے اعصاب، دل و دماغ اور ذہن کو بہت حد تک فائدہ پہنچتا ہے تو لا محالہ اس کام کو منظم کرنے کا خیال آیا۔ یہ خیال بطور اتفاق ذہن میں آیا یا اس میں احباب کی تحریک کو دخل تھا۔ صورت حال کچھ سی 1964ء میں خاموشی کے ساتھ ادارہ من عرف نفسہ (مخفف معن یام ع ن) کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اور نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کے نام سے چھ، چھ ماہ کے اسباق پر مشتمل ایک سلسلہ نصاب عمل مرتب کیا گیا ہے۔ "یہ نصاب عمل" بعض جسمانی ورزشوں، سانس کی مشقوں، استغراق CONCENTRATION کے طریقوں، خودترغیبی، خودنوٹشی، محاسبہ، مراقبہ اور جائزہ نفس پر مشتمل ہے جس پر جانچا اس سلسلہ تصانیف میں حسب ضرورت اضافہ کی گئی ہے۔

پچھلے پانچ سال میں کتنے افراد (S.C.T) کے ذریعے اپنی شخصیت کی تعمیر نو، ذہنی صحت اور نفسیاتی بحالی کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ان کی تعداد کا حصہ و تعین مشکل ہے۔ یقیناً آٹھ یا دس ہزار کے اعداد میرے علم میں ہیں، یا تو ان آٹھ یا دس ہزار افراد نے میری اجازت سے (S.C.T) پر عمل شروع کیا یا عمل شروع کر کے مجھے اطلاع دی۔ اگر آٹھ دس ہزار کا ہندسہ صحیح ہے (اور میں صحت کی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی شایعات کے اصول پر کام کرنے کی کوشش نہیں کی) تو پھر یہ اذعان بھی صحیح ہوگا کہ (S.C.T) کے جتنے طلباء سے اب تک خط و کتابت یا گفت و شنید کے ذریعے رابطہ قائم ہو سکا ہے۔ اس سے زیادہ یا اتنے ہی انجان احباب ایسے ہوں گے۔ جنہوں نے ان

مضامین سے متاثر ہو کر بطور خود نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت کسی مشق یا تجویز پر عمل کیا اور ہماری پتھر کچھ کر چوم کر چھوڑ دیا۔ اس حد تک دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ تعمیر شخصیت اور دل و دماغ کی تنظیم جدید کے سلسلے میں مشقیں بلاشبہ مفید ہیں۔ بشرطیکہ ان پر استقلال سے عمل کیا جائے۔ لیکن آہ استقلال کیسا اور عمل کہاں؟

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد ہے

ان مشقوں کے شروع کرتے ہی مشقوں کے توازن عمل کے خلاف نفس کی مزاحمت شروع ہو جاتی ہے۔ ذہن کا خاصہ یہی ہے، جس طرح شریہ اور منہ زور گھوڑا آخری وقت تک ضدی چاہک سوار کو نیچا دکھانے کے لئے دو لتیاں پھینکتا، شک مارنا اور الف ہو جاتا ہے۔ یہی بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ نفس انسانی اپنے تسخیر کرنے والے کے خلاف مزاحمانہ اور منہمانہ جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ جب آپ کو بظاہر ذہن پر انداختہ اور شکست خوردہ بھی نظر آئے، تب بھی چوکی میں کمی نہ کریں کیونکہ عجب نہیں کہ وہ چپکے چپکے کسی نئے جوانی حملے کی منصوبہ بندی کر رہا ہو۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں لوگ ادارہ من عرف نفسہ (مخفف معن، م، ع، ن) مشقیں ترک کر دیتے ہیں۔ بلکہ جب ان کے نفس کی مزاحمت شدید تر ہو جاتی ہے تو میں خود انہیں مشورہ دیتا ہوں کہ کچھ عرصے کے لئے ان مشقوں کو ترک کر دیا جائے۔ اگر سو افراد ان مشقوں پر عمل شروع کرتے ہیں تو کورس کے ابتدائی چھ مہینے میں زیادہ تو نہیں پچاس فیصدی افراد کسی نہ کسی عذر معقول و نامعقول کی بناء پر ان مشقوں کو ضرور ترک کر دیں گے۔ اور سو (100) میں مشکل سے تیس طلباء ایسے ہوں گے۔ جو توازن عمل کو قائم رکھ سکیں گے۔ سہ سالہ نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت کے دوسرے سال مستعدی سے عمل کرنے والوں کی تعداد (10) فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی اور تیسرے سال میں؟ صرف چند!

آخر کے تیس نفس اکیلا ہی سدھارا

میں خود اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص تین سال کے بجائے صرف چھ مہینے S.C.T کی مشقوں پر عمل کرے تو ابتدائی فوائد سے محروم نہ رہے گا اور ان مشقوں کے ابتدائی فوائد بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

☆☆☆

برسبیل تذکرہ

اس موقع پر سانس یا استغراق کی کسی مشق کو تفصیل و وضاحت سے بیان کرنا مقصود نہیں۔ نہ آپ کو بطور خاص کسی ذہنی الجھن کے بارے میں کوئی مشورہ دینا ہے۔ یہ چیزیں تو خط و کتابت سے طے کرنے کی ہیں، فی الحال برسبیل تذکرہ صرف اس قدر عرض کرنا ہے اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی بے مقصد ہوگئی ہے، کسی کام میں جی نہیں آتا۔ روزمرہ کے مشاغل سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی، ایک ایسی چیز کی تلاش ہے۔ جس کا نام تک آپ نہیں جانتے۔ اگر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ساری دنیا آپ کے مخالف ہوگئی ہے۔ اگر آپ خود اپنے سے ڈرنے لگے ہیں۔ کسی نامعلوم یا معلوم مقصد حیات کی کوشش میں مایوس ہو کر عالم خیال میں اس کے حصول کے لئے کوشاں ہیں اور زندگی کی عملی حقیقتوں سے کٹ کر صرف داہمہ طرازی سے جی بہلانے لگے ہیں اگر اپنے آپ کو محروم و نامراد تصور کرتے ہیں۔ یہ خیال آپ کو ستاتا رہتا ہے کہ آپ سے کوئی جرم سرزد نہ ہو جائے۔ اگر زندگی سے اکتنا کر خود کشی کا خیال بار بار آتا ہے جینے سے جی سیر ہو چکا ہے۔ اکثر نامعلوم اسباب سے تشویش کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بغیر کسی وجہ کے ذرا ذرا سی بات پر افسردہ یا مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ڈراؤنے، بے معنی، بے ترتیب، شرمناک، بجرمانہ اور گندے خواب نظر آتے ہیں یا سرے سے خواب ہی نظر نہیں آتے، اگر آپ اپنے گرد و پیش کی دنیا یعنی گھر، کتبے، خاندان اور سماجی میل جول کے بجائے اپنے خیالات میں گم رہنا پسند کرتے ہیں، اگر آپ کے نفس سے صرف ایک جذبہ چپک کر رہ گیا ہے مثلاً غم، غصہ، خود بے زاری، مردم آزاری، حسد، احساس کمتری، خبط برتری، وہم،

احساس گناہ، اشتعال، افسردگی، مردہ دلی اور بیجان وغیرہ یا اگر کسی ایسی جسمانی شکایت میں مبتلا ہیں جس کا سبب (عضویاتی) نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کسی طبی معائنے سے پتہ چلا کہ قلب کا فعل درست ہے اور شرائین قلب میں کوئی نقص نہیں ہے تاہم بے اختیار آپ کا دل دھڑکتا ہے یا دل ڈوبنے کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، یا بغیر کسی جسمانی سبب کے آپ اپنے کو جنسی طور پر ناکارہ سمجھتے ہیں، یا محسوس کرتے ہیں کہ شخصیت و حصوں میں بٹ گئی ہے یا غیر معمولی تھکن، جوڑوں میں درد، الرجی، نکت، خلل اعصاب، فساد ہضم، کابوس (سوئے میں جسم کے کسی حصے کا شل ہو جانا) یا اسی قسم کے کسی اور نف جیسی عارضے کا شکار ہیں تو یقین کر لیجئے کہ ذہن نے خطرے کا الارم بجا دیا ہے۔ فوراً آپ کو اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی تعمیر و تنظیم کی طرف توجہ کرنی چاہئے، ورنہ..... (خیر ورنہ پر کبھی تفصیل سے گفتگو کی جائے گی)

پاکستان میں معالجین نفسیات کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر جتنے افراد بھی اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی نفسیاتی بصیرت، طبی صداقت، معالجین ہنرمندی اور غلوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پچھلے دس سال میں امراض ذہنی کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ ایک نیم سرکاری رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ صرف مغربی پاکستان کے اندر ذہنی مریضوں کی تعداد ستر (70) ہزار کے قریب جا پہنچی ہے، لیکن علاج معالجے کی سہولتیں کتنے افراد کو حاصل ہیں؟ صرف چند ہزار افراد کو!

ایک مریض و صد آواز، ایک انار و صد بیمار

ہمارے ملک کے معالجین نفسیات مبارکباد کے قابل ہیں کہ محدود وسائل اور کم تر ذرائع کے ساتھ وہ ترقی پذیر ذہنی امراض اور نفسیاتی آلام کے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک طرف حالات کے جبر اور زندگی کے دباؤ کے سبب روزانہ دل و دماغ کی گتھیوں اور روح و ذہن کی الجھنوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ

نسل جدید، اسکولوں اور کالجوں کی پیدائش۔ بعض وجود کے سبب (جن کی تفصیل وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہے گی) ایسے روحانی عذاب، ایسے دماغی کرب اور ایسے اضطراب ذہنی میں مبتلا ہے کہ ہم ”قبل تقسیم“ کے لوگ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور دوسری طرف ملک میں ذہنی صحت کی طرف سے کچھ ایسی بے توجہی برتی جا رہی ہے، گویا اس قسم کا کوئی مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں، مجھے نہیں معلوم کہ ملک کے چوتھے اور پانچویں تعمیر منصوبوں میں اس اہم ترین مسئلے (ذہنی صحت) کے حل کے لئے کیا تجاویز پیش کی گئی ہیں اگر نہیں پیش کی گئی ہیں تو:

وائے گرد رہیں امروز بوفردائے

راقم الحروف کا براہ راست اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اور میرا فن نفسیات اور میرا ادارہ من عرف نفسہ (م۔ع۔ن) میرا نصاب تعمیر نصاب تعمیر و تنظیم S.C.T کوئی طبی نفسیاتی کلینک اور ذہنی اور نفسیاتی علاج معالجے کا مرکز نہیں ہے، میں تو اس کام کو ایک تحریک کی شکل میں کر رہا ہوں، مجھے پرنچرل ازم یا فوق العادات فنون و علوم سے طبعی دلچسپی ہے، اس کا اعتبار اس شکل میں ہو رہا ہے۔ پھر بھی ذہنی صحت مندی کے علاج معالجے سے کسی حد تک میرا مٹی تعلق ضرور قائم ہے اور اسی تعلق کی بناء پر متعلقہ حضرات کی توجہ، نسل جدید کی ذہنی اور نفسیاتی صحت مندی اور بحال کی طرف منعطف کرانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آخر میں عرض یہ ہے کہ آپ اس کتاب کو مکمل کتاب سمجھ کر نہ پڑھیں۔ اس مجموعے میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے نہ اس کے اجزاء میں مناسب ربط و تنظیم موجود ہے نہ اس کے ابواب میں ہموار معنوی وحدت! ابتدا میں یہ ابواب (جو شامل کتاب ہیں) مضامین کی شکل میں مرتب کئے گئے تھے۔ جب کتاب بلکہ کتابوں کی ترتیب و تدوین کا سوال پیدا ہوا تو ان مضامین کو قطع و برید کی تیز دھانے دار قینچی سے کتر کر کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ اگرچہ کتاب میں کوئی غیر متعلق بحث شامل نہیں ہے اور تمام

گفتگوؤں کی تان انجام کار صرف ایک موضوع پر آکر ٹوٹتی ہے۔ یعنی ”نفس انسانی“ اور اس کے مظاہر! تاہم ایک کتاب میں معنوی پیچیدگی اور مضمونی ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ اس ہم آہنگی اور پیچیدگی بلکہ چسپیدگی کا فقدان کہیں نہ کہیں ضرور محسوس ہوگا۔ کیا میں اس ”فقدان“ پر معذرت طلب کروں۔ نہیں معذرت طلبی کا کوئی موقع نہیں کیونکہ یہ جلد انشاء اللہ متعدد مجالدات کا پیش خیمہ ہے۔ اس مجموعے کے بکھرے ہوئے ابواب میں جو کچھ کہا گیا اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کو (نفسیات اور) مابعدالنفسیات کے فن سے ابتدائی مناسبت پیدا ہو جائے۔ آئندہ جو کچھ لکھا اور کہا جائے گا اس کا صرف ایک خاکہ ذہن میں ہے۔ لیکن بڑا خوش انگیز، فکر انگیز اور خیال انگیز ہے۔ یہ خاکہ!

ذہن نقش ہے مدہوش تصور اب تک

بن رہا ہے ابھی افلاک پہ انگارہ مرا

ریکس امر دہوی

12 دسمبر 1968

اے مالکِ کل مہر والدین پر رحم فرما

یہ اسرار نقش قدم

ہم نے سمندر کے کنارے پر ایک پر اسرار نقش قدم دیکھا!
یہ کس کا نقش قدم ہے؟

ہم کھوج لگاتے رہے۔ سوچتے رہے، ڈھونڈتے رہے۔ آخر پتہ چلا کہ یہ خود ہمارا نقش قدم ہے۔ یہ قول اس عہد کے سب سے بڑے فلسفی سائنس دان آرتھر ڈائٹن کا ہے۔ آرتھر ڈائٹن اور اس کے ساتھی سائنس کی مشعل ہاتھ میں لے کر کائنات کے راز، فطرت کے مجید تلاش کرنے نکلے تھے، بے کراں علم اور جاودا ابدیت کے کنارے۔ انہوں نے ایک انجان پر اسرار نقش قدم دیکھا۔ وہ سمجھے کہ ابدی سچائی اور کائنات کی اصل حقیقت اتنا راستے سے ہو کر گزرتی ہوگی۔ چنانچہ وہ نشان قدم کی رہنمائی میں اسی راستے پر چل کر گئے ہوئے، حقیقت کی تلاش شروع کر دی۔ پتہ چلا کہ وہ جس نقش قدم کو حقیقت کائنات کا سراغ سمجھے تھے وہ تو خود انہیں کے آوارہ گرد تجسس کا نشان پا تھا۔ یہ ہے آج تک کائنات کے رازوں اور زندگی کی ابدی سچائیوں کے بارے میں علم اور سائنس کی چھان بین کا نچوڑ۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پچھلے آٹھ یا دس ہزار سال میں انسان نے علم و تحقیق کا جو سرمایہ جمع کیا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ نہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات اور اس کے مظاہر اور فطرت اور اس کے قوانین کو سمجھنے کے لئے ہمیں علم کے بدلے جہالت اور یقین کے بجائے وہم کا سہارا لینا چاہئے، البتہ علم کی مختلف قسمیں اور حصول معرفت کی مختلف شکلیں ہیں۔ سائنس اس میدان میں کیسیا، حیاتیات، عضویات وغیرہ سے ملتی ہے۔ طبیعیات اور سائنس کے پہلو پہ پہلو ”وجدان“

کا قافلہ رواں ہے۔ طبیعیات کے ساتھ مابعدالطبیعیات نتھی ہے۔ سائنس کے ساتھ فلسفہ ہم رشتہ ہے۔ تجربی فنون کے پہلو میں فنون لطیفہ کا تاج محل آراستہ ہے۔ اور نفسیات کی شاخ سے مابعدالطبیعیات کا شاخچہ اور کوئیل آہستہ آہستہ پھوٹ رہی ہے۔ جس طرح ہم جوہری طبیعیات کی مدد سے کائنات کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح نفسیات اور مابعدالطبیعیات کی دور بین نگاہ بھی ایسے بہت سے راز معلوم کئے جاسکتے ہیں جن کی حقیقت جاننے کے لئے انسان ہمیشہ بیتاب رہا ہے اور اس وقت تک بیتاب رہے گا جب تک یہ بوند سمندر میں اور جزو کل میں نہ مل جائے۔

☆☆☆

زمان و مکان

یوں تو عالم فطرت کا ہر پہلو، زمین کا ہر ذرہ، سمندر کا ہر قطرہ اور آسمان کا ہر ستارہ انجان رازوں اور سمجھ میں نہ آنے والے اسرار کی انوکھی دنیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کائنات کے دو مظاہر ایسے ہیں جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ دو مظاہر ہیں ”زمان اور مکان“! سائنس کے تمام علوم و فنون اب تک ”مکان“ کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ مکان کا سب سے بڑا نشان ”جسم“ ہے۔ جسم کو ٹھوس شکل میں مادے کا پھیلاؤ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ”زمان“ (ٹائم یا وقت) کی تعریف کیا ہوگی؟ زمانے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تحقیق تجربہ کاروں کے آلات ریاضی کی ضرب و تقسیم اور کیمیاوی اجزاء کی نسخہ سازی یعنی فارمولے بنانے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ زمان و مکان ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ جس طرح ایک سکے کے دو رخ، پھر بھی وقت و زمان کی تہہ تک پہنچنا۔ مکان کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ آپ وقت کے بارے میں جتنا سوچیں گے، اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وقت محض ایک رواں دواں تصور یا شعور کی حرکت کا نام ہے۔ ہمارا شعور مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ انسانی ذہن کی مجبوری یہ ہے کہ وہ محض گزری ہوئی کل، آنے والی کل اور آج کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ کل دس جنوری تھی۔ آج گیارہ جنوری ہے، کل بارہ جنوری ہوگی۔ شعور جب بھی وقت کو تولدنا چاہے گا ماضی، حال اور مستقبل کے یہی باٹ استعمال کرے گا۔ لیکن کائنات کی حقیقت ازلی و ابدی ہے۔ ہمارے حافطے میں تصورات، خیالات، یادداشتوں اور یادوں کے بے شمار سلسلے قائم اور کارفرما رہتے ہیں۔ لہذا جب بھی ہم کسی چیز کا تصور کرتے

ہیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہیں یا کسی چیز کا علم حاصل کرتے ہیں تو ذہنی تجربوں کے اسی سلسلے کے ذریعے جو پہلے سے الاشعور میں محفوظ ہیں۔ (خواہ حیوان کا ہو یا انسان کا) ہر نئے تجربے یا علم کو ذہن پرانے تجربات اور تصورات سے نشی کر دیتا ہے۔ اس طرح ماضی، حال اور مستقبل کا سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ خود وقت کے سلسلے میں اصل اور محسوس اہمیت ”حال“ کی ہے۔ ماضی کہتے ہیں یادوں کے مجموعے کو (وہ یادیں جو ذہن میں محفوظ ہیں) اور مستقبل نام ہے اُن تصورات کا جو ماضی کی یادوں اور حال کے تجربوں کے میل جول سے وجود میں آتے ہیں۔ وہ لمحہ جس میں آپ زندہ ہیں اصل لمحہ وہی ہے جو لمحہ گزر چکا وہ خواب بن گیا، اور جو لمحہ آنے والا ہے وہ ہنوز خیال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم خواب و خیال کے درمیان زندہ رہتے ہیں۔

ہم ابھی خواب میں ہیں اور یہ احساس وجود

جس سے کچھ نیند اُچٹ جائے وہ انگڑائی ہے

ہاں۔ انسانی شعور، ماضی، حال اور مستقبل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن انسانی ذہن کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہے زمان و مکان اور حال و مستقبل کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے۔ آپ کو روزانہ انسانی ذہن کی اس نادر خصوصیت کا تجربہ ہوتا ہوگا، آپ بعالم خواب اپنے آپ کو پاکستان کے بجائے انگلستان میں دیکھتے ہیں (یہ کیفیت عالم خواب ہی نہیں عالم خیال میں بھی گزرتی ہے) انگلستان میں پندرہ سال گزارتے ہیں۔ چونکے ہیں تو اپنے آپ کو کراچی میں پاتے ہیں گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سوئے ہوئے یا خیال میں کھوئے ہوئے صرف پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ ان پندرہ منٹ میں آپ کا ذہن پاکستان سے جست کر کے انگلستان پہنچ گیا (مکان کی اہمیت ختم) اور وہاں اس نے پندرہ سال گزار دیئے (زمان کا بت ٹوٹ گیا) حالانکہ آپ کے ٹائم ٹیبل کے لحاظ سے صرف پندرہ منٹ یا 900 سیکنڈ گزرے تھے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی رُو سے وقت محض حواس کے دھوکے کو کہتے ہیں۔ ہم نے ماہ

و سال کے بارے میں نہ جانے کیا کیا تصورات قائم کر رکھے ہیں۔ لیکن سال ہے کیا؟ سورج کے گرد زمین کا ایک چکر اور بس، زمین پر رہنے والوں کا سال 365 دن کا ہے۔ مشتری کے باشندوں کا 88 دن کا، گویا ہر سیارے، ہر شکی نظام اور ہر کہکشانی نظام کے مینے اور سال الگ الگ ہیں۔ پھر کبھی کا سال الگ ہے اور پھر کا الگ۔ کبھی فرض کیجئے چار ہفتے میں پیدا ہو کر مر جاتی ہے اور ہم ساٹھ ستر سال زندہ رہتے ہیں۔ ان ساٹھ ستر سال کو جس قدر طویل اور اکتا دینے والا ہم محسوس کرتے ہیں۔ کبھی ہفتے کی مدت کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتی ہوگی۔ بعض جرثومے ایسے ہیں کہ پیدائش کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ وہ ولادت و وفات کے درمیان صرف ایک سیکنڈ زندہ رہے۔ اس ایک سیکنڈ میں وہ غذا بھی حاصل کر لیتے ہیں، اولاد بھی پیدا کر لیتے ہیں اور زندگی کے گونا گوں تجربات بھی اسی ایک سیکنڈ زندہ رہنے والے کیڑے سے پوچھے کہ میاں! تم نے کیسی زندگی گزاری؟ تو وہ جواب دے گا بہت طویل بڑی رنگین، بڑی معرکہ آرا اور پھر بے حد مصروف! میں ایک سیکنڈ جیوا، بہت جیوا، پوری عمر طبعی گزار دی، اب مجھے مرجانا چاہئے۔ اس کیڑے کے شعور نے ایک سیکنڈ کی تقسیم کروڑوں حصے میں کر دی اور کیڑے کو یہ محسوس ہوتا رہا کہ سیکنڈ کا ہر کروڑواں حصہ ایک گھنٹے کی طرح گزرتا ہے، تو درحقیقت یہ شعور ہی ہے۔ جس کی حرکت اور عمل سے وقت وجود میں آتا ہے۔ وقت بذات خود کیا ہے؟ نظریہ اضافت کی رُو سے وقت کہتے ہیں، لامحدود ابدیت سے لامحدود ابدیت کی طرف زمانے کی لہر کا مستقل بہاؤ۔ اس ”بہاؤ“ میں نہ ماضی ہے نہ حال ہے نہ زمانہ ہے نہ مستقبل، بس ایک اتھاہ سمندر ہے جو ازل سے بہہ رہا ہے اور ابد تک بہتا رہے گا۔

ہم اُس عظیم پناہ میں غرق رہتے ہیں

جہاں زماں و مکاں ساتھ ساتھ بہتے ہیں

انسان اگر شعور پر غالب آجائے تو وقت کے بندھن توڑ کر ابدی بن سکتا ہے۔

لامحدود قرار پاسکتا ہے۔ شعور پر غالب آنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ حواس کے

دھوکوں سے اونچے اٹھ جائیے ہمارا موجودہ علم یا شعور کیا ہے۔ محض حواس کے ذریعے حاصل ہونے والا ایک ہی تجربہ انسانی ذہن کی ساری توانائیاں اور طاقتیں حواس کے ساتھ ان ہی تھکا دینے والے یکساں بے رنگ اور بے زار کر دینے والے تجربوں میں خرچ ہو جاتی ہیں اور ہم انسان ہونے کے باوجود کبھی ”حیوان مطلق“ کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے۔ سائنسی عہد نے انسان کو بہت کچھ دیا ہے۔ بجلی، بھاپ، ایٹمی توانائی، شمس توانائی، خلائی راکٹ، قلم، ریڈیو، راڈار اور نہ جانے کیا کیا؟ کوئی شبہ نہیں کہ انجینئرنگ اور تکنیک کاری کے ہر شعبے میں انسانی ترقی چونکا دینے والی ہے۔ ان حیرت انگیز فنون کے فوائد تسلیم، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نئی نئی سائنسی ایجادیں انسانی جبلت کے حیوانی جذبات کو بھڑکانے کے لئے استعمال ہو رہی ہیں، تو جی چاہتا ہے کہ فضا سے ہائیڈروجن بم برسا کر تمام سائنسی لیبارٹریوں کو تباہ کر دیا جائے۔

سیاہ ہے دل گیتی سیاہ تر ہو جائے

خدا کرے کہ ہر رات شام بے سحر ہو جائے

☆☆☆

انسانی ذہن

تخریب و تعمیر کے عناصر بنی ہوئی اور زمان و مکان کے تانے بانے سے بنی ہوئی اس بے کراں، لاقیاس اور صد ہزار پہلو کائنات کا واحد ناظر و شاہد انسانی ذہن ہے۔ یہ انسانی ذہن ہی ہے جو کائنات کی پیچیدہ گتھیوں کو اپنی سہولت کے مطابق سلجھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ کائنات کی حقیقت اور حقیقتیں کیا ہیں؟ یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم سوال یہ ہے انسانی ذہن ان حقیقتوں کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے؟ ہم کائنات کو کائنات کے بنانے سے نہیں، اپنے بنانے سے ناپتے تو لیتے ہیں۔ ہم سے باہر کوئی کائنات موجود نہیں۔ اگر انسانی شعور ایک لمحے کے لئے کسی منظر یا منظر سے قطع نظر کہلے تو وہ ذہن کے لئے عدم میں چلا جاتا ہے اور جوئی پھر اس منظر اور منظر کی طرف ذہن انسانی کی توجہ مبذول ہوتی ہے وہ عالم وجود میں آ جاتا ہے۔ اس وقت جس نکتے یا نقطے کی طرف توجہ مبذول ہے وہی نکتہ یا نقطہ بہ قید وجود ہے۔ جوئی اس نقطے کی طرف سے آپ کی توجہ ہٹتی، آپ کے لئے وہ ”عدم“ بن گیا۔ ایک تھختی پر الف سے لے کر ی تک تمام حروف چھٹی لکھے ہوئے ہیں۔ آپ کی پوری ذہنی توجہ الف کی طرف لگی ہوئی ہے اس وقت ب سے لے کر ی تک تمام حروف آپ کے لئے معدوم کی حیثیت رکھتے ہیں الف کے بعد ب پر آپ کی نظر پڑتی ہے اور آپ استغراق کامل کے ساتھ ب میں گم ہو جاتے ہیں۔ لیجئے الف معدوم ہو گیا درحقیقت عرض کرنا یہ ہے کہ بذات خود کائنات کیا ہے؟ کس طرح وجود میں آئی؟ کس طرح معدوم ہو جائے گی؟ اس کی تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے؟ کائنات کے تمام مظاہر کن حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ یہ تمام

سوالات خود کائنات کے اندر موجود ہیں۔ نظام کائنات نہ سائل کی حیثیت رکھتا ہے نہ مسؤل کی۔ نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہے نہ کسی کے حضور مستقصر! کائنات اور مظاہر کائنات کے بارے میں ہر قسم کا سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے ہم خود اپنے شعور کے گزر سے ابد و ازل، زمان و مکان اور وجود عدم کو ناچتے رہتے ہیں۔ کائنات اور علم کائنات کو بے کراں، لا قیاس اور صد ہزار پہلو کہا جاتا ہے، مگر یہ فیصلہ بھی انسانی ذہن ہی کا ہے۔ انسانی ذہن کیلئے وہ بے کراں بھی ہے کنارہ دار بھی، لامحدود بھی محدود بھی، لا قیاس بھی قابل قیاس بھی، صد ہزار پہلو بھی ہے اور بے پہلو بھی، یہ سوچنے کا طرز ہے۔ آپ اشیاء کے بارے میں جس طرح سوچنا شروع کریں گے ان میں وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی، وہ ویسی ہی نظر آنے لگیں گی۔ کبھی عظیم، کبھی حقیر، کبھی پیچیدہ، کبھی سادہ، کبھی صد رنگ، کبھی بے رنگ علم و تحقیق کے پاس کائنات کی پیمائش، وزن اور تخمینے کے چیلے پیمانے ہیں وہ سب انسانی ذہن کی تخلیق یا اس کے آلہ کار ہیں۔ سائنسی علوم، فلسفہ، عقلی استدلال، وجدان، مذہب اور حصول معرفت کے دوسرے ذرائع و وسائل اگر ہماری ایجاد نہیں تو ہماری ملکیت ضرور ہیں۔ اگر ہم بلا شعور نہ ہوتے تو ہر چیز بے معنی ہوتی۔ یہ انسانی شعور ہی تو ہے جو اشیاء کو معنویت اور اسما کو معانی کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ مگر ہاں یہ ابھی سے انسانی شعور کے بارے میں گفتگو کیوں شروع ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ خود انسان کیا ہے؟ بلاشبہ انسان اپنے شعور سے مقدم ہے اور آدمی اپنے ذہن کا مخدوم ہے خادم نہیں۔ یہ گفتگو آدمی سے شروع ہونی چاہئے۔ آدمی، شخصیت سے!

☆☆☆

آدمی اور خیال

ہم گوشت کے بنے ہوئے نہیں، خیالات کے بنے ہوئے یا خیالات کے بنائے ہوئے ہیں۔ انسانی شخصیت (فحش سے بحث نہیں) کی بناوٹ میں گوشت پوست کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ درحقیقت ہماری شخصیت کی تعمیر ہمارا تصور اور تخیل کرتا ہے، ہم وہی ہیں جو سوچتے ہیں۔ یہ ”سوچ“ ہی تو ہے جو فحش میں شخصیت، آدمی میں آدمیت اور فرد میں انفرادیت پیدا کرتی ہے۔ انسانی شعور صرف کائنات ہی کو وجود میں نہیں لاتا، نئے انسان اور نئے آدمی کو بھی وجود میں لاتا ہے۔ آپ کے تمام اقوال و افعال محض آپ کے طرز فکر کے آئینہ دار ہیں۔ میرے سوچنے کا جوڑ صنگ ہوگا، میرے تمام کاموں اور باتوں کا رنگ دینا ہوگا۔ آپ نے یہ کہاوت سنی ہے کہ خیالات اشیاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کہاوت سے کیا مطلب اخذ کیا؟ آپ نے خیالات کی لہروں کو محسوس کیا ہوگا، یہ کوئی قصہ کہانی نہیں، دو اور چار کی طرح سیدھی اور سچی حقیقت ہے کہ میرے اور آپ کے خیال کی لہریں روشنی کی رفتار یعنی ایک لاکھ چھاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے زیادہ تیز روکناقتی شعاعوں سے زیادہ طاقتور اور ماورائے بنفشی امواج سے کہیں زیادہ پراسرار اور حیرت انگیز ہیں۔ انسان بے پناہ قوتوں کا مجموعہ ہے مگر ان میں سے کوئی قوت خیال کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ وجود انسانی کی ہر قوت کا سرچشمہ اس کا خیال ہے، محض خیال اور محض خیال ہے۔ دنیا کے تمام جسموں کی طرح ہمارے جسم سے بھی مسلسل ایک قسم کی برقا طبعی توانائی بہتی رہتی ہے جو ایک شفاف، رنگین اور طاقتور غلاف کی طرح ہمیں لپیٹے رہتی ہے۔ انسانی جسم کے ایٹموں سے نکلنے والی اس مادی توانائی کو ہمارے ہی خیالات کی

لہریں کنٹرول کرتی ہیں۔ روشنی اور آواز کی لہروں کی طرح خیال کی لہروں بھی رکھتی ہے۔ جسم بھی، رنگ بھی، ہر خیال اپنا اظہار خاص رنگ و روپ میں کرتا ہے۔ بعض خیالات کا رنگ سفید ہے بعض کا سیاہ، بعض خیالوں میں سرخی جھلکتی ہے، بعض میں زردی۔ خیال کی لہر ہمارے ذہن و دماغ سے نکلنے کے بعد خلا میں پھیلے ہوئے لطیف نادر مادے میں موج اور ارتعاش پیدا کر کے اس مادے کے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ مثال دے کر بات کہی جائے تو شاید زیادہ قابل فہم ہو، فرض کیجئے کہ میرا ذہن غمگین اور بیمار خیالات کی لہریں نشر کر رہا ہے تو یقیناً اس غمگین اور مایوسانہ خیال کی لہر اس پاس کی فضا کو ایسے سانچے میں ڈھال دے گی۔ ان غم زدہ اور ناامیدانہ خیالات کے ساتھ میں جہاں جاؤں گا، مایوسی اور تشویش کی فضا پیدا کرتا چلا جاؤں گا۔

فارسی کا وہ مشہور مصرع آپ نے سنا ہوگا:

افردہ دل افردہ کند انجمنے را

ایک افردہ دل آدمی پوری انجمن کو افردہ کر دیتا ہے۔ کس طرح؟ محض اپنے افردہ خیالات کی لہروں سے انجمن لوگوں کے تخیلات، عقائد، خیالات، فکروں اور تصورات جاندار ہوتے ہیں وہ روشنی، حرارت اور طاقت کے طوفان کی طرح جہر سے گزر جاتے ہیں جھوٹے لگتی ہیں۔ روشنیاں مسکرانے لگتی ہیں، وہ اپنے جلو میں زندگی اور بیداری کا سیلاب نور لے کر چلتے ہیں۔ کیا یہ روزمرہ کا تجربہ نہیں ہے کیا آپ نے ایسے انسانوں کو نہیں دیکھا کہ محض ان کی موجودگی ہی دل و دماغ کی کاپاپلٹ دیتی ہے اور ان کو دیکھ کر عجیب نور و سرور کا احساس ہوتا ہے۔ اگر آپ نے ایسے انسان نہیں دیکھے تو انہیں تلاش کیجئے۔ کیونکہ وہ خاک کے پتلوں کے جم غفیر میں مجسمہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آواز کی کوئی لہر پست ہوتی ہے کوئی بلند، روشنی کی کوئی دھندلی لہر ہوتی ہے، کوئی درخشاں، خیالات کی لہروں کا عالم بھی یہی وہ تخیل جس کی بنیاد نفرت، خود غرضی، حسد، تعصب اور پستی پر رکھی گئی ہوگی، ہمیشہ کمزور اور فساد انگیز ہوگا۔ لیکن وہ خیالات جو محبت، اعتماد، بے

غرضی، ایثار اور زندہ دلی پر مبنی ہوں گے۔ نہ صرف پورے ماحول کو روشنی، قوت اور صحت سے معمور کر دیں گے۔ بلکہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور دوسری کے بعد تیسری نسل، غرض ان گنت نسلوں اور بے شمار صدیوں تک انسانی ذہن و دماغ کو متاثر اور مسخر کریں گے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سچ ہمیشہ جھوٹ پر اور روشنی ہمیشہ تاریکی پر غالب آتی ہے تو درحقیقت ہم کمزور اور بیمار خیالات پر طاقت ور اور درخشاں تصورات کی برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ برتری ثابت ہے غالب مرحوم کہہ گئے ہیں کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

مضامین یقیناً غیب سے آتے ہوں گے، لیکن خیالات غیب سے نہیں آتے۔ عملی زندگی کے مادی تجربوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی تخیل ایسا نہیں ہے جس کا براہ راست رشتہ انسانی ذہن کے مادی عمل سے وابستہ نہ ہو۔ محبت، حسن، سچائی، ایثار، خلوص، قربانی، اعتماد یہ محض مادی اور مجرد نظریے نہیں ہیں زندگی کی عملی سچائیاں ہیں۔ جنہیں پے درپے انسانی نسلوں نے ہزاروں لاکھوں سال میں اپنے روزمرہ کے تجربات حیات سے سیکھا ہے۔ آج سے پانچ یا دس لاکھ سالوں پہلے انسان کا تصور کیجئے۔ اس مکمل وحشی انسان کی اخلاقی تعلیم کسی مدد سے نہیں پائی تھی، نہ اس کا دماغ بن مانس سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ بہت تھوڑے عرصے میں قبل تاریخ کے اس ”حیوان نما انسان“ نے سیکھ لیا کہ دریا میں مچھلیاں پکڑنے کا مسئلہ ہو یا جنگل میں ہرن کو مار گرانے کا معاملہ دونوں معرکے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں اور ان معرکوں کو سر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہی جیسے دوسرے بھوکے آدمیوں ہی سے مدد لی جائے جس روز ”حیوان انسان“ نے خود اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے دوسرے انسانوں کی ضرورت کا احساس کیا تھا یقیناً کیجئے کہ اسی روز تمدن کی بنیاد پڑ گئی تھی اور اسی روز سے آدمی کی اخلاقی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ خود اپنے زندہ رہنے کی جہلت اور ضرورت نے آدمی کو بنی نوع سے ہمدردی سکھائی، محبت کا درس دیا۔ بے غرضی کی تعلیم دی، اخلاص کا سبق پڑھایا اور اس طرح اخلاقیات کی ابتداء حیاتیات اور معاشیات سے ہوئی۔

جنگل کا قانون

یہ بحث کہ انسان فطرتاً نیک ہے یا بد۔ وہ نیکی اور بدی دونوں کا مجموعہ ہے یا دونوں صفات سے محروم ہے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی۔ نقطہ بحث یہ ہے کہ انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کا سلسلہ خود زندگی نے سکھایا ہے۔ ایک تنہا آدمی جنگل میں رہ کر جنگل کے قانون کے تحت بُری بھلی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جنگل کا قانون کیا ہے؟ وہی!

ہے مجرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھل لیتی ہے، شکار کبوتر کو دیوچ لیتا ہے۔ یہ دونوں اقدام جنگل کی تعزیرات فوجداری کی رو سے بالکل قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ آدمی اپنی اکیلی جان کے ساتھ جنگل کے قانون کی پوری کر سکتا ہے۔ مارا جائے تو غم نہیں، مارا دے تو مجرم نہیں، لیکن جہاں پانچ دس آدمی ساتھ مل کر رہیں گے وہاں جنگل کے قوانین کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا قانون چلے گا، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان! مختصر یہ کہ اخلاقیات اور تمدن ایک ہی ضرورت کے دو عملی پہلو ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کے طرز خیال اور پیمانہ فکر کو زندگی کی عملی ضرورتیں (بھوک، جنسی جبلت اور تحفظ حیات زبدہ رہنے کی جبلت اور قدرتی تقاضا) جنم دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کی ضروریات زندگی قبیلے تک محدود تھیں، اس کے خیالات بھی اسی تنگ دائرے کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ پھر قبیلے قوموں میں تبدیل ہو گئے انسانی تخیل نے بھی اسی مناسبت سے ترقی کی، رفتہ رفتہ انسان کی عملی ضرورتیں ساری دنیا پر محیط ہو گئیں۔ سائنس کی تیز رفتار ترقی نے علاقوں کو ملکوں، براعظموں کو ایک

بین الاقوامی انسانی نظام میں تبدیل کر دیا، یہ عہد اقوام متحدہ کا عہد ہے۔ یعنی نظریاتی طور پر سارے بنی نوع انسان کا عہد، گو عملاً ابھی یہ منزل دور ہے۔ اس عہد میں نہ قبائلی طرز خیال سے کام چل سکتا ہے۔ نہ قومی انداز فکر سے! اس عہد کا غالب تصور، بین الاقوامیت کا تصور ہے۔ جو سائنس سے لے کر اخلاقیات تک فکر و نظر کے ہر گوشے میں کارفرما ہے۔ انجام کا یہی تصور آہستہ آہستہ نوع انسانی کو ایک ایسی روحانی نشاۃ ثانیہ کی طرف لے جائے گا جس کا فی الحال تصور تک محال ہے۔

جہاں خود ایک تصور سہی مگر اے دوست

جہاں پہ کوئی تصور ہی حکمراں تو نہیں

زمین اور زمین کے رہنے والوں پر تبدیلی و ترقی کے کئی دور گزرے ہیں۔ برقیاتی دور، حجری دور، فلزاتی دور اور تاریخی دور، آدم زاد بھی، جغرافیائی تبدیلیوں اور زمینی انقلابات کے اس چکر سے گزر کر زندگی کی موجودہ سطح تک پہنچا ہے۔ اب تک ہم میں ہر دور کی خصوصیتیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ آدمی کی وجہ زندگی کو نے بینیں تو وہ چار طبقوں میں بٹے ہوئے نظر آئیں گے۔

جماداتی آدمی، نباتاتی آدمی، حیوانی آدمی، انسانی آدمی۔ پہلے جماداتی آدمی کی تعریف سنئے، جماداتی آدمی کسی بیرونی تحریک کے بغیر نہیں کھلتا اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ زمین پر لیٹا رہے اور کوئی بے چارے کے منہ میں پانی چھادے یہ آدمی پتھر کی چٹان سے شکل و صورت میں مختلف ضرور ہے، لیکن ہے پتھر ہی، ارادے سے محروم، حوصلے سے خالی! نباتاتی آدمی کی پہچان یہ ہے کہ ہلتا جلتا ہے مگر جنگل جھاڑی کی طرح، جس کی کات چھانٹ نہیں ہوتی، یہ جھاڑی کسی ترتیب اور منصوبے کے بغیر پھولتی پھلتی رہتی ہے اور اس پاس کی ساری زمین کو ڈھک لیتی ہے، حیوانی آدمی، آدمیت کے ذبیحے کی تیسری سیڑھی ہے، اس طبقے کا آدمی حیوان کی طرح ہر طرف حرکت کر سکتا ہے، سوچ

سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کو جانتا ہے اور مختلف حالات میں اپنے مختلف تجربات سے کام بھی لے سکتا ہے، حیوان کے تاربت یافتہ ذہن میں بہت سے تاثرات اور تصورات جمع رہتے ہیں۔ وہ اپنی جبلت کی راہ نمائی میں ان تاثرات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ہمارے درمیان جماداتی آدمیوں کی طرح حیوانی آدمی بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ان میں حیوان کی خصوصیات کے علاوہ جمادات و نباتات کی خاصیتیں بھی پائی جاتی ہیں مگر آدم زادوں کی اکثریت ”جمادات“ سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں پیش قدمی کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ مٹی کے مادہ جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ آپ کے گرد و پیش جو لوگ رہتے ہیں انہیں ٹٹول کر دیکھ لیجئے۔ کیا اینٹ پتھر کی طرح زندگی بسر نہیں کرتے؟ جہاں پڑے ہیں پڑے ہیں۔ نہ ماحول کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ ماحول انہیں بدلنے پر قادر ہے۔ البتہ نباتاتی آدمی میں پیش قدمی کا جذبہ ہوتا ہے۔ مگر یہ جذبہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی تربیت کا، آپ نے دیکھا کہ ہمارے معاشرے کے نباتاتی آدمی کس طرح جھڑپیری کی جھاڑیوں کی طرح چاروں طرف چھائے ہوئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان کی چھاؤں میں کوئی دوسرا پودا پنپ سکے۔ یہ زندگی کا خون جس رہے ہیں اور ان کی بدحواسی پورے معاشرے کے لئے خطرے کی علامت بنی چلی جاتی ہے کیونکہ ان کی ذہنی اور دماغی خراش خراش کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔

☆☆☆

حیوانی آدمی

حیوانی آدمی۔ معاشرے پر ہر قسم کا اقتدار رکھتا ہے۔ اس کو اپنے جسم اپنی لذت اور طاقت سے سروکار ہوتا ہے۔ یہ اپنے سے نچلے دونوں طبقے (جماداتی، نباتاتی) کے آدمیوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے۔ حیوانی آدمی اپنی جبلت سے اس طرح بندھا ہوا ہوتا ہے کہ آزادی سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا، کیا کسی حیوان میں خواہ وہ انسان نما ہی ہو۔ یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ عقل و استدلال سے کام لے کر کوئی آزادانہ قدم اٹھا سکے؟ آپ نے حیاتیات کا مطالعہ کیا ہے۔ تو ارتقاء کے سلسلے میں ”انتخاب طبعی“ (نیچرل سلیکشن) کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا ہوگا۔ فطرت جانداروں میں ایک خاص قانون کے تحت چلتا رہتی ہے۔ جانداروں کی جو قسم فطرت کے معیار پر پوری نہیں اُترتی فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بجائے دوسری ترقی یافتہ نسل پیدا ہو جاتی ہے۔ نباتات اور حیوانات دونوں پر کی بیشی کے ساتھ یہ قانون عائد اور نافذ ہوتا ہے۔ لیکن آدمی کی چوتھی قسم یعنی انسانی آدمی۔ اس قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے وہ اپنے ارادے سے اپنی شخصیت کی تشکیل جدید کرتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کو اپنی مرضی سے از سر نو مرتب کرتا ہے اور جذبات کا غلام بن جانے کے بجائے اپنے جذبات، اپنی عقل اور اپنے ارادے کو پوری آزادی کے ساتھ ماحول اور فطرت کی تسخیر پر صرف کرتا ہے۔ بنی آدم کے ریوڑوں میں اس قسم کے آدمی اسی طرح کمیاب ہیں جس طرح پرندوں میں عقاب یا کوسلے کی کان میں ہیرا! عوام تو خیر جمادات ہیں ہی، متوسط طبقے کو آپ نباتاتی تصور کر لیجئے۔ ان کے اوپر آدم زاد حیوان ہیں۔ جو قوموں، نسلوں اور ملکوں پر اپنی حیوانی خواہشوں اور انا کی

اندھی طاقتوں کے ساتھ بے رحمانہ حکومت کرتے ہیں اور دوسروں کی اصلاح تو درکنار اپنی سدھار تک پر قادر نہیں۔ جس طرح شیر آدمی کا خون پی کر بلا کا خون ہو جاتا ہے اسی طرح حیوانی آدمی نے سائنس کے ذریعے فطرت کی بعض قوتوں (مثلاً بھاپ، بجلی اور ایٹم) کا طریق استعمال دریافت کر کے پورے کرۂ ارض پر زندگی کی مکمل تباہی اور ہمہ گیر استیصال کے سامان فراہم کر دیے ہیں۔ وہ تمام سائنس دان جو ایٹم سے نیوکلیئر ہتھیار اور جوہری بم بنا رہے ہیں۔ وہ تمام سیاست دان جو آزادی، امن اور خدمت انسانیت کے نام پر جنگ و تخریب کی سازشوں میں مبتلا ہیں ان کو انسان کیا آدمی کہنا آدمیت کی توہین ہے۔ یہ چیتے ہیں، یہ بھیڑیے ہیں، یہ اژدھے ہیں بلکہ چیتوں، بھیڑیوں اور اژدھوں سے بھی زیادہ خطرناک! یقیناً افریقہ کا جنگلی آدمی ان ترقی یافتہ انسانوں سے بہتر ہے۔ آپ تاریخ کے پہلے آدمی سے لے کر اب تک کے آدمی پر نظر ڈال جائیے کیا پچھلے دس ہزار سال کے اندر "آدمی" میں کوئی فرق ہوا ہے۔ ہاں یہ فرق ہوا ہے کہ سواریاں زیادہ تیز رفتار ہو گئی ہیں۔ شہر چھوٹے چکے اور خوبصورت ہو گئے ہیں اور حیوانی خواہشوں کی بے روک ٹوک تکمیل کے سامان غیر معمولی فراوانی سے فراہم ہو گئے ہیں۔ مصر، بابل، کریت اور کلدانیہ اور آشوریہ کے قدیم آدمی میں جذبات کی جو نوعیت پائی جاتی ہوگی وہی نوعیت شدت کے ساتھ ہم میں بھی موجود ہے اور بس نہیں، اور بس کہنا غلط ہے۔ قبل تاریخ یا آغاز تاریخ کے آدمی کو زندہ رہنے کے لئے جتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہوگی اس عہد کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ پتھر کے زمانے کے آدمی کی تصویر اپنے ذہن میں کھینچئے۔ یہ آدمی اپنے کنبے کے ساتھ پہاڑی، غاروں میں رہتا ہے۔ گرمی، سردی، بارش، طوفان اور زلزلے سے بچاؤ کا کوئی سامان نہیں، جنگل اور پہاڑ کی تمام مخلوق حیوانوں سے لے کر اژدھے تک اس سے برسرِ پیکار ہے نہ روٹی کا ٹھکانہ ہے نہ آرام کا، کوئی شکار مل گیا تو پیٹ بھر لیا ورنہ بھوکے ہی سو رہے یا جنگلی گھاس پات سے معدہ پاٹ لیا۔ بلکہ گھاس چرنے پر بھی ارنے بھینسوں سے مقابلہ درپیش ہے۔ یہ وہ آدمی

ہے جو اپنی پوری توانائی پر زندہ ہے اس کی ساری قوت حیات اس کے تحفظ حیات پر صرف ہو جاتی ہے۔ جسم میں توانائی بچتی ہی نہیں کہ وہ اسے دوسری جذباتی سرگرمیوں میں صرف کر سکے۔ لیکن عہد جدید کے آدمی کے پاس غالباً توانائی کے ذخیرے کے ذخیرے موجود ہیں۔ کیونکہ پہلے کی بہ نسبت زندہ رہنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اب نہ جنگلوں میں جا کر ریچھوں اور ارنے بھینسوں سے کشتی لڑنے کی ضرورت ہے نہ دریاؤں میں اتر کر ایک پھلی کی خاطر گر پھینچوں کو لکارنے کی حاجت! نہ ہمیں موسموں کی شدت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ نہ مسافروں اور منزلوں کی جو حکم الگائی پڑتی ہے۔ جسمانی محنت کا بوجھ جس قدر کم ہوتا چلا جاتا ہے، جذباتی طاقت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر کسی جزیرے سے برابر بجلی پیدا ہوتی رہے۔ خرچ نہ ہو تو مشین تباہ نہ ہوگی تو اندر سے پرزوں کو تو ضرور ہی جلا دے گی۔ یہی حال انسان کی اعصابی بجلی یا جسمانی توانائی کا ہے۔

☆☆☆
پر رحم فرما۔۔۔۔۔ آمین

انسانم آرزوست

زندگی کی مادی سہولتوں اور حصول معاش کی عملی آسانوں نے انسان کی اعصابی اور عضلاتی قوت کے خرچے میں بہت کمی کر دی ہے۔ اس استعمال شدہ قوت نے اپنے ظہور عمل کے بڑے پیچیدہ راستے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ لوگوں کی جذباتی الجھنیں اور ان کی نفسیاتی پیچاک ترقی پذیر ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی چٹلی تہوں میں توانائی کی فاضل مقدار جمع ہو کر فاسد ہو گئی ہے۔ ستم ظریفی کیا ہے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو سائنسی ایجادوں نے انسانی توانائی کا خرچہ بہت کم کر دیا وہ اپنا کام ہاتھ پاؤں کے بجائے مشین سے لینے لگا ہے۔ دوسری طرف تہذیب اور رسی اخلاق کی بے جا پابندیوں نے قدرتی جذبات اور انسانوں کی فطری خواہشوں کے موزوں اظہار اور حق بجانب استعمال کو بہت حد تک مشکل بنا دیا ہے۔ گویا توانائی دونوں طرف سے مقید ہو گئی ہے انسان کی یہی مقید (اعصابی اور جذباتی) توانائی جو مفید استعمال میں نہیں۔ مسرت رساں اور تباہ کن طریقوں سے ضائع ہو رہی ہے۔ بلاشبہ یہ نفسیاتی بیماریوں اور جذباتی پیچاکوں (کام پلکسر) کا عہد ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ انسان کی قدرتی توانائیاں حصول معاش کے سلسلے میں کم سے کم دشواری کے سبب زیادہ سے زیادہ جذباتی دھماکوں کا روپ اختیار کر گئی ہیں اور انہوں نے ایسے روحانی امراض کو جنم دیا ہے کہ سو برس پہلے کا آدمی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آج پورے معاشرے میں جنم داتی آدمی (مٹی کے مادہ) ہیں یا نباتاتی آدمی (جنگلی شاہ) یا حیوانی آدمی (گنڈار شاہ) انسانی آدمی نہیں رہا۔ مولانا روم کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کز دام و ذولم انسانم آرزوست
میں ان کیڑے مکوڑوں سے بے زار ہوں مجھے انسان کی آرزو اور جستجو ہے۔
پھر خود ہی فرماتے ہیں

مکفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما

گفت آل کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

میں نے کہا بھلا ایسا انسان کہاں مل سکتا ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے تو ایسے ہی کیا اب بلکہ نایاب آدمی کی تلاش ہے۔

آدمی کی تلاش میں ہے خدا

آدمی کو خدا نہیں ملتا

ہاں یہی عظیم و فقیر انسان جس کی مولانا روم کو تلاش تھی۔ عجیب مجموعہ اضداد واضح ہوا ہے، یہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جسے ہم مسخر نہ کر سکیں۔ پہاڑ، دریا، جنگل، سمندر، موسم، چاند، فضا، سمندر، ستارے غرض فطرت کا کوئی منظم اور کائنات کا کوئی عنصر انسان کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ اپنے سے باہر کی کائنات کو فتح کرنا آسان ہے۔ اپنے کو فتح کرنا دشوار! ہم ذرا سی دیر میں اپنے جذباتی طوفان میں جھکے کی طرح بہنے لگتے ہیں۔ ہم ایک لمحے کے اندر اپنی خواہشوں کی آندھیوں میں پتے کی طرح اڑنے لگتے ہیں۔ بڑے سے بڑا قاتل جو ملکوں اور قوموں کو ارادے کی طاقت سے زیر کر دیتا ہے۔ خود اپنی خواہشات کا غلام نکلے گا۔ بڑے سے بڑا سائنسدان جو علم و عقل کے زور سے فطرت کی مخفی قوتوں پر حکومت کرنے کا مدعی ہے۔ خود اپنے جذبات کا آلہ کار ثابت ہوگا۔ انسان کائنات کے مقابل کتنا عظیم ہے اور اپنے نفس کے مقابل کتنا حقیر؟ انسان اندرونی اور بیرونی طور پر ہر وقت مصروف پیکار رہتا ہے۔ دو میدان جنگ ہیں، ایک اندر قائم ہے ایک باہر۔ باہر کا میدان جنگ تسخیر کائنات کا وہ قدرتی داعیہ ہے جو انسان کو خارجی عناصر سے برسر پیکار رکھتا۔ اور اندر کا میدان

جنگ نفس اور ضمیر کی وہ کشمکش ہے جو زندگی بھر شدت کے ساتھ جاری رہتی ہے اور موت کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ باہر کے میدان جنگ میں کامیابیاں حاصل کرنا آسان ہے لیکن نفس اور ضمیر کی کشمکش میں منفی طاقتوں کو زیر کر کے مثبت قوت کو بروئے کار لانا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ بیرونی کائنات کے انجانے، ان بوجھ اور پراسرار ماحول میں انسان کا اپنی قوت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا بے شک معمولی جنگ نہیں ہے بڑی شدید جنگ ہے یہ۔

تخریب دو عالم کا سبب بن کے رہے گی

وہ جنگ کہ جاری ہے بشر اور خدا میں

یہ ایک شدید لڑائی ہے، فطرت انسان کو زور آزمائی کا چیلنج دیتی ہے اور بے چارہ آدمی اس سے جھٹم گتھا ہو جاتا ہے۔ کائنات اور انسان کے درمیان جو بے رحمانہ اور مبارز طلبانہ معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ اس میں کبھی کبھی صلح کے وقفے بھی آتے ہیں، لیکن نفس انسانی کے اندر معرکہ عظیم برپا ہے اس میں لمحہ بھر توقف کی اجازت نہیں۔

اُس جان آرزو سے مبارز طلب تھا دل

دیکھا تو اپنے آپ سے مصروف جنگ ہے
نفسیات کے ایک مکتبہ فکر کے بیان کے مطابق انسانی نفس تین طاقتوں کے

تانبے سے بنا گیا ہے (الف) اڈیا حیوانی جبلت (ب) ایگو یا انا (ج) سپر ایگو یا ضمیر۔ اڈیا حیوانی جبلت کیا ہے؟ ہم سب جانتے ہیں۔ کھانا پینا اور نسل بڑھانا اور ان تینوں جبلتی تقاضوں کے راستوں میں جو رکاوٹ حائل ہو۔ اس سے نکلنا، رہی انا تو انا کیا ہے "میں" اس "میں" کی تعریف و تفسیر مشکل ہے۔ "میں" یعنی میرا وجود۔ میری شخصیت، میرا جسم، میرا نفس۔ یہ سب کچھ "میں" کے مظاہر ہیں۔ میں یعنی انا کا یہ احساس اڈیا یعنی حیوانی جبلت کی سطح پر قائم ہے۔ انسان کی حیوانی جبلت (نفس امارہ بھی کہہ سکتے ہیں) آدم و حوا سے ورثے میں ملی ہے اور انا کا یہ احساس و اظہار بھی! لیکن انا اپنی مزید طاقت، ماحول اور سماج سے حاصل کرتی ہے۔ سپر ایگو یا ضمیر انسانی انا کا اخلاقی

احساس ہے۔ یہ چیز اچھی ہے وہ بُری ہے، یہ خیر ہے وہ شر ہے، یہ گناہ ہے اور ثواب ہے۔ غرض نیکی اور بدی کے تمام امتیازات سپر ایگو یا ضمیر کا خاصہ ہیں۔ اڈیا اور ایگو یعنی حیوانی جبلت اور انا انسان کی طرح حیوان میں بھی پائی جاتی ہے۔ گھر کی پٹی ہوئی بلی کو بھی اپنی میں "یا ماؤں اتنی ہی عزیز ہے جتنی مجھے۔ البتہ سپر ایگو (ضمیر) صرف انسان کے لئے مخصوص ہے جو حیوانات کی اخلاقی قدریں خود ان کے جبلتی قوانین کے اندر پائی جاتی ہیں۔ شیر شکار سے پیٹ بھرنے کے بعد کبھی کسی ہرن کی جان لینے کی کوشش نہ کرے گا۔ یہ شیر کی درندہ جبلت کی اخلاقی قدر ہوئی لیکن انسان بلا تکلف محض مذاق ہی مذاق میں کسی حیوان کی یا انسان کی جان لے لے گا۔ میں نے ابھی جس اندرونی میدان جنگ کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بہرہ نفس انسانی کے یہی تینوں مظاہر، حیوانی جبلت، انا اور ضمیر ہیں۔ نفس کی یہ تینوں طاقتیں مسلسل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ اس عہد میں ان کی کشمکش ہر عہد سے شدید تر ہو گئی ہے۔

اے مالک کل سر ہے والدین پر رحم فرما ☆☆☆۔۔۔ آمین

مجرم ساز عہد

انسان نے ہزاروں سال کے تجربات کے بعد زندگی بسر کرنے کے لئے جو ضابطہ اخلاق تجویز کیا ہے۔ مذہب نے خیر و شر کے جن معیاروں کی وکالت کی ہے تہذیب کی ترقی نے اچھائی اور برائی کے جو پیمانے وضع کئے ہیں وہ شعور کو تو یقیناً تسلیم ہیں کہ ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں لاشعور کو تسلیم نہیں، ضمیر مانتا ہے جہلت نہیں مانتی، ہر لمحہ ہماری جبلت کا تقاضہ ہے کہ اپنی آسودگی کا سامان مہیا کرو، اور ہر قدم پر ضمیر نوا کرتا ہے کہ نہیں۔ یہ گناہ اور تباہی کے راستے ہیں ان سے بچ کر چلو انسان کا سب سے بڑا "الیہ" یہ ہے کہ اس عہد نے ہماری حیوانی جبلت کو بھڑکانے کے اتنے سامان مہیا کر دیئے ہیں کہ بچپنی تو مومن اور تہذیبوں نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ سائنس اور ثقافت کے تمام ذرائع اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل چند افراد کے ہاتھ میں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام حیات کا تقاضا بھی یہی ہے، چند افراد محض روپیہ کمانے اور تجارت کو ترقی دینے کے لئے قوموں اور تہذیبوں کو ذہنی تخریب و تباہی کے جہنم میں بھسم کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ بھسم کر رہے ہیں شاعری، ادب، موسیقی، رقص، مصوری اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں کا مقصد یہ تھا کہ ذوق لطیف کو ابھارا اور روح انسانی میں جمالیات کے حسین احساس کو نکھارا جائے لیکن ہو کیا رہا ہے۔ یہ ہو رہا ہے کہ فنون لطیفہ کا ہر شعبہ، شعبہ تجارت بن گیا ہے۔ تجارتی ترقی کا صرف ایک ہی گرہ ہے، کسی نہ کسی طرح اپنی چیز کے زیادہ سے زیادہ خریدار پیدا کرو۔ سرمایہ دار صاحب بھی بناتا ہے تو اس کے پیکٹ پر عورت کی نگلی تصویر بنادیتا ہے اگر ملل یا لٹھا تیار کرتا ہے تو اس کی اشتہار بازی میں بھی جنسی

اشتعال انگیزی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور تلاش کر لیتا ہے۔ پھر دولت کی نامنصفانہ تقسیم کا مسئلہ ہے۔ ننانوے فیصدی افراد بدحال اور ایک فیصد دولت اور عیش کے تمام ذرائع پر قابض ہیں زندگی کی نعمتوں اور راحتوں کے نامنصفانہ ہنوارے نے تمام آبادی کے بڑے حصے کو حسد، لالچ، عداوت، مایوسی، غصہ، جھنجھلاہٹ، خود بیزاری اور خوف کے ایسے جذباتی امراض اور ذہنی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے جو صرف جسم ہی نہیں روح کو بھی ہلاک کر رہے ہیں۔ مجرم اور مجرم ساز عہد میں عیاشی اور تن آسانی کے تمام ذرائع جوں کے توں باقی رہیں، اور محروم انسان جذباتی طور پر مطمئن زندگی بھی بسر کر سکے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر ہم سرمایہ دار کی ہوس زر کو نہیں روک سکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ مزدور کی قناعت پسندی کا مطالبہ کریں۔ نفسیات کے ذریعے افراد کی جذباتی الجھنوں اور دماغی چپٹاک (کام پلکسر) کو کسی حد تک یا بہت بڑی حد تک سلجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن قوموں کی ذہنی اصلاح اس طرح ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص عصی اختلال، دماغی خلل یا اسی قسم کی دوسری روحانی پیچیدگی میں گرفتار ہے تو آپ تحلیل نفسی، آزاد نگاری، آزاد گوئی، تعمیر خواب اور ترقیب و تنویم کے ذریعے اس کے نفس کی گرہ کھول سکتے ہیں۔ لیکن پوری قوم کا نفسیاتی علاج کون کرے گا۔ رات میں خوابی دن میں بے آرامی، دماغ میں پیچیدگی، ذہن میں ہیجان، روح میں طوفان خیال میں بکھراؤ جذبات میں تلاطم، احساسات میں انتشار شعور میں فتور، شعور میں خواہشوں کا بھڑکتا ہوا تنور، یہ ہے تہذیب و تمدن کے اس ترقی یافتہ دور میں ہماری حالت، عہد حاضر کا انسان۔ یہ ہے اس عہد کا ترقی یافتہ آدمی، یہ ہے بحر و بر کا فاتح، یہ ہے سمندروں اور پہاڑوں کا دیوتا، یہ ہے ماہ مریخ کا طلسم کشا، یہ ہے اشرف المخلوقات بنی آدم!

پنساری کی دکان

آپ کی گلی کے کڑ پر وہ جو پنساری کی دکان ہے نا۔ کیا کیا سامان بھر رکھا ہے اس نے؟ ایک برتن میں چاول بھرے ہوئے ہیں دوسری مٹکی میں گیہوں، ایک ظرف میں مسور کی دال ہے دوسرے پیپے میں گھی، کسی میں تیل ہے کسی میں گرم مصالحہ، کسی میں کچھ کسی میں کچھ۔ دکاندار روزانہ منڈی سے نیا سامان لاتا ہے۔ اور ان برتنوں میں ڈال دیتا ہے۔ چاول ہوں گے تو چاولوں کے برتن میں ڈال دے گا۔ گیہوں کے مٹکے میں گیہوں بھر دے گا، گھی آئے تو گھی کے پیپے میں لوٹا جائے اور مٹی کا تیل مٹی کے تیل کے کنستر میں! بالکل ایسی ہی دکان آپ کے حافطے میں بھی ہوئی ہے، حافطے کی اس دکان میں مختلف برتن ہیں اور ہر برتن میں خیالوں، یادوں، تجربوں، خواہشوں اور ارادوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں۔ جس طرح چاول کی رسد چاولوں میں شامل ہو۔ گیہوں کی گیہوں میں!

گندم از گندم بر وید جو ز جو

اسی طرح آپ ذہن میں جو نیا خیال، نئی یاد، نیا تجربہ اور نیا تصور داخل ہوگا تو وہ اپنے ہم جنس خیالوں، یادوں، تجربوں اور تصورات کے گودام میں جمع ہو جائے گا۔ آپ بازار سے گزر رہے ہیں پیچھے سے کتے بھونکنے کی آواز آئی اور فوراً آپ کی رگ میں خوف و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ آپ سمجھتے ہیں یہ کیا ہوا؟ کتے کی بھون بھون آواز کانوں کے راستہ دماغ میں اور دماغ کی وساطت سے حافطے میں پہنچی اور حافطے میں پہنچ کر اس نے تمام خوف آمیز یادوں کو جگا دیا۔ جن کا تعلق کتے کے بھونکنے اور کاٹنے سے ہے۔ یعنی

ایک نئے کتے کا خوف ماضی کے کئی کتوں کے خوفناک تجربات کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور کتے کی آزار رسانی کے تمام واقعات یک بیک ذہن میں تازہ ہو گئے۔ بیداری کے ہر لمحے میں صبح سے شام تک ہم کسی نہ کسی نے احساس سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ نیا احساس حسی اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچتا ہے سوگھنا، چکھنا، چھونا، دیکھنا، سنا یہ سب اعصابی حسی ہیں۔ ان میں ہر حسی عمل کے ساتھ ماضی کی بے شمار یادداشتیں اور تجربات شامل ہیں۔ بیرونی محرکات مثلاً آواز روشنی اور حرارت، طاقتور ترین محرکات وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق ہمارے جبلی تقاضوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک کے عالم میں کھانے کی خواہش، احساسات کی جو قسم ہماری بنیادی جبلت کو جگا دیتی ہے۔ اس کا مقابلہ انسانی شعور مشکل ہی کر سکتا ہے۔ ہمارے ذہن میں جذبات، خواہشات اور تصورات کے مختلف سلسلے محفوظ ہیں یہ سب آپس میں بندھے ہوئے اور بچھے ہوئے ہیں یعنی خوف، حسد، مایوسی، احساس کمتری، بے اعتمادی، محبت، نفرت، لذت، کراہت، حسد، رشک، خود بیزاری، مردم آزاری، الغرض یہ تمام جذبات یا حسی نقوش اس طرح ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں جس طرح دی میں تیل اور پیاز میں پرت، ایک ادبے ایک، ایک کے ساتھ دوسرا، مختصر یہ کہ انسان کا ہر حسی تجربہ اس کے ذہن میں یا یادوں اور خواہشوں کے مختلف گروہوں اور قبیلوں میں پھیل چکا ہوتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

تمہاری صورتِ زیبا کو کر لیا سجدہ

نظر جہاں بھی کوئی شکل دہرا آئی

یہ صرف شعری نہیں واقعہ بھی ہے اور انسانی زندگی کا عام واقعہ۔ جب بھی اور جہاں بھی کسی چہرہ زیبا پر آپ کی نظر پڑے گی۔ شرط یہ ہے کہ آپ کا ذہن ادھر متوجہ ہو۔ آپ کو اپنا کوئی نیا پرانا، بڑا، مٹھلا، چھوٹا محبوب یاد آجائے گا، زندہ چہرہ زیبا ہی نہیں۔ اس حالت میں تصویری چہرے دیکھ کر بھی ذہن کے اندر وہی پرانی یادیں جاگ اٹھتی ہیں۔ جن کا تعلق جذباتی تجربات سے ہوتا ہے بلکہ تصویر دیکھنا بھی ضروری نہیں اگر جذبہ

محبت شدید تر ہے تو عالم فطرت کا ہر منظر صبح و شام کا نظارہ، غنچہ و گل کی ہر جھلک، شمس و قمر کا ہر جلوہ اور ایرے غیرے کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ۔ حافضے میں کسی ناکام یا کامیاب محبت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ آخر یہ جو لاکھوں افسانے لکھے جاتے ہیں، کروڑوں شعر کہے جاتے ہیں۔ موسیقی کی ہزاروں دھنیں اور رقص کے بے شمار طرز ایجاد کئے جاتے ہیں اور جو زندگی کے ہر گوشے میں حسن کاری اور جمال طرازی کا اس قدر اہتمام کیا جاتا ہے یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ سب انسانی فطرت کے ایک بنیادی تقاضے کی تسکین کے مختلف عنوان اور گونا گوں سامان ہیں۔ جو اتنے روپ اور اتنے مجسم بدل کر سامنے آتے ہیں اور ہمیں فن کارانہ حسن کارانہ اور سحر کارانہ لذتوں سے بے خود و سرشار بنا دیتے ہیں۔

ہاں اس موقع پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ اب تک انسان کی حیوانی جبلت اور اس کے تقاضوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے پڑھ کر ممکن ہے آپ انسان کی حیوانی جبلت کو شیطان کی کارستانی قرار دے لیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے خود انسان حیوان ناملق ہے۔ یعنی ایک ایسا حیوان جو نفس ناملقہ (مقتل، فہم، اتیان، خیر و شر اور سعادت و فطریات) کے زبیر سے آراستہ ہے۔ جب انسان کو حیوان کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کا شمار کتے بلی کی برادری میں کیا جائے، نہیں، یہاں حیوان کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان میں تحفظ حیات کی وہی جبلت پائی جاتی ہے جو حیوانوں کے اندر کارفرما ہوتی ہے۔ مثلاً غذا کی طلب، جنسی خواہش، اپنے تحفظ حیات کا واسعہ اور ملکیت و اقتدار کا جذبہ جھین لیا جاتا تو یا نسل انسانی ہائیل و تانیل پر ختم ہو جاتی، یا انسان آج بھی زندگی کی اسی سطح پر ہوتا جہاں پچاس ہزار سال پہلے تھا، مقصد یہ نہیں کہ انسانی فطرت کے کسی بنیادی جذبے مثلاً خوف، غصہ، غم وغیرہ کو شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ ان جذبات کی صحیح تربیت کی جائے اور ان سے وہی کام لیا جائے جس کے لئے ودیعت کئے گئے ہیں۔ مثلاً خوف کا جذبہ ہے۔ اگر

انسان بے خوف پیدا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ بھوک کے خوف، دشمن کے خوف اور ہلاکت کے خوف سے محفوظ رہنے کے لئے زراعت کو ترقی دینا زمینوں کو آباد کرنا قوائے فطرت کو تسخیر کرتا۔ صحت و تندرستی کے ذرائع دریافت کرتا، شہر بساتا، حکومتوں کو وجود میں لاتا، معاشرے کی بنیاد ڈالتا، قوانین کی ترتیب کرتا، اخلاقی و قواعد و ضوابط کو رواج دیتا۔ یہ ساری ترقیاں اور تہذیبی سرگرمیاں تو اس لئے ضروری قرار پائیں کہ انسان خوف سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اس حد تک خوف کا جذبہ صحت مند جذبہ ہے۔ لیکن ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ یہ جذبہ ذہنی بیماری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے تمام جذبات کا ہے۔ انسانی نفس کی ہر جذباتی تحریک، ہر خواہش، ہر تقاضا۔ انسانی زندگی اور صحت مندی کے لئے ضروری ہے بشرطیکہ ان جذباتی تحریکوں اور خواہشوں کا استعمال تعمیر زندگی کے لئے کیا جائے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج انسانی جبلت کے ان قدرتی جذبات کو جن کا مفید اور معتدل استعمال روحانی ترقی جسمانی صحت ذہنی بلوغ اور دماغی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ اس بُری طرح چنگایا اور جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ وہ بلائے جان بننے چلے جا رہے ہیں۔ آپ صبح بستر سے اٹھنے نہیں پاتے کہ ریڈیو کی نغمہ سرائی شروع ہو جاتی ہے اور جذباتی یوتوں کا طوفان اُمنڈ اُتار رہا ہے۔ گویا ہماری ہمتیں طبلے کی تھاپ اور ٹھکڑوں کی جھنکار سے شروع ہوتی ہیں۔ ابھی ریڈیو کی جذباتیت انگیز نشریات جاری ہوتی ہیں کہ میں اور آپ صبح کا اخبار ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور صفحہ اول پر کوئی خوب صورت تصویر۔ ذہن میں خواہواہ کی جنسی خواہشوں کے نجانے کتنے زہریلے ناگوں کو چھیڑ دیتی ہے۔ پھر میں اور آپ دفتر کے لئے روانہ ہوئے ہیں جا بجا دیواروں پر نئی اور پرانی فلموں کے اشتہار ہماری آپ کی نظروں کو بے اختیار الجھا لیتے ہیں۔ وہی ننگے جسموں کی نمائش، وہ ٹیکسی چوتھیں، وہی ہانکے تیور، وہی سینے کا ابھار، وہی کولہوں، پنڈلیوں اور زانوں کے اشتعال انگیز زاویے، چاہے میں اور آپ شعوری طور پر ان تصویروں کے بارے میں نہ سوچتے ہوں لیکن لاشعور کا کیمبرہ ہر منظر کی تصویر لے رہا ہے۔ ہمارے علم و اطلاع کے بغیر، ذہن

کے اندرونی بارود خانے میں طرح طرح کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ قسم قسم کے انگارے جگ رہے ہیں لاشعور میں کیا پہچان برپا ہے، کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ شعور کا اخلاقی محتسب یعنی ضمیر کا داروغہ جیل، اخلاقی قدروں کے ہتھیاروں سے مسلح، نفس کے جیل خانے پر مسلط ہے، خود سوچئے، تحفظ حیات کا قدرتی قانون کب اجازت دے سکتا ہے کہ ہم ہر وقت جذبات کی اندرونی آگ میں سلگتے رہیں۔ اس صورت میں ذہن کو پہچان سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ کہ ہم بے اختیار اپنے مشتعل جذبات کو اندر کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور سوچ کر اپنے کو فریب دے لیتے ہیں ہم جذباتی کرب اور روحانی انتشار پر غالب آگئے ہیں۔

☆☆☆

ذہن کی تین کیفیات

چند لفظ اعمال کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ ذہن کا ہر عمل تین کیفیتوں سے مرکب ہوتا ہے۔

(1) وقوف یعنی جاننا۔

(2) احساس یعنی محسوس کرنا۔

(3) خواہش یعنی چاہنا۔

فہم اور ادراک یعنی سمجھنے اور جاننے میں فرق یہ ہے کہ فہم میں کسی بات کو محض سمجھ لیا جاتا ہے۔ وقوف یہ کہ کسی بات کو سمجھ کر اس کو صحیح یا غلط بھی سمجھا جائے۔ احساس کہتے ہیں کسی شے سے پیدا ہونے والی خوشی ناخوشی اور پسندیدگی و ناپسندیدگی کو، خواہش ارادے کی پیچیدہ قسم کا نام ہے۔ خواہش ہمارے نفس میں کوشش جدوجہد اور اظہار ہمت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی ذہنی تجربہ ایسا نہیں جس میں وقوف (جاننا) احساس اور خواہش ایک ساتھ پیدا نہ ہوں گو یہ صحیح ہے کہ ان کے درجے میں کمی بیشی ممکن ہے۔ عورتوں کے ذہن میں عام طور سے احساس کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور مردوں کے نفس اور عمل کا۔ ذہن کے زاویے تین ہیں، شعوری، نیم شعوری اور لاشعوری۔ یہ تینوں ذہنی عمل ہیں۔ شعور ذہن کی واضح خصوصیت ہے نیم شعوری حالت ذہن کی مبہم کیفیات کو کہتے ہیں اور لاشعور مجہول کیفیت کو! نیم شعوری ذہنی اعمال وہ ہیں جن میں عارضی طور پر شعوری کیفیت غائب ہو جائے۔ لیکن ذرا تاہل کے بعد وہ چیزیں ذہن میں آجائیں۔ مثلاً جس وقت میں یہ سطور لکھ رہا ہوں سڑک پر چلتے والی گاڑیوں کی آواز میرے کان میں آرہی

ہے مگر محویت کے سبب بازار کا یہ شور میرے شعور سے اوجھل ہے۔ اگر یکا یک یہ شور و ہنگامہ بند ہو جائے تو مجھے فوراً احساس ہو جائے گا کہ سناٹا چھا گیا ہے۔ پتہ چلا کہ ٹریفک کا پورا شور و ہنگامہ میرے نیم شعور یا تحت الشعور میں موجود تھا، البتہ عارضی طور پر شعور اس سے غفلت برت رہا تھا۔ جو نیمی شعور کی توجہ ادھر مبذول ہوئی تحت الشعور سے ساری آوازیں ابھر آئیں۔ جہاں تک لاشعوری اعمال کا تعلق ہے تو ہمیں ان سے آگاہی حاصل نہیں ہوتی وہ اکثر و بیشتر شعور سے اوجھل اور مجہول رہتے ہیں۔ البتہ تحلیل نفسی اور تعبیر خواب کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک اس سمندر کی گہرائی میں اترنا ممکن ہے۔ لاشعوری اعمال وہ ہیں جن کا رشتہ ذہن کے شعوری عمل سے کٹ جائے اور ہم ان اعمال کے بارے میں غفلت شعاری اختیار کر لیں۔

شعور کے مقابل اور ذہن کے سامنے جو اشیاء ہوتی ہیں ان کا ایک تو مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ باقی حاشیہ! جب شعور کسی پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے تو اس کے مرکز کو اپنی گرفت میں لے آتا ہے اور حاشیہ کی چیزوں کو کسی نہ کسی حد تک نظر انداز کر دیتا ہے۔ مثلاً میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں تو میری توجہ بنیادی طور پر آپ کی باتوں کی طرف مبذول ہوگی۔ اس وقت دہنی توجہ کا مرکزی نقطہ آپ کی بات چیت ہوگی اور خود آپ کا جسمانی وجود حاشیہ بن گیا۔ کوئی چیز مستقل طور پر توجہ کا مرکزی نقطہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ ذہن ہمیشہ روانی اور جست و خیز کے عالم میں رہتا ہے ابھی ایک چیز اس کی توجہ کا نقطہ ماسکہ مرکوز ہے۔ ابھی دوسری چیز، ایک شے سامنے آتی ہے اور پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ یہ دہنی عمل برابر جاری رہتا ہے۔ شعور کے نقطہ ماسکہ (یعنی جس نقطہ پر دہنی توانائی مرکوز ہے) کو توجہ کہتے ہیں۔ توجہ کیا ہے؟ بہت سی اشیاء میں ایک چٹخی ہوئی دہنی فعلیت یا عمل! مثبت توجہ وہ ہے جو حاشیہ پر واقع ہو۔ شعور کے وسیع کیونوں کے کسی نقطہ کو کھینچ کر شعور کے نقطہ ماسکہ یا مرکزی حصے کے سامنے لے آنا۔ یہی توجہ کا عمل ہے۔ محویت کے عالم میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی خاص چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور شعور کا پورا

کیونوں ذہن کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ خالی الذہنی کی علامت ہے یعنی سب کچھ نظر کے سامنے ہے اور ذہن ہر منظر کی طرف سے بے نیاز!۔ کسی شے کی طرف توجہ مبذول کرنے کے اسباب خارجی بھی ہوتے ہیں داخلی بھی! خارجی سمجھات میں کسی شے کی شدت، مثلاً پُر شور آواز توجہ کر لیتی ہے، یا کسی چیز کی فراخی یا وسعت توجہ کا مرکزی نقطہ بن جاتی ہے۔ مثلاً سمندر کی چوڑائی یا کسی شے کی نمایاں خصوصیت انعطاف توجہ کا مرکزی نقطہ بن جاتی ہے۔ مثلاً بے حد دراز قد آدمی یا حرکت، مثلاً ہوائی جہاز کی پرواز یا کسی چیز کا انوکھا پن۔ مثلاً عالم پرواز میں طیارے کا فضا میں غوطہ لگانا یا تغیر، مثلاً الارم کی آواز یا تکرار، مثال کے طور پر بار بار ایک ہی فقرہ دہرانا، یا کسی واقعے کا طریقہ انداز اور خندہ آور پہلو، توجہ کے ارتکاز کے لئے ضروری ہے کہ ذہن پر تازگی اور چستی کی کیفیت طاری ہو، تھکن اور ٹکان کے عالم میں ارتکاز توجہ مشکل ہے، مخفی توجہ کو دلچسپی کہتے ہیں۔ جس چیز سے دلچسپی ہوگی اس کی طرف خود بخود ذہن راغب ہو جائے گا۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے ثانوی انفعالی توجہ کہا جاتا ہے، توجہ اور احساس دلچسپی کی یہ کیفیتیں ذہن پر بیک وقت طاری ہوتی ہیں یعنی ہم ایک ہی وقت میں محسوس بھی کرتے ہیں اور متوجہ بھی ہوتے ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ مرکز توجہ بن جانے والی دلچسپ شے خوشگوار ہی ہو خوفناک بھی ہو سکتی ہے، دلچسپی کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(1) جنلی (2) اکتسابی (3) عارضی

عورت سے مرد کی دلچسپی جنلی ہے۔ سگریٹ سے سگریٹ نوش کی دلچسپی اکتسابی ہے، عارضی دلچسپی یہ ہے کہ وقتی طور پر آپ کو فلم پسند آگئی، پھر اس کی کہانی اور ڈرامائی کیفیت فراموش ہوگئی۔ دلچسپی کی طرح توجہ کی بھی تین قسمیں ہیں (1) انفعالی (2) فعالی (3) اور ثانوی انفعالی توجہ۔ انفعالی توجہ وہ ہے کہ جو کسی شے کی توجہ طلب خاصیت یا حرکت کے سبب پیدا ہو مثلاً کبھی کا بار بار آپ کے چہرے پر بیٹھنا اور آپ کا بار بار اسے اڑانا، فعالی توجہ میں ذہن اپنی مرضی اور اندرونی تحریک سے خود کی فعالیت کہیں گے۔ مثلاً

میں یہ عبارت پوری توجہ سے لکھ رہا ہوں۔ اسے توجہ کی فعالیت کہیں گے۔ فعالی اور انفعالی توجہ میں فرق یہ ہے کہ انفعالی توجہ کے عالم میں کوئی خارجی شے، کوئی باہر کی چیز (مثلاً آواز یا حرکت) ہم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک شخص یکا یک چیختے لگے۔ اس کی چیخ و پکار کی طرف ذہن متوجہ ہو گیا تو اسے توجہ کا ثانوی انفعالی عمل کہیں گے۔ لیکن جہاں تک فعالی توجہ کا تعلق ہے تو ہم اس عالم میں کسی شے سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ذہن جن دلچسپیوں کو پسند کرتا ہے اس کو نظام ادراک کہتے ہیں۔ یہ وہ نظام خیالات ہے جسے ہم گزشتہ ادراک سے حاصل کرتے ہیں اور جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اسی قسم کے دوسرے خیالات کی طرف متوجہ ہوں۔ شروع میں ذہن کا نظام ادراک سعی و کوشش سے پیدا ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ یہ ایک منظم ذہنی عمل کی صورت اختیار کر جاتا ہے جس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی سعی و کوشش کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ثانوی انفعالی توجہ درحقیقت ذہن کے نظام ادراک ہی کا ایک حصہ ہے۔ پہلے پہلے آپ کسی مضمون یا موضوع (اسلامیات، معاشیات، نفسیات وغیرہ) کی طرف سعی و کوشش سے متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دلچسپی کا بنیادی نقطہ بن جاتا ہے اور کسی سعی و کوشش کی ضرورت نہیں۔ توجہ کے باطنی پہلو کے علاوہ اس کے ظاہری انداز دو ہیں۔ جسم کا خاص پوزیشن میں آجانا۔ مثلاً کسی نقطے کو بغور دیکھنا۔ شدید توجہ کے عالم میں سانس کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور یہ محویت توجہ کا خاص انداز ہے۔ میں نے اس موقع پر خاص طور سے ذہنی عمل اور توجہ کا ذکر کیا ہے اور اس لئے کیا ہے کہ ان مضامین میں آگے چل کر بار بار تذکار توجہ CONCENTRATION پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائے گی کتاب کا موضوع گفتگو نفسیات نہیں ہے۔ مابعدالنفسیات ہے اور مابعدالنفسیات کا فن ذہن کے ان اعمال سے بحث کرتا ہے۔ جو نہ صرف حواس خمسہ کی غیر معمولی کارگزاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض انسانی حواس یا نفسی طاقتوں کے مظاہر اور مظہر ہیں۔ جو شاذ و نادر ہی رُوبہ عمل میں آتی ہیں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ شعور۔ تحت الشعور اور لا شعور کے

خانوں میں ذہنوں کی تقسیم محض فرضی اور خیالی چیز ہے نفسیات دانوں نے بعض حقیقتوں کی تفسیر و تشریح کے لئے بغرض آسانی شعور کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ورنہ خود نفس انسانی کے اندر اس قسم کی کوئی درجہ بندی موجود نہیں۔ اس سلسلہ بحث میں جا بجا تحت الشعور اور لا شعور کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ درحقیقت میرے سامنے بھی وہی مجبوری تھی جس سے دوسرے اہل نفسیات دوچار رہے ہیں۔ یعنی ذہنی اعمال و مظاہر کی سمجھ میں آنے والی تشریح و وضاحت کے لئے ناگزیر ہے کہ ہمارے عقائد کی طرح تحت الشعور اور لا شعور کے وجود کو تسلیم کیا جائے، ورنہ تحت الشعور اور لا شعور کے وجود اور نفس انسانی کی اس تقسیم میں کوئی سائنسی دلیل کسی کے پاس نہیں ہے! مابعدالنفسیات کے مباحث میں بھی آسانی کی غرض سے اسی تقسیم شعور سے کام لیا جاتا ہے۔

یاں وہی ہے جو اقرار کیا

ورنہ اصولی طور پر مابعدالنفسیاتی نقطہ نظر سے اب تک "نفس انسانی" کی حقیقت نامعلوم ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ محدود کیا ہیں، غایت و مقصد کیا ہے؟

☆☆☆

مابعد النفسیات کا نقطہ نظر

زندگی کے روحانی نقطہ نظر اور روحی نقطہ نظر کے درمیان جو فرق ہے اس کو سمجھے بغیر مابعد النفسیات کے مسائل و مباحث کو سمجھنا دشوار ہے۔ روحانیت کی بنیاد عقیدوں کی سطح پر استوار ہے۔ اور روحیت محض ایک عملی اور تحقیقی نظریہ ہے۔ مابعد النفسیات صرف روحی نقطہ نظر سے بحث کرتی ہے مثلاً ادراک ماورائے حواس "یعنی آنکھوں کا، کان، ناک اور دوسرے حواس خمسہ کی مدد کے بغیر علم و ادراک حاصل کرنا۔ نفسیات کا پورا زور اس پر ہے انسانی ادراک کا واحد ذریعہ اس کے حسی اور حرکی اعصاب ہیں۔ فن مابعد النفسیات بھی حصول علم کے ان جسمانی ذرائع (اعصاب، احساس و حرکت) کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس کا دعوٰی یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر بعض ایسی خالق العادات (سپر نارمل) صلاحیتیں موجود ہیں کہ اگر ان کو استعمال کیا جائے تو ذہن حواس خمسہ اور ان کے آلات و وسائل (حسی و حرکتی اعصاب) کو استعمال کئے بغیر بعض یا اکثر حقیقتوں کو دریافت کر سکتا ہے۔ میں "روحانیت" اور اس کی اعلیٰ اور پاکیزہ اقدار کا منکر نہیں ہوں اور نہ روحانیت پر ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ میرا موضوع انسان کی عقلی و دماغی قوتوں کی تحقیق ہے۔ اس لئے بحث و گفتگو کے ہر مرحلے پر عقیدے اور عقیدت کے بجائے تجربے اور تجربات کو پیش نظر رکھا گیا ہے!

بعض حضرات اس سلسلہ مضامین کو غلط فہمی کی بناء پر کسی خاص روحانی نقطہ نگاہ کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔

☆☆☆

روحیت

روحیت اس مخصوص نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کو کہتے ہیں جو کبھی کبھی ذہن کو شعور کی عام سطح سے بلند کر کے اسے بعض ایسی پراسرار قوتوں یا چند ایسے قوانین فطرت سے دوچار کر دیتی ہے جس کی تشریح ہم فطرت کے معلوم قوانین اور عادت کے لگے بندھے ضابطوں کی روشنی میں نہیں کر سکتے۔ انسانی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے اس وقت سے ہر عہد، ہر خطے اور ہر ملک و قوم میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں جنہیں ہم فرق عادت اور فوق الفطرت مظاہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرق عادت اس واقعے کو کہتے ہیں جو عادت کے خلاف ظہور میں آئے۔ مثلاً انسانی آنکھ فرض کیجئے کہ ہزار گز تک دیکھ سکتی ہے۔ اگر کوئی اس آنکھ کی پراسرار قوت سے ہزار میل دور تک دیکھنے کے قویہ واقعہ فرق عادت کے ضمن میں شمار ہوگا۔ مستقبل بنی معجزہ نما پیش گوئیاں، ساحری، القاء، وجدان، کشف اور اشراق کی حالتیں یہ سب روحیت کے مظاہر اور مابعد النفسیات کے دائرہ تحقیق میں شامل ہیں۔ تاریخی اور عملی طور پر ان واقعات (یا اس قسم کے بیانات) کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر قبیلے میں رابہ، کامن، جوگی، فقیر، ہنجاری، شعبہ گر، مستقبل بین، نبوی، غیب دان، رمال اور عالم ارواح سے تعلق کا دعویٰ رکھنے والے مجذوبوں کے گروہ موجود رہے ہیں۔ اگر تاریخ میں فرق عادت قسم کے چند واقعات محفوظ اور موجود ہوتے تو کہا جاسکتا تھا کہ یہ محض من گھڑت کہانیاں اور نیم پاگل دماغوں کی خیال آرائیاں ہیں۔ لیکن ان واقعات کی اتنی کثرت ہے اور اس قسم کے مظاہر اس درجہ تواتر و تسلسل کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں کہ ان کو بیک یک جنش قلم مسترد

کردینے کے معنی یہ ہوں گے کہ تاریخ انسانی کے اہم باب کو حذف کر دیا، ہر قوم کی دیوالا، اساطیری کہانیاں، تخلیقی حکایات ادبی شاہکار اور قومی تذکرے اس قسم کے حیرت انگیز واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ سب جھوٹ ہے تو بین الاقوامی پیمانے پر ہر زمانے میں اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا گیا؟ اگر ان واقعات کا صرف دسواں حصہ بھی صحیح ہے تو ان کی صحت کا جائزہ کس طرح لیا جائے؟ جس چیز کو ”روحیت“ کہا جاتا ہے اگر اس کا کوئی علمی جواز ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ قدیم و جدید انسانی تاریخ کے ان مظاہر کی چھان بین کی جائے جنہیں غلط طور پر سپرنچرل یا فوق الفطرت کہا جاتا ہے۔ اچھا مان لیا کہ پرانی تاریخیں جھوٹ کا پستارہ ہیں۔ پچھلے زمانے میں خوش عقیدہ، سادہ لوح اور اوبام پسند انسانوں کی اکثریت تھی اور لوگ سائنسی نقطہ نظر سے بے بہرہ تھے۔ لہذا جس نے جھوٹ بولا سچ مان لیا گیا۔ یہ زمانہ علم و عقل کی روشنی کا زمانہ ہے۔ اب کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہر درخت پر بھوتوں کا ڈیرہ اور ویران مکان میں جنات کا ٹھکانہ ہے۔ ہم ان چیزوں سے بحث ہی نہیں کرتے، روحیت کے طالب علم کا سوال صرف یہ ہے کہ خود آپ کی زندگی میں بھی ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی تشریح آپ فطرت اور عادت کے جانے پہچانے کا کون اور علت و معلول کے نکلے بندھے رشتوں کی مدد سے نہ کر سکے ہوں۔ کیا کبھی آپ نے کوئی ایسا منظر (وژن) دیکھا ہے جس نے آپ کو چکر دیا ہو۔ مثلاً کبھی ایسا ہوا ہے کہ یکا یک اپنے کسی مرحوم عزیز کا بیوی فضا نظر آیا اور پھر دفعتاً تحلیل ہو گیا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ یکا یک رات میں سوتے سوتے آپ کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ آپ فلاں عزیز یا فلاں دوست آپ کے بستر خواب کے پاس کھڑا ہے۔ چند لمحے تک اس کی شکل نظر آتی رہی پھر آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ آپ نے یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا کچھ نہیں محض نظر کا فریب اور تصور کا دھوکا تھا لیکن صبح اٹھ کر پہلی خبر یہی ملی کہ کل رات فلاں عزیز یا دوست کا انتقال ہو گیا۔ میں بھی سوچ رہا ہوں آپ بھی سوچئے۔ کئی روز سے دل بُری طرح دھڑک رہا ہے حالانکہ بظاہر تردد و تشویش کی کوئی وجہ نہیں۔

آخر غیر متوقع طور پر کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ میری اور آپ کی پریشانی، حیرانی اور انجان تشویش حق بجانب ثابت ہو گئی۔ آپ کے ساتھ کبھی یہ صورت پیش آئی ہے اور ہاں کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک بار نہیں کئی بار کسی کو اپنا نام پکارتے سنا ہو، ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نہیں یہ ہو نہیں سکتا کہ عمر کے کسی حصے میں آپ نے محبت نہ کی ہو تو شدت محبت و جنون عشق کے یادگار دور میں کبھی یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ آپ نے محبوب کو بے قرار ہو کر یاد کیا ہو اور وہ اچانک چلا آیا ہو یہ کہتے ہوئے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گردن میں رسی ڈال کے کھینچتا ہوا آپ کی طرف لئے چلا آ رہا ہے۔ آپ کی زندگی میں کتنے ناخوشگوار یا خوشگوار واقعے ایسے ہیں جن کی پیش گوئی آپ نے ظاہری سبب کے بغیر کر دی اور پھر عملاً آپ کی پیش گوئی کے مطابق تمام واقعات ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ کیا آپ نے زندگی میں ایک خواب بھی ایسا نہیں دیکھا جو مستقبل میں ہو ہو اور موہو صحیح ثابت ہوا ہو۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے آپ نے محض وجدانی طور پر دوسرے کے دل کی بات بتادی ہو یا کچھ ایسی باتیں کہی ہوں جو بعد میں صحیح ہوئی ہوں یہ اور اسی قسم کے حجت سے مظاہر اور واقعات جن میں میں نے آج بھی ہر ادوی یا بہت سے ادوی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر دوچار ضرور ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان واقعات و مظاہر کی توجیہ (کہ یہ کس طرح اور کیوں پیش آئے) کیا کی جائے۔ ہر باشعور آدمی کو اس معے کے سلجھانے کی کوشش کرنی چاہئے! صرف ”اتفاق“ کہہ کر خارق العادت (سپرنچرل) کی اہمیت ختم نہیں کی جاسکتی۔

اس موقع پر آسیب زدہ مکانات، حاضراتِ ارواح، جادو اور یوگیوں کے کمالات (زمین میں دفن ہو جانا، آگ پر چلنا، زہریلے سانپوں سے ڈسوانا اور انہیں بنگل لینا، مہینوں تک کھائے پئے بغیر تندرست رہنا، نظر کی قوت سے چیزوں کو فضا میں معلق کر دینا، ہوا میں اڑنا، یا گھنٹوں پانی میں غرق رہنا، توجہ کی قوت سے لوگوں کو مسخر کر لینا۔ ان کی قوتِ ارادی سلب کر لینا پر بحث مقصود نہیں۔ پھر کسی وقت ان مسئلوں پر عملی انداز

سے کچھ عرض کیا جائے گا۔ واقعی علمی گفتگو کی ضرورت بھی ہے کیونکہ ان تمام خلاف عادت قوانین کے پیچھے فطرت ہی کے اہل قانون کام کر رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے خلاف فطرت (گو خلاف عادت ہو) کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانی نفس کے اندر وہ تمام قوتیں موجود ہیں جن کی بیرونی علامتیں اور خالص مادی نشانیاں بھاپ، بجلی اور ایٹم کے حیرت انگیز استعمالات میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ٹیلیگراف، ٹیلی فون، ریڈیو، جیٹ طیارے، آبدوز، کشتی، خلائی راکٹ، مصنوعی سیارے وغیرہ دھات اور پلاسٹک کے بنے ہوئے یہ تمام آلات اور ان مشینوں میں استعمال ہونے والا ایندھن انسانی ذہن کی دریافت ہے۔ ہم نے بجلی کی قوت کا انکشاف کیا اور اس لہروں سے روشنی، گرمی، توانائی اور برق رفتاری کے بجائے کتنے کام لئے، کتنے کام لے رہے ہیں، اور کتنے کام لیں گے؟ جسے ہم سائنس، انجینئرنگ، فزکس، ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔ آخر وہ ہیں کیا؟ انسان کی ذہنی طاقت کا ایک مادی مظہر ہی تو ہیں۔ یہ سب کچھ! ذہن کی جس نادور قوت نے سائنسی آلات کو اپنے مظہر اور اپنی قوت ایجاد و اختراع کے لئے کار کے طور پر استعمال کیا ہے وہ طاقت خود کیا ہوگی؟ کبھی انسانی دماغ کی ایجاد آفرینی اور پراسرار فعلیت (فعلیت یعنی فنکشن) کے اس پہلو پر بھی آپ نے غور کیا ہے؟ میں اپنے ٹیلی فون کا ڈائل گھماتا ہوں اور لاہور میں کسی دوست سے بات چیت شروع کر دیتا ہوں۔ میں اپنے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیتا ہوں اور تہران کی نشریات سننے لگتا ہوں۔ وقت اور مکان کے تمام فاصلے ایک سیکنڈ میں طے ہو جاتے ہیں اور میرا ٹیلی فون اور ریڈیو ہزاروں میل دور کی آوازیں مجھے سنانے لگتا ہے (اب تو زہرہ اور چاند کی سطح پر اترنے والے راکٹوں تک سے زمین پر تصاویر اور اشارات کی ترسیل جاری ہو گئی ہے) بے شک بظاہر یہ کارنامے پلاسٹک، لکڑی، المونیم اور لوہے کے بنے ہوئے آلات نے انجام دیئے۔ لیکن درحقیقت ریڈیو، ٹیلی فون یا ٹیلی ویژن اور وائرلیس، خود انسانی ذہن و دماغ کی صلاحیت اختراع کے معمولی اور پیش پا افتادہ کارنامے ہیں۔ اس عہد

ایجاد ترقی میں ہر صاحب استطاعت کے کمرے میں بیک وقت دو بے جان آلے (ریڈیو اور ٹیلی فون) گھنٹوں بولتے رہتے ہیں۔ مگر نہیں بے جان آلے نہیں بولتے، بجلی کی لہریں کلام نہیں کرتیں، ٹیلی فون اور ریڈیو کے بھیج میں انسانی ذہن اور اس کی حیرت انگیز قوت بولتی ہے۔ انسانی شعور گنگنا تا ہے۔ اور ہم خود اپنی صناعی اور صنعت گری سے دنگ رہ جاتے ہیں۔

مابعدالطبیات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسانی شعور (اپنے تمام پہلوؤں یعنی تحت الشعور، لاشعور اور شعور برتر کے ساتھ) فقط ریڈیو، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن ہی کا موجد نہیں۔ بلکہ وہ خود اپنی ماہیت میں ریڈیو کی ٹیلی فون کی اور ٹیلی ویژن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم بجلی، بھاپ اور پیٹرول کی مدد سے بے جان مادوں میں جو قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ قوت ہمارے اندر بھی کارفرما ہے۔ زمانہ بعید میں انسان اس قوت سے کام لیتے رہے ہیں۔ بعض آج بھی کائنات پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں خواہ ایک لمحے کے لئے ہی سہی۔ البتہ زندگی میں ایک نہ ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے کہ انسانی دماغ عناصر کی پابندیوں سے آزاد ہو کر لازمانی اور لامکانی کی بلندیوں کو چھو لے۔ ہمارا شعور بلاشبہ ایک مادی پرزہ ہے جو حواس خمسہ سے کام لے کر کسی حقیقت کی تہ تک پہنچتا ہے۔ بے شک عقل اپنی منطق و استدلال کی رُو سے کوئی نتیجہ نکالتی ہے، ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، جھکھتے ہیں، چھوتے ہیں اور سو گھٹتے ہیں۔ سن، دیکھ، چھو، پکھ اور سو گھ کر حافظے کے نوکری میں پچھلے تجربات کے ڈھیر کو ٹٹولتے ہیں۔ فوراً اس شے کی حقیقت اور نوعیت معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم نے مٹی پر سرخ پھول دیکھا۔ ایک لمحے میں عقل نے فیصلہ کر لیا یہ گلاب کا پھول ہے۔ کیونکہ گلاب کے پھول کی عکسی تصویر یادداشت میں محفوظ تھی۔ تو عقل کا کام کیا ہوا؟ یہ کہ ہر نئے علم کو پرانے تجربے سے ملا کر اس کی حقیقت معلوم کرے۔ انسانی ذہن جب بھی کسی شے کی نسبت اپنے جہل کو علم میں بدلنا چاہتا ہے تو اس کا طرز عمل بھی

یہی ہوتا ہے۔ گویا انسانی شعور کی عام کارکردگی حواس کے وظائف و افعال پر موقوف ہے لیکن شعور کے اس مادی پہلو کے علاوہ اس کا ایک اور بھی پہلو ہے۔ اس دوسرے پہلو کو نفس یا شعور انسانی کا ”روحی پہلو“ کہا جاسکتا ہے۔ صرف روحی پہلو! روحانی پہلو نہیں کہہ سکتے کیونکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ روح انسانی کے اعلیٰ مادی مظاہر (روحانیت و عرفان) کے بارے میں کچھ کہنا اور لکھنا میری استعداد سے باہر ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے حیات و کائنات کی اصل ایک ایسا جوہر ہے جو بظاہر مادے اور توانائی سے مرکب ہے۔ مادہ ذرات پر مشتمل ہے اور توانائی لہروں پر! ہمارا جسم مادے کا بنا ہوا ہے۔ اس کی ششوں، شکل، گوشت، پوست، ہڈیاں، خون اور عضلات ہیں اور لطیف ترین روپ حواس! حواس سے مطلب ہے آنکھ، کان، زبان، ناک اور کھال سے تعلق رکھنے والے مہیجات اور احساسات حیات خمسہ (بصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ) کے بعد لطافت و قوت کے اعتبار کا نمبر آتا ہے۔ آنکھ کا مہیج روشنی ہے، کان کا آواز ہے، کھال کا مہیج جسم ہے۔ یہ مہیجات جب حسی اعصاب کے ذریعے نفس میں پہنچتے ہیں تو جذبات پذیر ہوتے ہیں۔ آپ نے کوئی خوشگوار نظارہ دیکھا قلب میں فرحت پیدا ہوئی۔ کان نے کوئی نوا سن لی۔ آواز سنی، رگ و پے میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ یہ ہوئے جذبات! منطق و استدلال کی حیثیت جذبات سے لطیف تر اور بلند تر ہے۔ آپ اپنے دشمن کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کو گالیاں دے رہا ہے، اس کی شکل اور اس کی آواز، آنکھ اور کان کے لئے مہیج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان مہیجات کے سبب آپ کو غصہ آتا ہے۔ لیکن عقل اور منطق کے تقاضے کے پیش نظر غصے کو ضبط کر لیا جاتا ہے گویا ایک سیکنڈ میں آپ تین مرحلوں سے گزرے (الف) مہیج (ب) جذبہ (ج) عقل۔ یہ سب انسانی ذہن کے مادی اعمال تھے جو درجہ بدرجہ لطیف تر شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ تا آن کہ رفتہ رفتہ انسان کی مادیت محض توانائی (انرجی) کا روپ اختیار کر گئی۔ عقل اگرچہ بعض اعتبارات سے مادی نزاد ہے۔ لیکن عمل کے اعتبار سے توانائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ روحیت (سائیکلزم)

انسانی ذہن کے اسی رخ پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ مابعدالنفسیات میں روحیت کا اطلاق ”ادراک ماورائے حواس“ کی قوت اور اس کے عمل پر ہوتا ہے۔ ہر عمل یا ادراک جو حواس خمسہ کی وساطت کے بغیر حاصل ہو، وہ روحیت اور مابعدالنفسیات کی تحقیق و گفتگو کا موضوع ہے۔ روحانیت (اسپرینچول ازم) روح اور جسم کو الگ الگ قرار دیتی ہے۔ جس کے مقاصد جداگانہ ہیں، اور اعمال مختلف، روحیت کے نقطہ نظر سے انسانی وجود سہ منزلہ واقع ہوا ہے۔ مادی جسم، نوری جسم اور روح، مابعدالنفسیات کا مکتبہ فکر روح کے اعمال و وظائف سے بحث نہیں کرتا کہ یہ منصب روحانیت کا ہے ”روح“ کی سرنشت پر مذہب اور دینی عقائد کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مذہبی عقائد اور روحانی تصورات کے ساتھ روحیت کا رویہ احترام آمیز غیر جانب داری کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ مذہب نے حیات بعد الممات، حشر و نشر اور جزا و معاد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق عقائد اور انسانی جبلت کے اخلاقی تقاضوں سے ہے۔ روحیت نہ ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتی ہے نہ کسی عقیدے پر اصرار! اس لئے کہ روحیت کے پاس وہ پیلانے ہی موجود نہیں کہ ان حقائق کی غائب تول کی جاسکے۔ البتہ روحیت کے پاس وہ معیار موجود ہیں کہ انسانی وجود کے مادی پہلو اور نورانی پہلو کے درمیان فرق کر سکے۔ آپ حیران ہوں گے کہ انسانی وجود کے مادی اور نورانی پہلو سے مراد ہماری مراد ہے؟ تو سنئے۔ انسانی وجود کے مادی پہلو، گوشت، پوست کا ڈھیر ہے۔ جس کی طرف ہم اپنے کو بڑے فخر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں یہ صرف ایک پہلو ہے، حقیقی انسانی وجود کچھ اور ہے۔

پیکرِ نور

آئینے میں آپ کو اپنا عکس نظر آتا ہے اور روشنی میں اپنی پرچھائیں۔ یہ ہیں آپ کے مادی جسم کے پرتو! آئینے اور روشنی میں آپ کو صرف اپنی ظاہری پرچھائیں نظر آتی ہیں ایک اور بھی عکس ہے جو چشمِ ظاہر سے نظر نہیں آتا۔ اسے جسمِ انسانی کا نورانی یا اشیری عکس کہتے ہیں، اشیر یا اتھر مادے کی لطیف ترین حالت کو کہا جاتا ہے۔ بہر حال مادے کی تین حالتیں ہمارے علم میں ہیں یعنی یادہ سیال شکل میں پایا جائے گا جیسے پانی، یا ٹھوس حالت میں جیسے برف، یا گیس کی شکل میں جیسے بخار، مادے کی چوتھی حالت وہ ہے جو اتھر اور اشیر کے روپ میں پائی جاتی ہے۔ سائنس اتھر کے وجود کا نہ اقرار کرتی ہے نہ انکار۔ آپ اسے بلازائی وکچ اور فیلڈ آف فورس کہیں یا اتھر! بہر حال مادے کی چوتھی (لطیف ترین) صورت موجود ضرور ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر فطرت کے بعض اہم مظاہر (مثلاً تابکاری، ریڈی ایشن) کی تشریح ممکن نہیں۔ پھر انسانی جسم کے نورانی حصے یا اشیری پرچھائی کو ہمزاد کہئے یا اپنا وجود لطیف، بات ایک ہی ہے۔

تمام زندہ جسموں سے ایک خاص قسم کی برقی مقناطیسی رد (الیکٹرو میگنٹ) نکلتی ہے۔ خود ہمارے جسم سے بھی! کبھی کبھی جسمِ انسانی کا برقی مقناطیسی ہالہ آنکھ سے بھی نظر آ جاتا ہے۔ یہ الیکٹرو میگنٹ رد ہر انسانی جسم کے گرد ایک نورانی ہالے کی شبیہ اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔ نور کا ہالہ جسمِ انسانی سے چند انچ کے فاصلے پر مجسم شکل میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موت صرف جسمانی وجود پر وارد ہوتی ہے۔ انسان کا اشیری یا نورانی وجود ملک الموت کی دستِ نمد سے محفوظ رہتا ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ

اپنے اشیری وجود اور ہمزاد کو تابع کر کے اس سے طرح طرح کے کام لے سکتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انسانی جسم سے الیکٹرو میگنٹ (برقائطیسی) لہریں نکلتی ہیں تو اس کا تجربہ اکثر و بیشتر حضرات کو ہوتا رہتا ہے۔ میرے حلقہٴ احباب میں ایک صاحب ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے تاریکی میں انہوں نے دیکھا کہ دونوں ہاتھ کی انگلیوں سے بے رنگ قسم کی روشنی نکلنے لگی۔ شدید اعصابی حساسیت رکھنے والے لوگوں کے جسم سے ”زردس ڈسچارج“ (اعصابی توانائی کا بہاؤ) کثرت سے ہوتا ہے اس قسم کے لوگ بہت آسانی سے اپنے جسم سے نکلنے والی لہروں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ نیم تاریک کمرے میں اگر وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کر جھٹکے کے ساتھ الگ کریں تو ممکن ہے کہ ہر انگلی سے ایک بھوری (نیم سفید) خاکستری دھند نکلتی نظر آجائے۔ ضروری نہیں کہ بار بار ایسا ہو۔ کہنا یہ ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس سے برقی مقناطیسی (الیکٹرو میگنٹ) قسم کی لہروں کے اخراج کا معائنہ سائنسی طریقے پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ تکنیک یہ ہے کہ ہاتھ کو ایکٹشل فلٹرز سے نکلنے والی الزوا میلٹ (ماورائے بنفشی) شعاعوں کی دھار کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس صورت میں انسانی جسم کے زردس ڈسچارج پائے جانے والی اعصابی توانائی کا عکس حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مرحوم علامہ نیاز فتحپوری نے اپنے ایک مضمون میں مسیح الملک حکیم اجل خان مرحوم کی کسی مریضہ کا ذکر کیا تھا۔ اس مریضہ کے جسم سے چمکدار روشنی نکلتی تھی۔ علامہ مرحوم نے اس سلسلے میں ڈاکٹر کلنر کی نادر کتاب ”بیومن ایٹ ماسفیر“ (فضائے انسانی) کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ کتاب میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اپنی کتاب میں ڈاکٹر کلنر نے ان تجربات کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے سینٹ تھامس اسپتال کی تجربہ گاہ میں ایک نازک مادے اور حساس پردے پر کئے تھے۔ ان تجربات سے ثابت ہوا کہ انسانی جسم سے مختلف طول موج، مختلف رفتار اور مختلف رنگ کی شعاعیں نکلتی ہیں جن دو آدمیوں کے جسم سے

نکلنے والی شعاعوں کی فریکوئنسی (طول موج و رفتار) یکساں ہوتی ہے وہ بہت جلد ایک دوسرے سے قریب تر آجاتے ہیں اور جن کی جسمانی شعاعوں کا پیمانہ مختلف ہوتا ہے وہ مختلف مزاج، مختلف عادات اور مختلف کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ انسان کا نورانی جسم (ایٹمیکیل باڈی) اس کے مادی جسم پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور اس کا اثر بھی قبول کرتا ہے۔ شدید جذباتی کیفیت (غصہ، خوف اور محبت) کے زیر اثر انسانی جسم سے اعصابی توانائی کا بہاؤ یا شعاعوں کے اخراج کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر انسان کے نورانی وجود پر پڑتا ہے، اور کبھی انسانی اشیر وجود (آسٹرل باڈی) کائنات کے نادیدہ اثر کو قبول کر کے (جیسے خواب میں) اس کے خاکی جسم کو متاثر کرتا ہے۔ بہر حال ہمارے دونوں جسموں اور وجودوں کے درمیان اثر اور با اثر اور رد عمل عکس پذیری کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک موت کا ابدی ہاتھ انسان کے لطیف مادی جسم (آسٹرل باڈی) کو اس کے کثیف مادی جسم یعنی پیکر خاکی سے کاٹ کر الگ کر دیتا۔ اس کے بعد دونوں جسموں کی منزل مقصود الگ الگ ہو جاتی ہے۔ دائمی جدائی!

☆ ☆ ☆

جذبات کا رنگ روپ

جسم سے مہنٹیمی توانائی کا اخراج شدت جذبات کے عالم میں بھی ہوتا ہے۔ یہ رنگ برنگ شعاعیں ہوتی ہیں۔ ہر جذبے کے ساتھ ایک خاص رنگ روپ مخصوص ہے آپ نے کسی کو خطاب کے عالم میں دیکھا ہوگا اور وفور حیا سے چہرے پر سرخی بھی دوڑتے دیکھی ہوگی۔ خوف کے عالم میں پیلا پڑ جانا، حسرت و مایوسی میں منہ کا فٹ ہو جانا، کثرت غم سے سفید ہو جانا، یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب جذبات کے رنگ و روپ ہیں۔ پھر جذبات کی شدت میں یہی نہیں ہوتا کہ چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے ایک رنگ جا رہا ہے بلکہ اور بھی بہت سی جسمانی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کبھی جسم کھینچ جاتا ہے، کبھی ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ کبھی ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں کبھی اکڑ جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جذبات کی اندرونی قوت پورے اعضاء عضلات اور اعصاب کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اسی کے ساتھ شدید جذباتی کیفیت کے زیر اثر انسان کی رگ رگ سے توانائی کا اخراج بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور ہمارا دوسرا نادیدہ جسم (جو ایٹمز اور انرجی کا بنا ہوا ہے) بھی انہی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے جو انسان کے گوشت پوست کے بدن میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے انسان کے اس دوسرے جسم (پیکر نور) کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے مادی جسم کی صحت و علامت اور جذباتی اتار چڑھاؤ اس کے اشیری (نورانی) جسم کی کیفیتوں کو تبدیل کر دیتا ہے۔

اس موقع پر یوگ کا ذکر ضروری ہے۔ ہٹ لوگ اور راجیہ یوگ کے تمام آسنوں اور مشقوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کی ریڑھ کی ہڈی کی جڑ میں روح حیات

(کنڈالنی شکلی یا سرینٹ پاور) جو عظیم طاقت و رنگ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی ہے، اس روح حیات کو جگایا جائے۔ انسان کی ریڑھ کی ہڈی اور حرام مغز کا حصہ جذبات، جبلت اور لاشعور کی حیرت انگیز قوتوں کا خزانہ ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی قنی میں بہت سے چکر (اعصابی گچھے) پائے جاتے ہیں۔ ان چکروں میں روح حیات مسلسل گردش کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس روح حیات کا بہت بڑا حصہ پشت کے نچلے حصے میں محفوظ اور غیر مستعمل حالات میں پایا جاتا ہے۔ راجیہ یوگا اور مابعدالطبیات وغیرہ کے نظریے کے مطابق اگر ہم ارتکاز توجہ، مراقبہ، ریاضیت اور سانس کی مشقوں (پرانایام) کے ذریعے اپنی روح حیات (کنڈالنی شکلی) کو جگالیں تو اپنے نورانی جسم، نادیہ پیکر کو شعوری طور پر تابع فرمان بنا سکتے ہیں۔ بعض لوگ یوگ کی ایک خاص مشق کیا کرتے ہیں طریقہ یہ ہے کہ سورج نکلنے وقت آپ کسی میدان میں جا کھڑے ہوں اور نکلنے ہوئے سورج کی روشنی میں اپنے سائے پر نظر جمادیں۔ چند منٹ کے بعد نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھیں تو کچھ دن کی مشق کے بعد فضا میں اپنی چھائیں نظر آئے گی۔ آپ اس سے گفتگو بھی کر سکتے ہیں اور کام بھی لے سکتے ہیں۔ ان سطوح کی تحریر کے وقت بعض طبی رسائل میں دو حیرت انگیز واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان واقعات سے انسان کے اشیری وجود پر شاید کچھ روشنی پڑ سکے۔ ایک شخص دانت اکھڑانے کے لئے دندان ساز کے ٹھیک پر گیا۔ دندان ساز نے دانت اکھاڑنے سے قبل مریض کو بے ہوش کر دیا۔ اس بے ہوش کئے جانے والے شخص کا بیان ہے کہ جو نبی بے ہوشی کا ٹکڑہ سگھایا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے جسم سے باہر نکل رہا ہوں، عجیب بات یہ ہے کہ میں اپنے جسم سے باہر تھا۔ اور میرا جسم میرے سامنے دندان ساز کی میز پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دندان ساز اور اس کا مددگار ایک ایک کر کے میرے دانت اکھڑ رہے ہیں یکا یک میں نے اپنے کو پھر اپنے جسم میں پایا اور میں پھر بدستور میز پر لیٹا ہوا تھا۔ دوسرا واقعہ ایک ایسے ہوائی جہاز کے مسافر کے ساتھ پیش آیا جو عالم پرواز حادثے کی زد میں آگیا تھا اُس مسافر نے ہوش میں آنے کے بعد بیان کیا کہ دفعتاً ہوائی جہاز کے انجن میں آگ لگ گئی اور ہم کئی

ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے گرنے لگے۔ یہاں تک تو مجھے یاد ہے پھر بے خبری کا ایک مرحلہ آیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جاہ شدہ ہوائی جہاز زمین پر پڑا دھڑا دھڑا چل رہا ہے۔ میں نے اپنے (گوشت پوست کے) جسم کو لمبے میں دبا پڑا پایا۔ میں نے چیخا شروع کیا کہ میرے جسم کو لمبے سے نکالو، شعلوں سے بچاؤ، ورنہ وہ ہوائی جہاز کے ساتھ چل جائے گا۔ مگر آہ کوئی شخص میری چیخ و پکار کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ بارے چشم زدن میں یہ منظر اوجھل ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے خاکی جسم کے اندر زندہ اور صحیح سلامت موجود ہوں۔ اتنی دیر میں امدادی کارکنوں نے ہوائی جہاز کی آگ بجھا دی، ہوش میں آنے کے بعد اس شخص نے کہا کہ اب میں موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ موت کی ہولناک وادی سے بعالم ہوش وحواس گزر چکا ہوں۔

میرے دوستوں میں بہت سے حضرات کو جسم سے علیحدگی کے تجربے ہوئے ہیں اور میں نے اپنے مضامین میں متعدد بار ان تجربات کا ذکر کیا ہے۔ گزشتہ چند سال سے میری تحقیق و تلاش کا واحد نقطہ ہی اسی قسم کے خارق العادت (سپر نیچرل) واقعات رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ مجھے ان پر اسرار واقعات سے انکار بلکہ تجربات کی بناء پر یہ اصرار بھی ہے کہ جسم فوری اور جسم مادی کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ روح جب ایک مرتبہ جسم سے نکل جاتی ہے تو پھر واپس نہیں آتی۔ الا یہ کہ اس کی واپسی کے لئے بطور خاص فرمان قدرت صادر ہو۔ البتہ اشیری جسم اور خاکی جسم کے درمیان رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد اکثر دوبارہ قائم ہو جاتا ہے۔ خواب کی حالت میں اشیری جسم کو مادی جسم سے جوڑنے والا دھاگہ کسی قدر ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور انسان کے بیدار ہوتے ہی پھر اس دھاگے کی ڈوریوں کس دی جاتی ہیں۔ آپ نے کراچی کی بعض گدھا گاڑیوں میں گدھے کے ساتھ ایک مٹ بھی جتی دیکھی ہوگی۔ یہ مٹ ایک ناکارہ مرل سا گدھا ہوتا ہے۔ جسے اصل مٹنی، بارکش گدھے کے ساتھ گاڑی میں جوت دیتے ہیں۔ اسی طرح حقیقی انسانی وجود کے ساتھ مٹ بھی لگی رہتی ہے، آپ فیصلہ کریں یہ مٹ کون ہے، انسان کا خاکی وجود یا نورانی وجود؟

متبادل طرزِ تنفس

ابھی ابھی سانس کی مشقوں (پرائیام) کے اثرات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ راجیہ یوگا کے طالب علم ان مشقوں پر عمل کر کے اپنے نفس اور جسم کی حیرت انگیز قوتوں کو جگا لینے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں متبادل طرزِ تنفس کی مشق غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ متبادل طرزِ تنفس (کی مشق) کا مقصد یہ ہے کہ قوت کو قوت سے جگایا جائے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اینم کے ذرے کو توڑ کر اس کی بے چارہ قوت کو آزاد کرنے کے لئے حرارت اور حرکت کی کتنی بڑی مقدار کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر اینم کی نیوکلیئر طاقت اینم کے خول سے آزاد ہوتی ہے۔ یوگ کی کنڈالنی شکتی یا روح حیات بھی جوہری طاقت کا عظیم الشان مخزن بلکہ مدفن ہے۔ اینم مرکز کے کوشکاف اور شق کر سنے کے لئے ضروری ہے کہ حرارت، حیات اور حرکت کی عظیم الشان قوتیں باہر سے درآمد کی جائیں۔ جسم انسانی میں حیات و حرارت کی درآمد کا واحد ذریعہ سانس ہے۔ ہر سانس کے ذریعہ ہم کائنات کی زندگی بخش انرجی کی ایک خاصی مقدار اپنے سینے میں داخل کرتے ہیں جو جسم و جاں کو نئی زندگی، نئی تازگی اور نئی شگفتگی اور نئی روشنی سے لبریز کر دیتی ہے۔ ہر جاندار سانس پر زندہ ہے (جب تک سانس ہے تب تک آس ہے) لیکن سانس لینے کا طریقہ بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ سانس جس قدر گہرا ہوگا اسے جتنی دیر تک سینے کے اندر روکا جائے گا، کائنات کی طاقت اتنی ہی بڑی مقدار میں ہمارے خون میں جذب ہو کر حرارت اور توانائی پیدا کرے گی۔ تمام ورزشوں اور تمام کھیلوں اور تمام جسمانی ریاضتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کی استعدادِ تنفس (سانس

لینے کی صلاحیت) کو بڑھایا جائے۔ یعنی وہ منظم، ہموار، باقاعدہ اور گہرا سانس لے کر غلاء میں پھیلی ہوئی زیادہ سے زیادہ کائناتی قوت کو جذب کر سکے۔ پاس انفاس، تنظیم انفاس اور جس دم اور دوسرے طریقے اپنی اپنی حد تک مفید اور مؤثر ضرور ہیں لیکن ہزاروں سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ راجیہ یوگا کے تجویز کردہ متبادل طرزِ تنفس کو تمام دوسرے طریقوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جو لوگ پابندی کے ساتھ متبادل طرزِ تنفس کی مشق پر عمل لے رہے ہیں ان کی آنکھوں کی چمک، بدن کا گلابی پن اور چہرے کا نکھار دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سانس کی مشق اور دوسری یہ مشقیں شباب آور بھی ہیں اور حیات بخش بھی، سانس کی مشقوں کے جسمانی، ذہنی اور روحانی اثرات ایک آدمی کے سینے میں نہیں سال دو سال میں ظاہر ہوتے ہیں بشرطیکہ پابندی کے ساتھ معلم اور استاد کی ہدایات اور مشق کے اصول کی پابندی کی جائے۔ یوگ کے تعلیم کردہ طریقے کے مطابق سانس کے ذریعے کائناتی توانائی (آکسیجن تو صرف اس توانائی کا ایک مظہر ہے) کی جوڑ و جسم میں داخل کرتے ہیں اس کی ضرب ہتھوڑے کی طرح موکر وہ قوت حیات یعنی کنڈالنی شکتی کے چکر چلا دیتی ہے۔ جب قوتوں تک سانس کی ضربیں وجود انسانی کی اس خوابیدہ ایسی قوت پر لگی جاتی ہیں تو وہ رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگتی ہے اور ریڑھ کی ہڈی کے مختلف مرکوزوں سے رگڑ کر دماغ کی طرف چڑھتی ہے۔ اس وقت ہم وہ قوت حاصل کر سکتے ہیں کہ اپنے اشیاء وجود یا نورانی ہالے کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں۔ کتاب کے ایک مستقل باب میں یوگ کی تنفسی ریاضتوں (پرائیام) کے بعض طریقوں اور مشقوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

دوسرے جسموں کی طرح انسانی جسم سے ریڈی ایشن یا تابکاری کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، عام برقیاتی اصول کے مطابق ہمارے جسم سے شعاعیں نکلتی ہیں ان میں سے بعض مثبت (پازیو) ہوتی ہیں بعض منفی (نیکو) انہیں شعاعوں کے میل اور بے میل (مناسب، عدم مناسب) ہونے کی بناء پر بعض لوگ پہلی ہی نظر میں دل کی طرف کھینچے جاتے ہیں اور بعض سے ملتے ہی اکٹھا ہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس کا سبب وہی ہے

جن شعاعوں کا طول موج باہم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں۔ جن کی فریکوئنسی میں اختلاف ہوتا ہے وہ ایک دوسرے کو دھکیلتی ہیں دفع کرتی ہیں۔ جہاں تک انسانی جسم کی تابکاری یعنی شعاعوں کے اخراج کا تعلق ہے تو بہت قریب ہے وہ وقت کہ سائنسی طور پر ان کی چھان بین کی جاسکے گی۔ آج بھی ”الیکٹران سی فیلو گراف“ اور ”اوی لاس کوپ“ جیسے نازک اور حساس آلات کے ذریعے دماغی لہروں کی پیمائش اور امراض دماغی کی تشخیص کی جاتی ہے۔ جوں جوں زیادہ مکمل اور نازک آلات ایجاد ہوتے چلے جائیں گے انسانی دماغ اور جسم کے انجان براعظم کے متعلق بیش از بیش معلومات کا حصول بہت آسان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں مابعدالطبیات کا نظریہ یہ ہے کہ حیات اور کائنات میں جو طاقت یا روح زندگی (پران) پھیلی ہوئی ہے، انسانی جسم میں ان کا مظہر ہے۔ سانس! کائنات کی روح حیات یعنی ان برقیاروں (الیکٹران) اور دوسرے جوہری اور تخت کو جوہری اجزاء (اٹامک پارٹیکلز) سے مرکب ہے۔ یہ ایٹمی اجزاء اپنی مخصوص حرکت اور رفتار کے سبب پانچ قسم کی لہروں میں تقسیم کئے گئے ہیں جن کو اشعری موجیں یا اشعری لہریں کہا جاتا ہے۔ ان اشعروں (اشعری موجوں) کا نام ”تت داس“ ہے انپند میں ان پانچ تت داس کو زندگی بخش ہواؤں سے تعبیر کیا ہے:

(1) آکاش یعنی آواز کی لہر

(2) وایا یعنی لمس کی لہر

(3) تیجا یعنی بصارت کی لہر

(4) آپاس ذائقے کی لہر

(5) پرتھوی، شامے کی لہر۔

آکاش (موج صدا) کی اصل اشعری ہے۔ اس کا رنگ سفید اور گہرا نیلا ہے۔ وایا کی اصل ہوا ہے جس کی رنگت میں سبزی اور نیلا رنگ پایا جاتا ہے۔ تیجا (بصارت) کی اصل آگ ہے اور رنگ سرخ۔ آپاس (ذائقہ) کی اصل ہے پانی اور اس کا رنگ سفید ”بخشی“۔ پرتھوی کی اصل خاک ہے اور اس کا رنگ زرد مانا گیا ہے۔ یوگ میں وہ

طریقے بتائے گئے ہیں جن پر عمل کر کے روح کائنات (پران) کے پانچ اشعروں یا حیات افزا لہروں پر تصرف اور کنٹرول حاصل کیا جاتا ہے۔ سانس کی مشق سے انسانی جسم سے نکلنے والی شعاعوں کی رفتار بڑھ جاتی ہے ان شعاعوں کا رنگ سفید گہرا نیلا، نیلا سبز، سرخ، سفید، بخشی اور زرد ہے۔ یاد رکھئے کہ انسانی جذبات کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔

خاکسار کی غزل کا مطلع ہے:

دھل گئی ہستی دل یوں تری رعنائی میں

مادہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

مطلع سن چکے اب غزل چھوڑ کر نثری غزل سنئے۔ عرض یہ ہے کہ میٹر اور انرجی یا مادہ اور توانائی کائنات کے دو جڑواں بچے ہیں۔ دونوں ایک بچہ جس پر دو چہرے بڑے ہوئے ہیں۔ وجود کا ٹھوس روپ مادہ ہے اور لطیف شکل توانائی۔ وجود کی کثیف شکل جسم ہے اور لطیف روپ ”جان“۔ ہمارے جسم میں زندگی کی انرجی اسی طرح دوڑتی ہے جس طرح تانبے کے تار میں بجلی کی توجہ کے اندر طاقت کے کئی گنا پاور انجیشن یا بجلی کھرواؤں ہیں۔ ان جسمانی بجلی کھروں میں اہم سے کئی گنا طاقت مرکوز اور مغلج ہے۔ ہمارے بدن میں جہاں جہاں اعصابی گچھے پائے جاتے ہیں وہیں وہیں طاقت کے اندرونی جوالا کھی چھپے ہوئے ہیں۔ ان اعصابی گچھوں میں ریزہ کی ہڈی کی نالی، دماغ کا پچھلا حصہ، دماغ کا بالائی حصہ، معدے کی تہہ کا اعصابی گچھا (سولر پلکس) نیز قلب او رزیر ناف کے غدد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ارتکاز توجہ یعنی کسی ایک نقطے کو جھپکائے بغیر مسلسل تکتے رہنا اور دل و دماغ اور توجہ کی ساری طاقت اسی ایک نقطے پر مبذول اور مرکوز کر دینا۔ اس حد تک کہ انسان گرد و پیش سے بالکل غافل ہو کر اسی ایک نقطے میں ڈوب جائے۔ استغراق (کسی چیز کے مشاہدے یا کسی تصویر کی گہرائی میں ڈوب جانا) اور سانس کی مشقوں سے جسم کے ان سولر پلکسوں یا اعصابی گچھوں کی طاقت کو چگایا جاسکتا ہے، تصوف کی زبان میں انہیں لطائف کہا جاتا ہے۔ مثلاً لطیفہ قلب، لطیفہ روح وغیرہ۔

گلستان کا آغاز

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اپنی نادر روزگار کتاب ”گلستان“ کا آغاز ایک ایسے فقرے سے کیا ہے کہ صدیوں سے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ فقرہ یہ ہے:

”ہر نفسی کہ فرومی زودمد حیات است و چوں برآید مفرج ذات“

ترجمہ: اس کا یہ ہوا کہ ہر سانس جو اندر جاتا ہے، زندگی کا سہارا ہے اور جب باہر آتا ہے تو ذات کو فرحت بخشتا ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر فقرہ حکمت و اخلاق کی ہزار کتابوں پر بھاری ہوتا ہے۔ ان چند لفظوں میں بزرگ تصوف، فہم الہی اور حیاتیات کے بھاری بھر کم علوم و فنون کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ سانس کا تسلسلہ، اندر اور دھڑلے کا جسم کی پوری مشینری چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ بچے ماں کے پیٹ میں ہی سانس لینا شروع کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ دم ”واپسین“ تک جاری رہتا ہے۔ دنیا کی ہر زندہ مخلوق سانس لیتی ہے اور ہر سانس میں زندگی اور توانائی کے عظیم ذخیرے اپنے اندر انڈیل لیتی ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار بھی اسی ہوا پر ہے جو ہم سانس کے ذریعے اندر کھینچتے ہیں اور خلق کے راستے باہر نکال دیتے ہیں سانس کی باقاعدہ ریاضیت کرنے والے ناک کے راستے کو سانس کی قدرتی گزرگاہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ منہ سے سانس لینا غیر قدرتی اور غیر فطری طریقہ ہے۔ ناک کے داہنے نٹھنے والے سانس کو مثبت (سولر کرنٹ یا مثبتی لہر) اور بائیں نٹھنے والے سانس کو منفی (لیونز کرنٹ یا قمری لہر) کہا جاتا ہے، ہر سانس کے ساتھ طاقت کے کروڑوں ایٹم ہمارے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ہر اخراج کے ساتھ

کاربن ڈائی آکسائیڈ (ڈخان، زہریلی ہوا) کی بڑی مقدار اپنے اندر سے خارج کر دیتے ہیں۔ یوگ نے ناک کے ذریعے ہی سانس لینے کی تاکید کی ہے کیونکہ سانس کا اصل راستہ یہی ہے۔

اس سوال نے انسان کو ابھی تک اس کشمکش میں جتا کر رکھا ہے اور تمام علمی ذرائع اس کے جواب کی کھوج میں ہیں کہ جسم کی فنا صرف جسم کی فنا ہے پورے انسان کی فنا پوری انسانی شخصیت کی موت؟ مابعدالطبیات کا فن، اس سوال کا جواب تحقیقات و ہدیدہ کی روشنی میں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مابعدالطبیات (پیراسائیکالوجی) کوئی الہامی مذہب نہیں نہ یہ کوئی روحانی عقیدہ ہے۔ درحقیقت یہ ایک علمی تحقیقی اور اخلاقی نظریہ حیات ہے فن مابعدالطبیات کوئی نیا دھومئی نہیں کرتا، پرانے دھوؤں کے کچھ نئے ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔

میں نے ایک ٹکڑی کو آگ دی ٹکڑی سے پہلے دھواں نکلا۔ پھر آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ شعلوں سے آگ پیدا ہوئی آگ سے فضا گرم ہوگئی۔ اب نہ ٹکڑی کا وجود باقی ہے نہ دھوئیں کا، نہ شعلے کا نہ آگ کا، صرف گرمی کا احساس ہے اور گرمی فضا میں موجود ہے۔ آپ نے دیکھا ایک مادی جسم کتنی تبدیلیوں سے گزرا اور کس طرح لطیف تر ہوتا چلا گیا۔

انسانی جسم کا حال بھی یہی ہے جو حضرات ادارہ من عرف نفسہ کی زیر نگرانی ارتکاز توجہ و استغراق کی مشقیں (مثلاً البصیر، التخیل، التخیل، عکس بنی، سایہ بنی اور شمع بنی وغیرہ) کرتے ہیں یا کرتے رہے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ توجہ کی بھرپور مرکزیت اور استغراق کی شدت میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے وہ اپنے جسم سے باہر دیکھتے ہیں یہ نادر تجربہ روزانہ نہیں ظہور پذیر ہوتا۔ تاہم استغراق کی مشق کرنے والے بعض حضرات کو گاہے گاہے یا پے درپے یہ تجربہ ہوتا ہے جسم سے علیحدگی کے احساس کا یہ واقعہ ایک اہم اور انقلابی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اس علم میں ہم جسم کو اپنے مادی جسم سے الگ دیکھتے ہیں (یعنی جسم نور) وہ سات رنگوں اور بہت تیز رفتار چکروں کا مجموعہ ہوتا ہے اس کو مادی

جسم پر وہی فوقیت حاصل ہوتی ہے جو شعلے کو ککڑی پر! یہ جسم ایک نورانی غلاف یا خول کی طرح مادی جسم سے اٹھارہ انچ کے فاصلے پر (بعض کے مشاہدے کے مطابق چند فٹ) ہمیں ڈھانپے رکھتا ہے اور ایک چمکیلے دھاگے کے ذریعے جو برقیاتی ایٹموں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے مختلف جوڑوں کا سر سے بندھا رہتا ہے، جسمانی موت کا عمل یہ ہے کہ مادی جسم اور اشیری یا نورانی جسم (اسٹیرل باڈی) مربوط کرنے والے دھاگے (رشتہ حیات) کو قطع کر دے۔

مشق، ریاضیت، مشاہدے اور بعض دوسرے پراسرار طریقوں پر عمل کر کے اکثر انسان یہ قوت حاصل کر لیتے ہیں کہ مادی جسم کی طرح اس نورانی جسم کو بھی مسخر کر لیں۔ یہ دونوں جسم انسانی انا کے آئینہ کار ہیں، انسانی اظہار بیکر خاک میں ہوتا ہے جسے انا اس کرۂ ارض کی حیات چند روزہ میں لادے لادے پھرتی ہے اور جب اس مادی جسم میں مزید سکت باقی نہیں رہتی تو وہ اس مٹی کے ڈھیر (مردہ انسان) کو مٹی کے غار (قبر) میں پھینک دیتی ہے اور اپنے نورانی جسم میں جو مادے کی لطیف ترین شکل ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ کچھ مدت بعد یہ لطیف ترین جسم بھی انا انسان (انسان کی حقیقی شخصیت یا روح سے مراد ہے) کے بوجھ سے چکنا چور ہو جاتا ہے اس نورانی کائنات (عالم یا برزخ) سے گزر کر ایک اور عالم میں جسے افلاطون عالم مثال و اعیان کہتا ہے قدم رکھتی ہے انسانی انا کی ترقی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ جزو اپنے گل میں غرق نہ ہو جائے۔

میں زماں تھا زماں میں غرق ہوا

میں مکاں تھا مکاں میں ڈوب گیا

صرف گوشت پوست کا پروٹینی یا لحمیاتی جسم ہی نہیں بلکہ انسان کا اشیری اور نورانی وجود بھی، جذبات، عادات، طرز فکر، سیرت و کردار اور اندازِ نظر کے لحاظ سے بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اس کا مادی جسم اور مادی جسم کا حسی شعور! فرض کیجئے کہ ایک شخص بلا کا شراب خور اور پرلے سرے کا عیاش ہے۔ جسمانی موت کے وارد ہو جانے یا

لحمیاتی اور پروٹینی بدن کے خاتمے کے بعد اس کی جبلت کے تقاضے وہی رہیں گے جن کا وہ مادی زندگی میں عادی تھا۔ جسمانی زندگی میں انسانی جبلت کے وہی تقاضے پورے کرنے کے لئے (اعصابی، جسمانی) پورا نظام موجود تھا۔ مرگ بدن یا اس جسمانی مشینری سے محروم ہو جانے کے بعد انسانی جبلت تسکین اور خواہش کے ان مادی ذرائع یعنی حواس خمسہ کی کارکردگی سے محروم ہو جاتی اور شدید جہنمی کرب محسوس کرتی ہے۔ لیکن اگر جسمانی زندگی میں اس کرۂ ارض پر انسان نے دونوں نعتوں کے منفی اور مثبت سانس کے اثرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے متبادل طرزِ تفسیر کی سفارش کی ہے۔ سانس کی اس مشق اور مشقوں کے نتیجے میں آپ آہستہ آہستہ اندر سے جاگ اٹھیں گے اور جسم کے تمام پاور ہاؤس پوری رفتار سے کام شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ آپ کا جسم ٹھوس قودۂ خاک کے بجائے ایک ایسے برقی مقناطیسی جسم میں تبدیل ہو جائے گا۔ جس سے طاقت و شعاعیں نکل نکل کر سارے ماحول کو جگمگا دیں گی۔ اگر متبادل سانس کی مشق برابر جاری رہے تو آخر کار انسانی جسم کے غلیات (ایٹموں) سے جوہری طاقت کا اخراج شروع ہو جاتا ہے۔ یہ طاقت رنگ برنگی شعاعوں کی شکل میں نکلتی ہے۔ یہ طاقت جتنی زیادہ ہوگی انسان کی شخصیت میں اتنی ہی کشش، اثر انگیزی اور اثر اندازی پائی جائے گی۔ میں ڈاکٹر کلر کی کتاب ”فضائے انسانی“ (ہیومن ایٹ ماسفیر) کا حوالہ دے چکا ہوں۔ ڈاکٹر پروفیسر کلر نے اپنی کتاب میں ان مثبت اور منفی شعاعوں کا ذکر کیا ہے جو انسانی جسم سے مسلسل بہتی رہتی ہیں اگر اب تک ایک سرے کی پلیٹ اور لیبارٹری کے ٹیسٹ ٹیوب میں ان شعاعوں کو ریکارڈ نہیں کیا جاسکا تو عنقریب کر لیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند سال میں انسانی جذبات، تصورات اور احساسات کے شعاع پیدا آلات ایجاد ہو جائیں گے اور ہمیں یہ دیکھ کر کتنی حیرت ہوگی کہ محبت اور نفرت کے جذبات کی لہریں بھی انسانی اعصاب سے خارج ہوتی ہیں۔ محبت اور نفرت کی شعاعیں اتنی ہی بڑی سائنسی حقیقت رکھتی ہیں جتنی دماغ کی برقی لہریں! جن سے آج کل نفسیاتی اور دماغی امراض کے بیماروں کی تشفی حالات میں مدد لی جاتی ہے۔ جس طرح دماغ کی برقی لہروں

کا پتہ چلا لیا گیا ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ محبت اور نفرت کی شعاعوں کے طول موج، رفتار اور دائرہ حرکت کو بھی معلوم کر لیا جائے گا۔ فی الحال جو حقیقت سائنسی تجربہ گاہوں میں آلات کی مدد سے معلوم نہیں کی جاسکتی وہ سانس کی مشقوں نیز دوسری ذہنی اور دماغی ریاضتوں کے ذریعے صرف دریافت ہی نہیں کی بلکہ محسوس کی جاسکتی اور بروئے کار لائی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

دیدہ و نادیدہ

انسان کی سب سے بڑی خواہش یا تمنا کون سی ہے جو ماں کی گود سے آغوشِ مرگ تک اس کے ذہن پر مسلط رہتی ہے؟ یہاں دم بھر کو ٹھہر جائیے اور اس سوال کا جواب سوچئے۔ ہاں! تو زندگی میں ہر انسان کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا ایک ہی ہوتی ہے۔ جس سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوتا، نہیں ہو سکتا، زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے خود زندہ رہنے اور زندگی کو برقرار رکھنے کی خواہش! موت اس خواہش و تمنا کا گلا حنوت دیتی ہے۔ انسانی ذہن موت کی اس قاتلانہ بے رحمی کے خلاف ہمیشہ جدوجہد اور احتجاج کرتا ہے اور جدوجہد اور احتجاج اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کائنات میں زندگی موجود ہے۔ حیات بعد المات یا جسم کی فنا کے بعد روح کی بقا کا عقیدہ، زندگی کی اسی خواہش اور زندہ رہنے کے اسی جلی تقاضے سے جنم لیتا ہے روح کیا ہے؟ ہمیں روح کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، ہم صرف انسان کی جسمانی مشین کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ لیکن آج بھی گوشت پوست کی بنی اس مشین کے گھل پرزوں کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ انسانی قوتوں کی حد اور انتہا کیا ہے۔ فی الحال سائنس داں اس تھقی کو سلجھانے سے قاصر ہیں۔ کیا جسم کے فنا ہونے یا انسان پر موت وارد ہونے کے بعد انسانی شخصیت کا کوئی حصہ دست بردا بجل سے بچ جاتا ہے؟ یہ مسئلہ ہمیشہ عملی تحقیق کا موضوع رہا ہے، آج بھی ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اُس کی تعلیمات واضح ہیں اور دنیا کے کروڑوں انسان اُن سے ہدایت، تقویت اور روشنی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن حیات بعد الموت (مرنے کے بعد زندگی) مسئلے کا ایک رُخ علمی اور سائنسی بھی ہے۔ اس رُخ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا انسان روح کی تسکین کی

طرح جس کا سرچشمہ مذہب ہے شعور و عقل کی تسکین بھی چاہتا ہے اور علمی طور پر اس کا سوال یہ ہے اپنی نفسی اخلاقی اور روحی تربیت مکمل کر لی ہے۔ اپنے حیوان پر قابو پایا اور اناء کے لطیف ترین جوہروں اور حسین ترین پہلوؤں کو سجا نکھار لیا ہے تو حیات بعد الممات کی زندگی کو بہشتی زندگی تصور کرے گا۔ میں نے قصداً بحث میں روح کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اناء کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ سبب یہ ہے کہ روح کے متعلق واضح طور سے ارشاد قرآنی موجود ہے ”تم سے روح کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔“

اس واضح آیت قرآنی کی روشنی میں روح کی تحقیق اور تلاش و جستجو ہمارے دائرہ عمل سے خارج ہو جاتی ہے۔ ہم روح کے مختلف مدارج کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہاں مادی جسم کی مختلف حالتوں سے بحث کر سکتے ہیں۔ طب قدیم کے نقطہ نظر سے روح کے تین درجے ہیں، روح نفسانی، جس کا مرکز دماغ ہے۔ روح طبعی جس کا مرکز قلب ہے اور روح حیوانی جس کا مرکز جگر ہے اور روح انسانی؟ طب کے پاس اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں۔ کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ عرض کر چکا ہوں کہ مادے کی تین چھپائی حالتوں (ٹھوس، سیال، گیس) کے علاوہ مادے کی ایک اور حالت اور اس کا ایک اور درجہ بھی ہے، جیسے ”پلازمائی درجہ“ کہتے ہیں۔ جب مادہ تینوں حالتوں سے گزر کر پلازمائی درجے میں پہنچتا ہے تو ایٹم کے تمام الیکٹران، نیوٹران وغیرہ ٹوٹ کر مخلوط شکل اختیار کر لیتے ہیں مادے کی اس انتہائی لطیف حالت کی تصویر کشی ایک خاص کیمرے کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اس خاص کیمرے کے ذریعے آپ ایسی اشیاء کی تصویر لے سکتے ہیں جو اس وقت نظر نہیں آتیں مگر موجود ہوتی ہیں (میں نے یہ تصاویر خود دیکھی ہیں) مثلاً میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں اس سے اٹھ جاتا ہوں۔ میرے اٹھتے ہی کرسی کی تصویر لے لی جاتی ہے۔ فوٹو پلیٹ پر نہ صرف کرسی کی تصویر آ جاتی ہے بلکہ حیرت یہ ہے کہ میں بھی (جو کرسی سے اٹھ چکا ہے) تصویر میں موجود ہوں۔ حالانکہ کرسی کی تصویر لیتے وقت میرا جسم کرسی پر موجود نہ تھا۔ اس سے کیا نتیجہ نکلا؟ یہ کہ میں جس چیز سے مس ہو جاتا ہوں وہاں

اپنے مادی جسم کا لطیف ترین نمونہ (جو خالی آنکھ سے نظر نہیں آتا) چھوڑ جاتا ہوں جو ہو بہو ویسا ہی ہوتا ہے جیسا میں، وہی شکل، وہی لباس، وہی انداز! انسان کا نورانی جسم اسی طرح (یعنی پلازمائی جسم کی طرح) ایک جسم ہے جو ظاہری آنکھوں کے لئے نادیدہ سہی مگر بعض خاص ذرائع استعمال کر کے ہم اس نادیدہ انسان کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو دیدہ کے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ نادیدہ انسان کی دید کے خاص ذرائع مشین بھی فراہم کر سکتی ہے اور ذہن بھی! الٹرا وائیٹ ریڈ یا انفراریڈ (بالائے بنفشی اور پائیں سرخ) شعاعیں مادے کی ایک ایسی حالت کی تصویر کشی کر سکتی ہیں۔ جنہیں ہم ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے البتہ تیسری آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ انسانی جسم میں تیسری آنکھ کہاں واقع ہے؟ میں عرض کروں گا ”دماغ“ میں! فعلیات اور علم تشریح الاعضاء کی اصطلاح میں جس غدود کو ”غده صنوبری“ یا ”پی نیل گینڈہ“ کہا جاتا ہے۔ اسے علوم مخفی (آکلف سائنسز) کے علماء اور مابعد النفسیات والے تیسری آنکھ کہتے ہیں۔ آپ حیاتیات، فعلیات (فزیا لوجی) اور انا لوجی (تشریح الاعضاء) کی کوئی کتاب اٹھا لیجئے، غده صنوبری کے بارے میں پڑھیں۔ صرف یہ لکھا ہوگا کہ پی نیل گینڈہ خون میں ایسی رطوبتیں (ہارمونز) شامل کرتا ہے جو بدن کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ جنسی غدود کی پرورش کے لئے ضروری ہیں لیکن اس غدود کا حقیقی وظیفہ (فکشن) کیا ہے کچھ نہیں معلوم۔ اب حیاتیات (بیالوجی) سے مشورہ کیجئے۔ بیالوجی بتائے گی کہ یہ غالباً انسان کی تیسری آنکھ تھی جو عضویاتی اور جسمانی ارتقاء کی طویل منزلوں میں اپنی حیاتیاتی افادیت پوری کر کے سکڑ گئی۔ مابعد النفسیات میں مختلف مشقوں (مثلاً البصیر اور التحلی) کے ذریعے اس تیسری آنکھ کو جگایا جاتا ہے تاکہ انسان کو وہ دیدہ باطن حاصل ہو سکے جو صرف چند گز کے فاصلے تک نہیں، بلکہ چاند کے غاروں اور مریخ کے پہاڑوں تک کو ریڈیائی ٹیلی اسکوپ (دور بین) کے بغیر دیکھ سکتا ہے۔ غده صنوبری کی بصارت و بصیرت کی بیداری کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ارتکاز توجہ کی مشقیں کی جائیں۔

یہ کیا تضادِ بشر

انسان مجموعہ تضادات ہے۔ آگ اور پانی کا مجموعہ، ہوا اور خاک کا مجموعہ، اندھیرے اُجالے کا بیکر، فرشتہ اور شیطان کا مرکب۔ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات اور موجودات ہیں یک سستی واقع ہوئی ہیں۔ صرف ایک ہی سست میں پیش قدمی کر سکتی ہیں۔ چوٹی سے لے کر فرشتے تک جتنے زندہ موجودات پائے جاتے ہیں، انہیں ایک طرح کی خود کار مشین کہا جاسکتا ہے۔ ہر مشین کے وظائف عمل پہلے سے معین ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں کوئی مشین ان وظائف عمل سے انحراف کر سکے۔ روئے زمین پر چوٹی کا کوئی وظیفہ (FUNCTION) مقرر کر دیا گیا ہے وہ اسے بجالائے گی۔ کیونکہ اس کی جلی ساخت اور قدرتی بنیاد کا تقاضا ہی یہ ہے اور فرشتہ عرش میں پر جس خدمت کی بجا آوری پر مامور کئے گئے ہیں وہ اس کی تعمیل کریں گے کیونکہ انہیں انحراف عمل اور آزادانہ پیش قدمی کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ لیکن یہ مجموعہ تضادات انسان ایک شش جہاتی اور ہمہ سستی مخلوق واقع ہوا ہے۔ بے شک ہم بھی بہت حد تک جبلی قوانین اور قدرتی تقاضوں کی زنجیر میں اسیر ہیں۔ لیکن اس پاب زنجیری اور اسیری کے باوجود ہمارے اندر ایک تقاضا بھی کارفرما ہے جو زنجیر کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہے۔ انسان اپنی صبح وجود کے پہلے لمحے سے اب تک فطرت کے خلاف برسرِ جنگ رہا ہے۔ حیوان اور فرشتے تو اس ہولناک جنگ کا تصور نہیں کر سکتے جو اس مشتِ خاکی نے عناصر کائنات کے خلاف چھیڑ رکھی ہے اور مسلسل ناکامیوں اور پے در پے شکستوں کے باوجود ثباتِ قدم اور استقلال کے ساتھ اس ہولناک معرکہ آرائی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ پسپا ہونے کا نام تک نہیں لیتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ

فطرت کی عظیم الشان قوتیں رفتہ رفتہ انسان کے سامنے پرامناختہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

اے نوعِ بشر! اپنی تقدیر کو پورا کر

مجبوری و مختاری، نادانی و دانائی!

انسان کی یہی مجبوری و مختاری اور یہی نادانی، قدرت کو زیادہ محبوب ہے۔ اگر انسان کو کائنات کا مالک و مختار کہا جاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ عقل کل کا خیر محض کا اور قدرت مطلق کا وارث ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت انسان کی کوشش جہاتی اور ہمہ سستی نوعیت یعنی عقل و جذبات کا استخراج، خیر اور شر کی ملاوٹ اور جبر و اختیار کی ہم آمیزی ہی اسے اشرفِ خلق کے درجہ اعلیٰ کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ بلاشبہ بشر کا یہ تضاد اور بشریت کے یہ تضادات، حیات اور کائنات کا سب سے بڑا عجوبہ ہیں۔

عجب تضادِ بشر ہے، خوشا تضادِ بشر

کہ اک بدیعہ تخلیق کائنات مگر

یہ کیا کہ پردہ درغیب جس کا ذوق شہود

تجسس کے پس دیوار بھی نہ اس کی نظر

یہ کیا کہ منزلِ الہام جس کا قلب سلیم

وہ اپنے نقشِ کف پا کی پاسکے نہ خبر

یہ کیا کہ عالمِ ارواح جس کی جولانگاہ

خود اپنے کشتہ تن میں نہ کر سکے وہ گزر

یہ کیا کہ لشکرِ اجسام کا جو میرِ سپاہ

خود اپنے جسم کے زنداں میں ڈال دے وہ پیر

یہ کیا تضادِ بشر

یہ کیا تضادِ بشر

یہ کیا تضادِ بشر

اگر آپ کسی ماہر طبیعیات سے جا کر پوچھیں کہ انسان کیا ہے؟ تو وہ نہایت سچائی اور سادگی کے ساتھ اس معجون مرکب (مجموعہ تضادات) کے نسخے کے حسب ذیل اجزاء بتا دے گا (انسان بنانے کا نسخہ ملاحظہ ہو):

اوسط درجے کی ساخت کے انسانی جسم میں دس گیلن پانی ہوتا ہے۔

اتنی چربی کہ صابن کی نو ٹکیاں بنائی جاسکتی ہیں۔

اتنا قاسنورس کہ بائیس سو دیا سلائیوں کے لئے کافی۔

دو انچ لمبی کیل بنانے کے بقدر لوہا۔

1/4 پونڈ گندھک

اتنا چونا کہ گز بھر دیوار کو پوتا جاسکے۔

بچیس ارب سرخ ذرات خون۔ جنہیں ہموار سطح پر پھیلا یا جائے تو تین ہزار

تین سو مربع گز جگہ گھیریں۔

70 سال کی عمر تک قلب تقریباً تین ارب مرتبہ دھڑکتا ہے اور 27 کروڑ

پوائنٹ خون مائیکرو سسٹم سے گزر جاتا ہے۔

انسانی جسم میں اتنی بجلی ہوتی ہے کہ 25 واٹ کے برقی بلب کو کئی منٹ تک

روشن رکھ سکے۔

ہمارا جسم ہر 60 منٹ اتنی حرارت خارج کرتا ہے کہ اس سے نصف گیلن پانی

کو ابلا جاسکتا ہے۔

جسم ہر منٹ میں 410 مکعب انچ ہوا پیپھروں میں کھینچتا ہے۔

اگر 70 سال اوسط عمر مقرر کی جائے تو ہم ان 840 مہینوں میں پانچ ٹن غلہ

پانچ ٹن ترکاریاں اور تقریباً دو ٹن گوشت صفا چٹ کر جاتے ہیں۔ سیال غذاؤں (چائے،

کافی اور دوسرے مشروبات) کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔ یعنی کوئی بائیس ہزار گیلن

مشروبات! سگریٹ نوشی کی شرح سے کوئی اسی ہزار سگریٹ! ہزار حیف کہ عمر عزیز کے ایک

لاکھ 76 ہزار چار سو گھنٹے سونے میں ضائع ہو جاتے ہیں سوتے میں جسم میں پانچ اونس کے قریب پسینہ نکل جاتا ہے۔ رات بھر میں ہم کم و بیش سات ہزار مرتبہ سانس لیتے ہیں اور چوبیس گھنٹے میں چوبیس ہزار مرتبہ! الغرض یہ ہے کہ جسمانی مشین کی ساخت اور اس کی خصوصیات! تو کیا انسان صرف یہی ہے۔ صرف اسی حد تک ہے؟ کیا ہم صرف مجموعہ عناصر ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم نے ماہرین طبیعیات سے پوچھا تھا کہ انسان کیا ہے؟ ان کا جواب آپ نے سن لیا اب ہم حیاتیات اور نفسیات کے ماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے یہی سوال کرتے ہیں کہ انسان کیا ہے؟ ان دونوں

سائنسوں کے ماہرین جواب دیں گے کہ انسان کچھ بھی نہیں صرف جینس GENES اور

CHROMOSOMES کروموسوم کا مجموعہ اور مجسمہ ہے۔ کروموسوم اور جینس سے ہی

انسان کے اندر نسلی خصوصیات، وراثی کردار، رنگ، روپ اور خدو خال کا نقشہ پیدا ہوتا

ہے، چلنے یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔ اب ماہرین نفسیات سے رجوع کیجئے۔ تو وہ آدمی کے

موروثی جذبات، جبلت، رجحانات، مزاج، رویے، ذہنی، بھانڈ اور لاشعوری

COMPLEXES کے بارے میں ایک عالماد تقریباً بھانڈوں کے۔ یقیناً کہ اگر

آپ کیمیا، حیاتیات، نفسیات اور نفسیات کے سائنس دانوں کو ایک محفل میں جمع کریں

اور یہی سوال پیش کریں تو انسان کے بارے میں اتنی مختلف عالمانہ اور عامیانہ باتیں سننے

میں آئیں گی کہ دماغ میں بجز جہل اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ نصف صدی قبل انسان کو محض

ایک ترقی یافتہ مشین تصور کیا جاتا تھا۔ ایسی مشین جو اپنے کل پرزوں کی طاقت سے

خود بخود چلتی ہے اور جب کل پرزے گھس جاتے ہیں تو ٹھپ ہو جاتی ہے یہ تھا انسان کا

مشینی تصور، انسان کے بارے میں میکینکی نظریہ! اس نظریے کی زد سے انسان شعور،

صرف شعور ہی کیوں وجدان، ضمیر، تفکر اور ادراک و اشراق تک دماغی ظلمات کے مادی

عمل کا نتیجہ قرار پاتے ہیں یعنی جس طرح جگر سے صفرا پیدا ہوتا ہے اسی طرح دماغی

اعصاب سے شعور آگ آتا ہے جب یہ ظلمات ناکارہ ہو جاتے ہیں یعنی دماغ کی جسمانی

مشین کسی وجہ سے زنگ آلود ہو جاتی ہے تو شعور ختم ہو جاتا ہے جس طرح بلب کے فیوز ہو جانے سے برقی کرنٹ غائب ہو جائے اسی طرح شراب، بھگ، گانجا اور چرس کی کیفیت کے زیر اثر دماغ معطل ہو جاتا ہے شعور باقی نہیں رہتا۔ انسان گوشت پوست کی ایک خود کار مشین ہے اور شعور کا انحصار بہت حد تک دماغ کی صحت مند کارکردگی پر ہے۔ اس دعوے کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر یہ پوری سچائی نہیں ہے۔ آدمی سچائی ہے پوری سچائی یہ ہے کہ جس طرح جسم کی حالتیں انسانی شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی طرح شعور کی مختلف حالتیں بھی جسم سے مرکب ہیں۔ جسم میں کوئی حالت، خواہ اس کا تعلق صحت سے ہو یا علالت سے، ایسی نہیں جس کا تعلق ذہنی عمل سے نہ ہو ہر جسمانی بیماری کی تہہ میں ذہن کا ہاتھ کسی نہ کسی حد تک ضرور کارفرما نظر آئے گا، اس سے کیا نتیجہ نکلا یہ کہ ذہن جسم پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور جسم کا اثر بھی قبول کرتا ہے، لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس گفتگو کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ پچھلی صدی کی طبیعیات اور فعلیات (فزیا لوجی) میں ذہن (شعور) کو جسم کا شاخصانہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب تحقیق کا پیہ انہی طرف گھوم رہا ہے۔ یعنی یہ بات حوالہ سائنسی تجربات کی روشنی میں ثابت ہوتی چلی جا رہی ہے کہ ذہن جسم کا محکوم نہیں حاکم ہے۔ اور جسم کے تمام اعمال و حرکات کا آخری سرا شعور کے ہاتھ میں ہے۔

☆☆☆

ایک عجیب تجربہ

بہت مشہور واقعہ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا، خیر پھر سن لیجئے۔ فرانس میں سزائے موت کے ایک مجرم کو بتایا گیا کہ پھانسی کے بجائے اس کے بازو کی فصد کھول دی جائے گی اور وہ خون بہنے سے ہلاک ہو جائے گا۔ مجرم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے میز پر لٹا دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے اور ایک جراح (سرجن) نے جھوٹ موت اس کے بازو کی فصد کھولی اور نگلی کے ذریعے نیچے رکھے ہوئے طشت میں پانی پکایا جانے لگا۔ ٹپ ٹپ ٹپ! تاکہ مجرم کو یقین ہو جائے کہ فصد کے بعد اس کے بازو سے خون کی تلمی بہہ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری کارروائی فرضی تھی۔ بائیں ہمد محض فصد اور جریان خون کے تصور کے زیر اثر مجرم کے جسم میں اضطراب پیدا ہونے لگی اور چند منٹ بعد بے چارے کی موت واقع ہو گئی۔ حالانکہ اس کی فصد کھولی تھی اور نہ خون کا ایک قطرہ جسم سے باہر نکلا تھا یہ ایک طبی نفسیاتی تجربہ تھا تمام دنیائے طب و نفسیات میں اس تجربے کو (جسم پر ذہن کے اثرات) وہی اہمیت دی گئی جس کا یہ مستحق تھا اور ہے۔ اب اگر کسی کا ادعا اور اصرار یہ ہے کہ جسم ذہن پر حاکم ہے۔ ذہن کا محکوم نہیں تو اس ناواقف شخص کو کسی ایسے خطہ فرضی میں بھیج دینا چاہئے جہاں بیسویں صدی کے علم و فکر کی روشنی نہیں پہنچی اور انیسویں صدی کی طبیعیات، فعلیات اور حیاتیات پڑھائی جاتی ہے آج انسانی جسم کو جتنی سہولتیں اور آسائشیں میسر ہیں ایک صدی قبل کے لوگ ان کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ بائیں ہمد آج وہ جس عذاب میں مبتلا ہے، جس کرب و تشویش سے دوچار ہے جس پہچان اور اضطراب سے تپیدہ جاں ہے۔ انیسویں صدی کے لوگ اس کا اندازہ بھی نہیں

۱۔ اس کتاب میں ہر جگہ MIND کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

لگا سکتے جسم کی آرائش اور روح کا اضطراب! یہ ہے اس عہد کا الیہ۔ مگر ایسے الیہ کا ہدایتکار کون ہے؟ ذہن! کوئی سوچ بھی سکتا ہے فاتحِ شمس و قمر اپنی زندگی سے بے زار ہو چکا ہے۔ آہ:

ذرے کے زخمِ دل پہ توجہ کئے بغیر

درمانِ دردِ شمس و قمر کر رہے ہیں ہم

یہ بات کسی کے عقل میں آسکتی ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال ملک امریکہ میں اقدامِ خودکشی کرنے والے بد نصیب انسانوں کا اوسط پانچ لاکھ سالانہ سے کم نہیں۔ کس کو یقین آئے گا کہ طبیعیات، علوم، ایٹمی سائنسوں اور خلائی تحقیقات کے میدان میں انسان کی رفتار جتنی تیز ہے۔ اس کی دماغی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، خیر یقین آئے نہ آئے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ راکٹوں، ٹیلیویشنوں، ایئر کنڈیشنروں اور دوسری حیرت انگیز ایجادات کے اس ترقی یافتہ اور با وسیلہ دور میں بنی آدم اپنی حیات نوعی کی سب سے زیادہ مضطرب اور مفلوک الحال زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کو عہدِ کرب و تشویش اور زمانہ خوف و دہشت کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے آج مغربی یورپ اور امریکہ کا سب سے زیادہ مقبول فلسفہ حیات "وجودیت" کی رو سے انسان اس کائنات میں تنہا پیدا ہوا کرب و تشویش کی جہنمی زندگی بسر کر کے تنہا ہی مر جائے گا (مر گئے مردود جن کا فاتح نہ درود)

مرے قریب نہ آ۔ اے بیشع بے خبری!

خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

سوال یہ ہے کہ انسان کے اس گہرے کرب و تشویش کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ جسم اور ذہن کا وہ سمجھوتہ ختم ہو چکا ہے جس کے بغیر انسان کبھی روحانی سکون نہیں پاسکتا جسم کے لئے جتنی آسائشیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ ذہن کے لئے اتنی ہی اذیتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جان و تن اور جسم و جاں کے تضاد کا یہ چکر کب ختم ہوگا؟

احساسِ کمتری

عجیب بات ہے کہ اس قدر مادی برتری کے باوجود بیسویں صدی کا انسان عجیب قسم کے دبے ہوئے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ ہسٹریا، مانیٹو لیا، مراق، خطہ، جنون اور وہم کو تو چھوڑیے یہ تو کھلے ہوئے جسمانی امراض ہیں ہی۔ یہاں اُن دہی ہوئی الجھنوں کا ذکر ہے جو زہر کی طرح اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے نفسِ انسانی کو ہلاک کر رہی ہیں اور آخر کار اشرف المخلوقات انسان کو جانور سے بھی غلیظ سطح پر گرا دیتی ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بے مثال مادی برتری کے باوجود عہدِ جدید کا انسان شدید کمتری کے احساس میں مبتلا ہے۔ یہ اس عہد کا ایک عام مرض ہے۔ اس مرض نے کروڑوں انسانوں کو ذہنی اور روحانی طور پر مفلوج اور اپانج بنا کر رکھ دیا ہے، بعض اوقات تو یہ یقین کر لینے کو بھی چاہتا ہے کہ انسان پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ "احساسِ کمتری" میں مبتلا رہے۔ جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو بجا طور سے کمتری کا احساس ہم پر غالب آ جاتا ہے۔ خیر یہ عام انسانی تقدیر ہے یا تو وہ ہمیشہ کائنات کے مقابل اپنے کو عاجز اور حقیر تر محسوس کرتا ہے یا پھر اس کائنات پر غالب آ کر عالمِ فطرت پر اپنی برتری کا سکھ جھادے۔ انسان اور قوائے فطرت (از فرشتہ تا بہ حیوان) کے درمیان ازل سے جنگ چھڑی ہوئی اور ابد تک لڑائی جاری رہے گی یہ ہے انسان کے احساسِ کمتری کا وہ کائناتی پہلو، جس میں ہم قوائے فطرت کی تسخیر کے ذریعے غالب آنے کی ابتداء سے کوشش کر رہے ہیں اور انتہا تک کوشش کرتے رہیں گے۔ وہ ماہ و مریخ کی تسخیر کی کوششیں بھی اس ازلی و ابدی جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن کمتری کے اس

گہرے اور دبے ہوئے احساسات کا ایک انسانی پہلو بھی ہے اور وہ ہے تربیت اخلاق نظام! بچہ پیدائش کے پہلے روز سے لاشعوری طور پر محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کتنا کمزور اور کس درجہ بے بس ہے۔ ننھا منا بدن، ذرا سے ہاتھ پاؤں، بولنے کی طاقت سے محروم، چلنے پھرنے سے معذور، کبھی ماں کے سینے سے چمنا ہوا ہے کبھی باپ کی چھاتی سے لگا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سال چھ مہینے کے بچے کا ذہن پوری طرح سے ترقی یافتہ نہیں ہوتا اس کے شعور کی گرفت بے حد کمزور ہوتی ہے۔ تاہم اس کے تحت اشعور (اور کسی حد تک شعور) میں صلاحیت اس وقت پائی جاتی ہے کہ وہ گرد و پیش کے اثرات کو قبول کر کے انہیں اپنے حافظے میں جذب کرتا رہے۔ غور سے دیکھئے اور سوچئے تو نوزائیدہ بچے کی تیز نشوونما اور جسمانی بڑھوتری بھی اس کے قدرتی احساس کتری کا ایک قدرتی علاج ہے۔ تاکہ نئی نسل کی یہ اکائی (بچہ) اتنا ہی بڑا جسم حاصل کر لے جتنا بڑا جسم ماں باپ کا ہے۔ جس طرح ننھے ننھے بچے کا ننھا منا سا بدن زیادہ سے زیادہ گوشت پوست پیدا کر کے جسم کو چڑا چکا کر کے اپنی ظاہری کتری کو رفع کرنے کی سرگرمی کوشش کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بچے کا محسوس ذہن بھی زیادہ سے زیادہ ترقی کر کے اسی ذہنی طاقت اور مافی رفقہ تک پہنچنا چاہتا ہے جس پر اس کے والدین فائز ہیں۔

انسانی زندگی کے ابتدائی سات سال کو جسم اور ذہن کی نشوونما کا بنیادی زمانہ کہا جاتا ہے اور ٹھیک یہی وہ زمانہ ہے جب بچہ پوری طرح ماں باپ کی تربیت کی گرفت میں ہوتا ہے۔ یہی سات سال ہیں جو ستر سال تک انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور یہی وہ ”دور نشوونما“ ہے۔ جس میں ماں باپ کی جہالت اور ماحول کا جبر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچے کے ذہن کو ناکارہ کر دیتا ہے۔ احساس کتری کا موزی مرض اسی زمانے میں نفس کے اندر جڑ پکڑتا ہے۔ اور اس کے اثرات دس بارہ سال کی عمر کے بعد رفتہ رفتہ اس طرح نمایاں ہونے لگتے ہیں کہ انسانی زندگی جسمانی طور پر نہ کسی روحانی طور پر جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔ احساس کتری کا بیج، تکلیلی جھاڑی کی طرح نفس کے اندر

اگتا ہے اور اس کی خاردار شاخیں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ احساس کتری کے نتیجے میں سب سے پہلے اپنے وجود اور اپنی شخصیت کی طرف سے بے اعتمادی اور کم اعتقادگی پیدا ہوتی ہے پھر ساری دنیا سے! احساس کتری کا مریض رفتہ رفتہ زندگی، انسان، مذہب، اخلاق اور خدا غرض ہر حقیقت کے بارے میں ڈھٹیل یقین ہو جاتا ہے۔ ڈھٹیل یقینی شدید اخلاقی بغاوت کا روپ دھار لیتی ہے اور انسان چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح دنیا کی ہر چیز پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو ستا کر اور اپنے کو دکھ اور تکلیف دے کر لذت حاصل کرتا ہے اور انجام کار اس مردم آزاری کے سبب سماج کے لئے لعنت اور خود اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ مگر یہ کیفیت صرف اُن لوگوں سے مخصوص ہے جو اپنے احساس کتری پر غالب آنے سے قاصر رہتے ہیں ورنہ عام طور سے ان کی تجربات کی روشنی میں ذہن کی اس اندھیری گلی سے نکل کر خود اعتمادی، جہد حیات اور ترقی و کامرانی کی تیز دھوپ میں آکر نئی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی جاتا ہے۔ احساس کتری کا منفی اور تخریبی پہلو یہ ہے کہ انسان کو بزدل، یقین، بے اعتماد، منافق، یاس پسند اور مجرم بنادیتا ہے۔ لیکن ایسی صورتیں ہزاروں میں ایک اور دس ہزار میں دس ہیں سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ احساس کتری کا مثبت اور تعمیری پہلو زیادہ شاندار اور حوصلہ افزا ہے۔ انسان میں ماحول کو ناسازگار حالات پر غالب آنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ احساس کتری کی شدت اس صلاحیت کو زیادہ فعال اور چاق و چوبند بنادیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے چھوٹے ہونے کا احساس انسان کو بڑا بننے کی طرف لے جاتا ہے انسان کو انا یا اس کے نفس کی قوت متحرک و محرکہ کو ہمیشہ آگے بڑھنے کی طرف اکساتی ہے۔ ایک طرف تو بچے کا جسم تیزی سے ترقی کرتا ہے کہ وہ جسمانی حیثیت سے ماں باپ کے برابر ہو جائے (یہ بھی احساس کتری پر غالب آنے کی کوشش ہی تو ہے) اور دوسری طرف بچہ تیز رفتار ذہنی ترقی کی کوشش کرتا ہے وہ ہر چیز کو جاننے اور ہر کام کو انجام دینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے میں ماں باپ کی نقل کرتا ہے اپنے سے چھوٹے

بچوں پر حکومت جتنا ہے۔ غرض ہر وہ کام کرنا چاہتا ہے جس سے خود اُسے اور دوسروں کو اس کی اہمیت کا احساس ہو، چودہ پندرہ سال کی عمر میں بچے کی اتنی حد تک انحراف و بغاوت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ انحراف کا یہ باغیانہ میلان اور رجحان بھی اس کے احساس کمتری کا ایک عارضی علاج ہے۔ بالعموم بغاوت کا یہ دور 28 / 30 سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔ اس زمانے میں انسان بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ سماج میں اپنا مقام بناتا ہے اور معاشرے پر پوری طاقت سے چھا جانے کی کوشش کرتا ہے حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان میں کمتری کا احساس موجود نہ ہوتا تو کبھی وحشی حیوانی آدمی کی سطح سے انسان برتر کے درجے تک نہ پہنچتا۔

☆☆☆

شعورِ برتر

انسان برتر وہ ہے جو شعورِ برتر کی دولت سے مالا مال ہے جس طرح ہمارا جسم سر منزل واقع ہوا ہے (سر، گردن، دھڑ اور ٹانگیں) اسی طرح شعور کو بھی آسانی اور وضاحت بیان کے لئے تین پرتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ شعور کا نچلا پرت جو جبلت جذبات اور حافظے کا مرکز اور مخزن ہے۔ دوسرا پرت جو عقل، استدلال، منطق، ریاضی اور ادراک و امتیاز کا اسلحہ ہے اور تیسرا پرت شعورِ برتر SUBLIMINAL CONSCIOUSNESS ہے جس کی حدود انسانی سوچ اور تفکر کی رسائی سے باہر ہے۔

مرے شعور کا عرفان کے نصیب کہ میں
سروشِ روحِ منزل ہوں۔ سے آیا ہوں آمین

جب تک ہم جاگتے رہتے ہیں انسانی شعور کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ جب شعور پر نیند طاری ہو جاتی ہے تو اس کا نچلا حصہ جاگ اٹھتا ہے۔ انسانی شعور کو ایسا اسٹیشن فرض کیجئے جس سے ہر سیکنڈ میں خیالات کی ایک نئی ٹرین گزرتی ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اس اسٹیشن کے علاوہ نفس کے اندر شعور کا ایک اور زمیں دوز اسٹیشن جہاں سے گہرے دبے ہوئے خیالات اور جذبات کی قطاریں مسلسل گزرتی رہتی ہیں چونکہ مثالوں میں بات چیت ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم شعورِ برتر کو فضا پرواز طیارہ بلکہ خلا پرواز راکٹ تصور کریں جو ذہن کے ہوائی اڈے سے اڑ کر زمینی پابندیوں بلکہ بعض اوقات حدودِ زمان و مکان تک سے آزاد ہو جاتا ہے۔ صرف تحلیل نفسی، حیوی نیند اور تعبیر خواب وغیرہ کے ذریعے ذہن کی بالائی اور اندرونی سطح (عام نفسیاتی اصطلاح میں تحت

(اشعور و الاشعور) پر رنگنے والے خیالات اور جذبات کی مختلف کڑیوں کو ملا کر، نفس کے کسی دبے ہوئے جذبے اور کچلی ہوئی خواہش یا بھٹکی ہوئی جبلت کا کھوج لگایا جاتا ہے آپ استدلال و استدراک (منطق) کے وسیلوں سے کام لے کر شعور کی رفتار اور اس کے آثار چڑھاؤ کو معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن شعور برتر کی کارفرمائیوں اور کاروائیوں کا علم، دلیل بازی اور مطبعتی جوڑ توڑ سے ممکن نہیں۔ کیونکہ شعور برتر، ان پابندیوں سے آزاد اور بلند تر ہے۔

ہاں تو۔ آپ کے شعوری ریلوے اسٹیشن سے ہر لمحے خیالات کی ایک نئی ترین (قطار) گزرتی ہے اور آپ بیداری کی حالت میں دم لئے اور سستائے بغیر، بھوم خیال کی اس بھیڑ بھاڑ سے دوچار رہتے ہیں۔ لیکن جوئی ذہن سے کوئی اہم کام لینے کا قصد ہوتا ہے۔ مثلاً کسی الجھے ہوئے مسئلے پر سوچ بچار۔ کسی مشکل موضوع پر غور و خوض۔ کسی خاص قضیے کا (خواہ وہ علمی ہو یا عملی) حل! تو کیا ہوتا ہے یہ کہ خیالات کی تمام لوکل گاڑیوں کو بیرونی سگنل پر روک دیا جاتا ہے۔ اس طرح ذہن کا بڑا پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے پھر کسی خاص مسئلے (جس پر آپ غور و خوض کرنا چاہتے ہیں) کی تیز گام ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔ یہ عمل توجہ کے ذریعے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اختیاری اور اضطراری توجہ کے مختلف پہلوؤں پر اس سے قبل روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ زندگی کے کسی شعبے کو لے لیجئے۔ کامیابی صرف انہی انسانوں کے قدم چومتی ہے جو اپنے ذہن کے پلیٹ فارم پر خیالات کی مختلف لوکل ٹرینوں اور چھکڑا گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ صرف بڑے عندیوں اور عظیم الشان منصوبوں کی فرسٹ کلاس ریلوں کو ذہنی حدود میں داخلے کا اشارہ (سگنل) دیتے ہیں!

شعور کی سرگرمیوں کو مدھم کرنے پر کنٹرول حاصل کرنے اور نفس کی اندرونی تہوں (تحت اشعور، الاشعور) کی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے فطرت نے نیند کو پیدا کیا ہے۔ عالم خواب میں انسانی شعور کی سرگرمیاں مدھم ضرور پڑ جاتی ہیں معطل نہیں ہوتیں، حالت بیداری میں بھی توجہ ایک جگہ مرکوز کر کے شعور جو آوارہ گردیوں سے باز رکھا

جا سکتا ہے۔ جب ذہن کی تمام طاقت اور توجہ کی پوری رو کو کسی ایک نقطے (POINT) اور ہدف (OBJECT) پر مرکوز کر دیا جاتا ہے تو ذہن رفتہ رفتہ شعور کی سطح سے اٹھ کر شعور برتر کی سطح پر پہنچ جاتا ہے، میں خود جب فکر سخن میں غرق ہوتا ہوں تو دل و دماغ پر ایک محویت سی چھا جاتی ہے۔ آپ خود جب کسی پیچیدہ مسئلے کو سلجھانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں کیا یہ روزمرہ کا تجربہ نہیں ہے پھر سمجھ لیجئے کہ بھرپور توجہ یا استغراق کی کیفیت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک شعور کی پوری توجہ کو ایک ڈگر پر نہ ڈال دیا جائے۔ استغراق کے عالم میں ذہن صرف ایک نقطے سے چپک کر رہ جاتا ہے۔ مراقبے کی تمام کیفیات موجود ہوتی ہیں، تاہم ذہن متحرک رہتا ہے۔

اس سلسلہ بحث و فکر کو آگے چل کر ارتکاز توجہ، استغراق اور مراقبے وغیرہ کی مختلف حالتوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ فی الحال اتنا سمجھ لیجئے کہ جب تک ذہنی قوتوں کو ارتکاز توجہ کے عمل کے ذریعے منظم اور بیدار نہ کیا جائے ممکن نہیں کہ ہم اپنی مغنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں۔

لیکن توجہ کو کسی ایک نقطے یا نکتے پر مرکوز کر دینا آسان نہیں ہے۔ انسانی ذہن کو ایک ایسے چنپل اور شریر بندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو کبھی نچلا بیٹھنا نہیں جانتا، کبھی ساکن نہیں ہوتا، ابھی اس ٹہنی پر لٹک رہا ہے، ابھی اس شاخ پر جا چڑھا۔ وہاں سے اچھلا تو بیڑ کے تنے سے لپٹ گیا۔ منہ پڑا رہا ہے، آنکھیں منک رہی ہیں، جسم ہل رہا ہے، دم ہے کہ مسلسل حرکت میں ہے۔ یہی کیفیت ذہن کی ہے۔ ان تمام موضوعات کو آئندہ سلسلہ گفتگو میں زیر بحث لایا جائے گا البتہ یہ چیز پیش نظر رکھیں کہ ذہن کی بے قابو حرکتوں اور شعور کی لگاتار اچھل کود کو کنٹرول کرنا ناممکن نہیں، ذہن بھی ہماری قوت ارادی کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح جسم! جس طرح ہم تربیت جسم کے ذریعے دست و پا کو اپنے زیر حکم لے آتے ہیں (پہلوانی اور فن کشتی اور تن سازی کا مقصد یہی ہے کہ جسم کو

ضرورت کے مطابق سدھایا جائے) اسی طرح تربیت توجہ کی ابتدائی مشق ہے ارتکاز توجہ کا عمل ارتکاز توجہ کے لئے قوت نظر کی عظیم ضروری ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ ارادے اور اہتمام کے ساتھ اس کا قصد نہ کریں۔ کسی ایک چیز کو پلک جھپکائے بغیر نظریں جما کر دیکھنا اور اس مشق نظر کے ساتھ خیال کی پوری طاقت کو ”مشہود“ (وہ چیز جس پر آپ کی نظر جمی ہوئی ہے) پر لگا دینا تربیت توجہ کا پہلا سبق ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ توجہ کی مرکزیت اور قلب کی یکسوئی حاصل ہو جائے تو پہلے آپ کو مسلسل اور لگاتار مشاہدے GAZING کی مشق کرنی پڑے گی۔

آشوریوں کے عہد سے اب تک فوق العادہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے صرف ایک ہی طریق کار پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے اور وہ ہے ارتکاز توجہ! تین ہزار سال۔ بابل مصر اور آشور کے کاہن اور غیب دان بلور یا ہیرے یا کسی دوسری چمکدار چیز پر نظریں جما کر خود عالم غیب سے تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ اس عالم میں وہ بہت سی پیش گوئیاں کرتے جن میں سب تو نہیں بہت سی پیش گوئیاں اور مستقبل بینیاں صحیح ثابت ہوتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فن گہائت (غیب دانی) کی تکمیل اس عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ آشوری کاہن ”بلور بنی“ کے فن کے استاد تھے انہیں سے یہ فن مصریوں، رومیوں اور یونانیوں تک پہنچا۔ ہندوستانی یوگیوں، چینی راہبوں اور تبت کے لاماؤں نے غیب دانی اور مستقبل بینی کے لئے کچھ اور طریقے اختیار کئے۔ ہمارے صوفیاء نے بھی تصور و توجہ کی مشق کو تسخیر نفس مہم کا پہلا معرکہ قرار دیا ہے، یوگیوں، ویدائشیوں، سادھوؤں اور ذرشت و مہاتما بدھ کے پیروں نے گیان و حیان کی تربیت کے لئے الگ اسکول کی بنیاد ڈالی اور تو اور جب انیسویں صدی میں مسریزم اور بعد کو پیناٹزم کا انکشاف (اب سائنٹفک حلیم کر لیا گیا ہے) تو انہوں نے بھی انسانی لاشعور تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سلسلے توجہ کے کچھ طریقے وضع کئے۔ جن میں بنیادی اہمیت ماہر تنویم کی تلقین و ترغیب (SUGGESTIONES) کو حاصل ہے یہ بات یاد رکھئے کہ مشاہدے کی گہرائی اور

کیرائی (مثلاً بلور بنی) کے نتیجے میں عامل (مشاہدہ کرنے والے) پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُسے نفسیات کی اصطلاح میں (DIS ASSOCIATION OF CONCIIOUSNESS) کہتے ہیں۔ غیب دانی اور غیب بینی کے مختلف طریقے ہیں۔ بلوری گلاس یا بلوری گیند پر کوئی نقطہ فرض کر کے اس فرضی نقطے پر نظریں جمادینا (CRYSTAL GAZING) چمکدار جواہرات، خصوصیت کے ساتھ درخشاں زمرود کو مرکز مشاہدہ بنانا پھر آب بینی (آب رواں کو ٹٹکنگی باندھ کر دیکھنا) شمع بینی، طشت بینی (طشت میں پانی بھر کر نظریں جمانا) ناخن پر چمک دار تیل لگا کر ٹٹکنا یا چاند سورج پر نظریں جمادینا، سایہ بینی وغیرہ وغیرہ۔ ان مشاہدات سے بصارت کے مکاشفات شروع ہوتے ہیں یعنی ہدف نظر پر خیالی شکلیں اور فرضی مناظر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سمعی مکاشفات (یعنی ندائے غیب سننا ہاتف کی آوازوں کی سماعت) کے لئے تبتیوں، چینوں اور ہنٹری کے خانہ بدوشوں نے طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ صدف البحر (سمندری پتلی) کان میں رکھ کر صدائے غیب سننے کی کوشش کرتے تھے۔ سمعی مکاشفات کا ابتدائی طریقہ یہ ہے کہ صاحب ہمت کی نشست عبادت (جس کو فن دست شای میں دل کی نقلی کہتے ہیں) سے بائیں کان بند کر لیں اور پراسرار آوازیں کی کوشش کریں۔ اس طرح شروع شروع میں فریب سماعت کی کیفیت طاری ہوگی اور رفتہ رفتہ سماعت کا یہی فریب ایک ایسی صداقت میں تبدیل ہو جائے گا جس کا فی الحال اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

استغراق کا ایک طالب علم سوال کر سکتا ہے کہ شمع کی لو بلور کی گیند کے کسی فرضی نقطے پر نظریں جمانے والے کو استغراق کے عالم میں جو شکلیں نظر آتی ہیں، ان کی حقیقت و اصلیت کیا ہے؟ وہ عالم غیب کے مناظر ہیں یا خود ہمارے حافظے میں دبے ہوئے تجربات کی پرچھائیاں؟ کیا یہ سب کچھ فریب والتباس (HALLUCINATIONES) نہیں ہے۔ استغراق کے تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص پلک جھپکائے بغیر مسلسل کسی چیز کو ٹٹکنگی باندھ کر دیکھتا ہے تو اس پر رفتہ رفتہ شعور کی کیفیت طاری ہو جاتی

ہے۔ یعنی اس کا منظم سلسلہ خیال ٹوٹ جانے کے نتیجے میں وجد یا بے خودی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بے خودی کے اسی لمحے میں کبھی کبھی زماں و مکاں کی پابندیوں سے بلند ہو کر ہمارا شعور برتر، شعور مطلق سے براہ راست رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ کسی چیز پر نظریں جمانے سے شعور برتر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہم فعلیات کی روشنی میں بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب آپ کسی چیز کو نظر بجا کر غور سے دیکھتے ہیں تو دماغ کے مرکز احساسات میں آہستہ آہستہ پہچان سا پیدا ہوتا ہے۔ اس پہچان سے دماغ کا غدہ بلغمی (PITUITARY GLAND) حرکت میں آتا ہے، عامل پر بہ خودانہ کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، غدہ بلغمی کا عمل تیز ہوتے ہی دماغ کی دوسری گٹھی ”غدہ صنوبری“ (PINSAL GLAND) اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ دماغ کی یہ دوسری گٹھی جسے غدہ صنوبری کہتے ہیں شعور برتر کا مرکز ہے۔ جس طرح دماغ کے پہلے حصے اور ریڑھ کی ہڈی کے اعصابی نظام کو لاشعور کا مخزن اور مستقر کہا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ارتکاز توجہ اور استغراق سے نفس انسانی کی وہ قوتیں بیدار ہونے لگتی ہیں جو فاصلے اور مسافت زماں و مکاں اور ماضی و مستقبل کی قید سے آزاد ہیں اور جنہیں کچھ خارجی المیہ الہیہ ازلی کہا جاسکتا ہے۔ میں نے ابھی افتراق شعور کا ذکر کیا تھا۔ افتراق شعور یہ کہ ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ اس طرح توجہ کے رشتے ٹوٹ جانے کے سبب انسان اپنے کو ایک عجیب و غریب دنیا میں پاتا ہے۔ افتراق شعور کی یہ کیفیت مریضانہ بھی ہوتی ہے اور صحت مندانہ بھی! مراق، مانٹولیا، خط، جنون یہ تمام حالتیں افتراق شعور کے سبب وجود میں آتی ہیں۔ مراق اور مانٹولیا کے مریضوں کو بھی طرح طرح کی خیالی شکلیں نظر آتی ہیں۔ فرضی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ فرشتے، جنات، مجوت، مردے اور نہ جانے کیا نظر آتا ہے۔ تنویمی بے خودی (HYPNOTIC TRANCE) افتراق شعور کی کیفیت قصد اور ارادے سے پیدا کی جاتی ہے اور تنویمی معمول بھی بصارت سماعت لمس اور حواس کے دوسرے دھوکوں اور دوسروں سے دوچار ہوتا ہے۔ ارتکاز توجہ، استغراق اور مراقبہ کے

ذریعے بھی وجد و بے خودی کی یہی حالت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس حالت میں بھی لوگوں کو مکاشفات اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ غیب دانی اور غیب بینی کے جوہر ابھرتے ہیں۔ شعور برتر کی صلاحیات چست اور فعال ہو جاتی ہیں مگر یہ صورت مریضانہ نہیں صحت مندانہ ہے۔ ان سطور کا مطالعہ کرنے سے قبل ایک لمحہ ٹھہر جائیے اور سوچئے کہ اس سے قبل آپ کیا سوچ رہے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں ہو گا ہی کہ پیش نظر کتاب کا مطالعہ کرنا ہے، اس کے علاوہ ذہن میں اور کیا کیا خیالات تھے، ذہن کی چھان بین اس طرح کی جائے تو یہ دیکھ کر تعجب ہو گا کہ انسان کی ذہنی سطح سے خیالات کی ہر زد و جو گزرتی ہے کچھ عجیب طرح سے گڈمڈ اور خلط ملط ہوتی ہے۔ کسی ارادے کے بغیر ایک خیال کے ساتھ دوسرا خیال اس طرح ذہن میں آ جاتا ہے جس طرح تیز رفتار ریل گاڑی کی حرکت میں ایک ڈبے کے بعد دوسرا ڈبہ پٹری سے گزرتا ہے ذہن کی چھان بین یا مطالعہ خیالات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ڈبے پاؤں ذہن سے گزرنے والے خیالات کی ہر زد و ہر قطار، بظاہر نہایت بے مقصد اور فضول تصورات پر مشتمل ہوتی ہے، البتہ میں اکثر خیالات ایسے ہوتے ہیں جن کا آپ کی ذات خاص سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ نہ آپ کو اُن سے کوئی دلچسپی ہوگی۔ لیکن خیال کا قانون ہی ہے کہ ایک یاد کے ساتھ دوسری یاد۔ ایک تصور کے ساتھ دوسرا تصور ایک جذبے کے ساتھ دوسرا جذبہ بغیر کسی سعی و کوشش کے ذہنی سطح پر نمودار ہو جاتا ہے، اس طرح ہم ہر لمحے اور ہر لحظے بیکار اور کار آمد مفید اور مضر اور اچھے بُرے خیالات کے دھارے میں بہتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دن بھر کی آمد و خرچ کی طرح بھر کے خیالات کا یہی کھانا کھینے کی بھی عادت ڈال لے تو پتہ چلے کہ دن بھر اُس نے متعلق اور ضروری مسلوں کے بارے میں بہت کم اور غیر متعلق چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ سوچا۔

خیال کہیں باہر سے نہیں آتا، اندر سے پیدا ہوتا ہے، ہر خیال کی بنیاد کسی نہ کسی جذبے کی سطح پر استوار ہوتی ہے اور چونکہ ہر جذبے میں توانائی کی ایک خاص مقدار

پوشیدہ ہوتی ہے۔ بنا بریں خیال کے اندر بھی خاص قسم کی قوت پائی جاتی ہے، ہر وہ جذبہ جو ہمارے نفس سے ابھرتا ہے ہمارے اندر کیمیائی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے دماغ اور نظام اعصاب کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ فرض کیجئے کہ ان سطور کے مطالعے کے وقت یکا یک ایک شخص پیچھے سے آکر سان نہ گمان ہاؤ کا نعرہ لگاتا ہے، آپ اس کے اس نعرے سے اچھل پڑتے ہیں، نامعلوم خوف کے زیر اثر جسم میں تھر تھری پڑ جاتی ہے، ذر کے مارے کھٹکھی بندھ جاتی ہے دل دھڑکنے لگتا ہے، ہر عضو بدن کانپنے لگتا ہے بے اختیار چیخ نکل جاتی ہے مختصر یہ کہ ناگہانی خوف کے جذبے کے زیر اثر چند لمحے کے لئے آپ کا جسمانی اور اعصابی نظام بالکل معطل ہو جاتا ہے۔ خوف کے اس جذبے کے ساتھ فوراً آپ کو بچاؤ کا خیال بھی آئے گا، اور آپ نامعلوم دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے خوف کے جذبے پر غالب آنے کی کوشش شروع کریں گے۔ سلامتی اور خود حفاظتی کے جذبے کے اعصاب تن جائیں اور تبدیلیاں رونما ہوں گی مثلاً منٹھیاں بھنچ جائیں گی، سینے کے اعصاب تن جائیں گے اور پورا جسم ہر اعصابہ پوزیشن میں آجائے گا۔ غرض آپ کی پوری جسمانی اور ذہنی مشینری آگاہانہ حملے سے بچاؤ کے لئے تیار اور مستعد ALERT ہو جائے گی۔ یہ کمال کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے؟ اس طرح کہ بے خیالی میں ”ہاؤ“ کا نعرہ سن کر ذہن میں خوف کا جذبہ پیدا ہوا، اُس نے بجلی کی طرح غدہ کلاہ گردہ کو بیدار کیا اور غدہ کلاہ گردہ (ADRENAL GLAND) نے اپنا کیمیائی عمل شروع کر دیا۔ خون میں خاص قسم کی دھوبت پہنے لگی اور جسم حملے اور دفاع کے لئے تیار ہو گیا۔ بے شک جس طرح ہر جذبے میں توانائی ہوتی ہے اُسی طرح ہر خیال میں اس کی وسعت و شدت کے مطابق خاص قسم کی قوت مضمر ہوتی ہے۔ خیال یہی قوت ہے جو آپ کو بھی متاثر کرتی ہے اور دوسروں کو بھی۔

☆☆☆

مقناطیسی دائرہ

توانائی (انرجی) کا قانون یہ ہے کہ وہ گردہ پیش کی فضا میں مناسب حد تک پھیل کر یکساں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کسی کمرے میں انگلیٹھی جلائیے۔ حرارت کی شکل میں کونکوں سے قوت خارج ہوگی وہ کمرے کی پوری فضا میں پھیل کر گرد و پیش کے ماحول میں یکساں درجہ حرارت پیدا کر دے گی، جس طرح توانائی یا انرجی کی لہر اپنا دائرہ پکڑتی ہے۔ اسی طرح خیال کی بھی ہر لہر دائرے کی طرح فضا میں پھیلتی اور ہر اس شخص کو جو اس دائرہ خیال میں قدم رکھتا ہے متاثر کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو خیال کی دنیا عمل کی دنیا میں ہر جگہ بغیر کسی روک ٹوک کے نافذ ہے۔ بلب جس رنگ کا ہوگا اُسی رنگ کی روشنی بلب سے نکلے گی یہی حال دماغ اور خیال کا ہے۔ دماغ کو ایک طاقت ور انٹیشن فرض کر لیجئے اس طاقت ور نشر گاہ (دماغ) سے ہر لمحے خیالات کی لہر نشر ہوتی اور ایک دائرے کی طرح چلتی رہتی ہیں۔ اس دائرے کی نوعیت مقناطیسی ہے، اس مقناطیسی دائرے میں داخل ہو کر ہر شخص کسی نہ کسی طرح اثر پذیر ضرور ہوگا۔ ہم کہتے ہیں بھی! فلاں شخص سے مل کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہاں شخص سے مراد گوشت پوست کا بنا ہوا کوئی جسم نہیں۔ شخص سے مراد خیالات کا وہ مقناطیسی دائرہ ہے جو اس کے گرد پایا جاتا ہے اور اُس کی شخصیت کا تعین کرتا ہے (شخصیت کی بحث آگے آئے گی) مرزا غالب فرماتے ہیں کہ۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

محشر خیال بڑے معرکے کا فقرہ ہے۔ ہاں بلب جس رنگ کا ہوگا، روشنی اسی رنگ کی نمودار ہوگی۔ اس سلسلے میں دماغ کو بلب تصور کیجئے اور خیالات کو روشنی کی

شعاعیں، سرخ رنگ کا بلب ہے تو سرخ روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ سبز ہے تو سبز نور، یہی حال دماغ کا ہے اگر دماغ نفرت، غصے، بیزاری، حسد، عداوت، کینہ اور انتقام کے احساسات سے لبریز ہوگا تو اسی قسم کی امواج جذبات نشر کرے گا اور اگر محبت، خلوص، پاکیزگی، ایثار، بے غرضی، مروت، فداکاری اور انسان دوستی کے احساسات سے لبریز ہے تو اسی قسم کی لہریں فضا میں پھیلا رہا ہے، خیال کا دائرہ انہی پاکیزہ جذبات سے مرکب ہوگا۔ آپ اپنی شخصیت کے گرد منفی خیالات اور احساسات کا دائرہ بنائیں گے تو لوگوں کو منفی متاثر کریں گے۔ یعنی اپنے سے بیزار! اگر مثبت جذبات و خیالات کا دائرہ بنائیں گے تو مثبت اور تعمیری خیالات کی لہر آپ کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ اور آپ محبوبیت و مقبولیت کا قابل رشک درجہ حاصل کر لیں گے۔ جو شخص آپ کے دماغ کے متناطیسی دائرے میں قدم رکھے گا مسحور ہو جائے گا۔ مرزا غالب نے آدمی کو محشر خیال قرار دیا ہے۔ محشر خیال کے معنی سمجھئے۔ خیالات کی طاقت و لہریں نشر کرنے والے کئی ہزار کلو واٹ کا ریڈیو اسٹیشن! دیکھنا یہ ہے کہ اس ریڈیو اسٹیشن کی نشریات لوگوں کے لئے مفید ہیں یا مضر، جہاں تک توانائی اور انرجی کا تعلق ہے فضا میں تھپل تو ہوتی ہے تو نہیں ہوتی۔ یہی حال خیال کا ہے، آنکھ سے نظر نہ آئیں۔ لیکن فضا میں مسلسل خیالات کی لہریں رواں دواں رہتی ہیں اور لوگ برابر ان سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کے دائرہ خیال کی طرح ہر مقام اور ہر جگہ کا بھی اک دائرہ خیال ہوتا ہے۔ آپ ایک ایسے شہر میں داخل ہوتے ہیں جو کسی حادثے کے سبب سوگواری اور غمگینی کے عالم میں ڈوبا ہوا ہے۔ گو آپ کو معلوم نہ ہو کہ یہ شہر سوگواری ہے اور اس پر ماحمی کیفیت طاری ہے۔ آپ دل کو ٹٹولیں۔ ذہن کو کھینچ لیں تو محسوس کریں گے کہ ذہن مرجھا رہا ہے۔ دل ڈوب رہا ہے، طبیعت کی شکستگی رخصت ہو رہی ہے۔ یہ غم ناک ہی تاثیر یا الہناک کیفیت، سوگوارانہ خیالات کے بادل سے پیدا ہوئی ہے جو اس وقت شہر پر منڈلا رہا ہے۔ اقبال کا وہ مصرعہ دہرایئے:

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے

دلی یاد ہے؟ مگر کیوں یاد آتی ہے؟ اس لئے کہ دلی صدیوں سے پر عظمت اور پر سطوت شاہانہ خیالات کے سنہرے روپے غلاف میں لپی ہوئی ہے۔ جنہیں دلی کی روایات کہا جاتا ہے۔ وہ روایات درحقیقت صدیوں کے تسلسل خیالات کے نتیجے میں پیدا ہوئیں اقبال صدیوں کے تسلسل خیالات کے انہی مجموعوں سے سواد رومۃ الکبریٰ میں دوچار ہوئے اور اسی مناسبت سے مضامینات روم میں بے اختیار دلی یاد آگئی، نہایت معمولی تجربہ ہے مگر نہایت اہم آپ جب جب بھی کسی نئی جگہ جائیں۔ یہ دیکھیں کہ ذہن کی کیفیت کیا ہے؟ اگر ذہن کلقت ہے تو فوراً یقین کر لیجئے کہ اس جگہ کا دائرہ خیال زندگی تازگی اور شکستگی ہے اسی طرح معطر ہے جس طرح گلاب کی کیاری خوشبو سے! اگر نئے مکان اور مقام میں پہنچ کر جی غم حال ہو جائے، اجنبیت اور بیگانگی محسوس ہو، ڈر سا لگے تو سمجھ لیجئے کہ آپ ایسے مکان میں آئے ہیں جو بیمار، خوفناک اور بھرمناہ خیالات کے اندھیروں میں لپٹا ہوا ہے اب آپ اس لاشعوری رد عمل کی بناء پر مکان کے بارے میں تحقیق کیجئے۔ پتہ چل جائے گا کہ مکان کی نسبت، بغیر کسی ظاہری وجہ کے ذہن نے جو کیفیت محسوس کر لی ہے۔ یہ وہ کیفیت مکان کی نسبت اور ذہن سے ملنے والی ہوئی ہے۔

یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کے سنائے

مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

خالی گھروں کے سنائے غور اور انہماک سے سنئے۔ آنکھیں بند کر کے اور ذہن کے کان کھول کر بیٹھ جائیے۔ اس عالم میں مکان سے تعلق رکھنے والے خیالات کی لہریں آپ کے دماغ میں پہنچنے لگیں گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ مکان مجھ سے مخاطب ہے اور ایک ایسی زبان میں جو الفاظ سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اپنی کہانی سنا رہا ہے رفتہ رفتہ اس مکان کی روح، اس کی تاریخ، شخصیت اور ضمیر آپ پر منکشف ہو جائے گا، ہر مکان اور آدمی کے گرد خیالات کا جو ہالہ ہوتا ہے۔ مسلسل مشق و ریاضت کے نتیجے میں اُسے دیکھا جاسکتا ہے۔ خیالات واقعی مادی اشیاء کی نوعیت رکھتے ہیں ان میں حرارت بھی ہوتی

ہے حرکت بھی، رنگ بھی، آواز بھی، پہلے جذبات کے رنگوں کی تفصیل سنئے۔ جنسی جذبات کا رنگ سرخ اور گلابی، غصے کا سیاہی مائل سرخ، لطیف محبت کا سنہری، خوف کا پیلا اور سیاہ، روحانیت کا نیلا، شفقت کا سبز، حسد کا گہرا پیلا اور جذبہ عداوت کا سرخ و سیاہ رنگ ہوتا ہے۔ جذبات کے کیا کیا اور کتنے رنگ ہیں۔ ان کی تفصیل ادب اور دیومالا میں بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح جذبات کی آوازیں بھی ہوتی ہیں، خوف کی آواز ہے محبت کی آواز اور بہادری کا لہجہ کچھ اور ہے، بزدلی کا پیرایہ بیان کچھ اور، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ عداوت کی زبان اور اخلاص کی زبان ایک ہو خیالات رنگ کی طرح آواز بھی رکھتے ہیں۔ خالی مکانوں کے سنائے اور اداس جنگلوں کی سائیں سائیں کیا ہے؟ خیال کی آواز؟ مگر کیا خیالات کے رنگ اور آواز کو سنا جاسکتا ہے؟ جی ہاں۔ ہم دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ طیف نما آکے اسپیکوریم کے ذریعے سورج کی شعاعوں کے رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسپیکوریم کی سطح پر شمسی شعاعوں کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں ان کے کنارے پر بنفشی اور سرخ رنگ کا حاشیہ پایا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کے نیچے ایک اور رنگ ہوتا ہے جو طیف نما پر نظر نہیں آتا، اسے بائیں سرخ (انفراریڈ) کہتے ہیں۔ اسی طرح بنفشی رنگ کے اوپر بھی ایک غیر مرئی دکھائی دینے والا رنگ ہوتا ہے جو بالائے بنفشی (الٹرا وائلٹ) کہلاتا ہے دوسرے رنگوں کی طرح پائیں سرخ اور بالائے سرخ اور بالائے بنفشی رنگ بھی سورج کی کرنوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں ان دونوں رنگین شعاعوں کو محسوس اور دریافت کرنے کے لئے خاص قسم کے آلے ایجاد ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ان شعاعوں کے ارتعاش کی تعداد یا دائرۃ موج..... (FREQUENCY) دوسری شعاعوں سے مختلف ہے۔ یہی حال ریڈیو کی امواج صوت یعنی آوازوں کی لہروں کا ہے ہر آواز ایک خاص قسم کے طول موج پر سنی جاسکتی ہے۔ آپ روزانہ ریڈیو سنتے ہیں کہ وہ خبریں فلاں میٹر بینڈ پر نشر کی جارہی ہیں۔ ریڈیو سیٹ کے ڈائل پر جو نمبر پڑے ہوئے ہیں وہ مختلف طول موج اور فریکوئنسی کی علامت ہیں، ہر رنگ اور ہر آواز کی فریکوئنسی مختلف ہے

خیالات کے رنگوں کی اور آواز کی کیفیت بھی یہی ہے۔ ذہن میں وسعت اور وہ فریکوئنسی پیدا کر لیجئے جو خیالات کے رنگوں اور آوازوں کو دیکھ اور سن سکے۔ جو نہیں آپ کے اندر یہ استعداد پیدا ہوئی اشیاء اور افراد کی روحوں کے دروازے آپ کے لئے کھل جائیں گے اور جن حقیقتوں کو لوگ "حقائق غیب" تصور کرتے ہیں وہ روزمرہ کے عام تجربوں کی طرح آپ کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے مگر بہتر یہ ہے کہ دوسروں کے مطالعہ ضمیر و نفس سے پہلے ہم اپنا مطالعہ کریں اپنے خیالات کی رفتار سے واقف ہوں، اپنی روح کی آوازیں سنیں، اپنی تحلیل نفسی کریں، کیونکہ اپنی تحلیل نفسی کے بغیر دوسرے تو دوسرے ہم خود اپنے کو نہیں سمجھ سکتے نہیں جان سکتے۔

☆☆☆

پر رحم فرما۔۔۔۔۔ آمین

ذاتی تحلیل نفسی

جب آپ سوچتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟ سوچنے کا عمل کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے؟ جب ہم سوچتے ہیں تو اپنی پوری توجہ مبذول کر کے حافظے کے خزانے سے دہی ہوئی یادوں کو برآمد کرتے ہیں جو یادداشتیں مطلوب ہوتی ہیں انہیں استعمال میں لاتے ہیں جو ضرورت کے مطابق نہیں ہوتیں انہیں مسترد کر دیتے ہیں، سوچنے کا عمل اسی طرح ظہور پذیر ہوتا ہے۔ شعور کسی عندیے (IDEA) کا خالق نہیں۔ صرف اس کو استعمال کرنے کی حیثیت رکھتا ہے یہ صرف وہ مواد استعمال کرتا ہے جو اُسے لاشعور کی طرف ودیعت کیا جائے۔ اس مواد کے استعمال سے اچھا نتیجہ نکلتا ہے یا بُرا؟ اس کا انحصار صحیح یا غلط فیصلے پر ہے اور صحیح یا غلط فیصلے کا انحصار شعور پر ہے۔ شعور کا کام صرف یہ ہے کہ لاشعور کے مہیا کئے ہوئے مواد کو عمدگی اور قاعدے کے استعمال کرے ہم سوچ بچار کا عمل شروع کرتے ہیں تو اپنی توجہ عندیوں کے چند مجموعوں کی طرف مبذول کر دیتے ہیں اُن میں عندیوں (تصورات و ذہنی تجربات اور خواہشات) کا جو مجموعہ ہماری ضروریات کے مطابق ہوتا ہے اُسے چن لیتے ہیں۔ ظاہر ہے عندیوں اور یادداشتوں کے مجموعے لاشعور سے آتے ہیں لاشعور کے متعلق فرض کیا جاتا ہے (خود لاشعور بھی تو ایک مفروضہ ہی ہے) کہ وہ تمام یادوں کا گودام ہے۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟ یہ معنی ہوئے کہ آپ کا ذہنی وجود صرف استدلال کا رہن منت ہے۔ نہیں، بلکہ اس بات کا رہن منت کہ شعور بہترین قوت فیصلہ کے ساتھ لاشعور سے حاصل کئے ہوئے مواد کو کس طرح استعمال کرتا ہے اصل سوال ذہنی اور لاشعوری مواد کے بہترین استعمال کا ہے عمل میکائیکی حیثیت رکھتا

ہے۔ جس طرح ایک فلسفی، سوچ بچار یا فکر خیال کا عمل شروع کرتا ہے۔ اسی طرح ایک ناخواندہ آدمی بھی نحو خیال ہوتا ہے۔ ذہنی استعداد و طریقہ ہائے کار پر منحصر ادراک (PERCEPTION) اور انعکاس (REFLECTION) پر ہر وہ علم، جو ذہن میں داخل ہو ادراک کہلاتا ہے اور انعکاس یہ ہے کہ حواس خمسہ (دیکھنا، سونگھنا، سنا، چکھنا، چھونا) کے ذریعے جو معلومات ذہن میں داخل ہوں اُن سے مناسب کام لیا جائے۔ ہم سوچ بچار کے بعد ہزاروں لاکھوں تجربوں کو بھول جاتے ہیں لیکن وہ بھلائے نہیں جاتے۔ بلکہ ذہن کے تحتی گودام یا حافظے میں تہہ در تہہ جمع رہتے ہیں۔ جب ذہن کو نیا تجربہ ہوتا ہے تو لاشعور میں اس سے ملنے جلتے تجربات کو حرکت میں لے آتا ہے مثلاً کسی ہوائی حادثے کی خبر سن کر بے اختیار اسی قسم کے حوادث کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے، خیال کی بے شمار قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جسے خیالات پریشاں یا واہمہ طرازی (PHANTASY) کہتے ہیں۔ واہمہ طرازی میں ہوتا یہ ہے کہ لاشعور میں جمع شدہ تجربات اور یادداشتوں کی جانب توجہ مبذول کرنے کی بجائے ہم پسندیدہ تصورات کا سلسلہ تخیل شروع کر دیتے ہیں تاکہ ہماری تخیل کی عین حقیقتوں سے فرار نصیب ہو۔ خیال (سوچ بچار کے عمل) کی ایک صورت یہ ہے کہ توجہ کسی خاص نقطے پر مرکوز کرنے کے بجائے ان خیالات اور تصورات کا مطالعہ کیا جائے جو تیزی کے ساتھ ذہن کی سطح سے گزر رہے ہیں۔ خیالات کے آزاد تلازمہ (FREE ASSOCIATES OF IDEA) کو جانچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے، تلازم خیال کی آزادی کے لئے ضروری ہے کہ شعور کی مداخلت کے بغیر روک ٹوک، تخیلات، تصورات اور احساسات کی ندی کو بہنے دیا جائے۔ ہر خیال اور مجموعہ خیال کی جڑ کو لاشعور میں تلاش کرنا چاہئے۔ اگر سوچ بچار کرتے ہوئے آزادی تخیل، استدلال، منطق، فیصلے یا عقل سے کام لینے کی کوشش کی جائے گی تو آزاد تلازمات کا خود بخود سلسلہ وجود میں نہ آسکے گا آزاد تلازم کا خیال قانون ہی ہے کہ ایک مجموعہ خیالات خود بخود لاشعور سے ابھر کر شعور میں داخل ہو جاتا

ہے اور اس طرح ہم رنگ اور ایک دوسرے سے مناسبت اور مشابہت رکھنے والے خیالات کے قافلوں کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔ اس عمل میں (آزاد تلازمات خیال کا مطالعہ) شعور و استدلال کی حیثیت خاموش تماشا کی ٹکی سی ہوتی ہے ہر وہ خیال جو لاشعور سے اُٹھ کر شعور میں آتا ہے یا تو کسی اندرونی تاثر سے ابھرتا ہے یا پھر کسی بیرونی تحریک سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی بیجان انگیز تصور یا عندیے کو شعور میں لائیں اور پھر چپ چاپ بیٹھ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس بیجان انگیز تصورات سے ملتے جلتے تصورات خود بخود ذہن میں اُٹھنے لگے اس آزاد سلسلہ تخیل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حافظے میں دبی ہوئی کوئی اہم یادداشت، یا نفس کے اندر دبکا ہوا کوئی خطرناک چور آپ کے ہاتھ لگ جائے۔ شرط یہ ہے کہ خیال و تصور کے آزاد تلازمات کی رو ارادے یا دلیل کی طاقت سے روکنے کی کوشش نہ کی جائے آزاد تلازم خیال کے عمل سے سمجھنے کی چیز یہ ہے کہ آخر وہ کیا طریق کار ہے جو شعوری عمل کو لاشعور بیجان کے تحت لاتا ہے۔ اگر اس طریق کار کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جائے تو شعوری شخصیت کو از سر نو تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ نفسیات میں شعور ہرگز ذہانت اور سمجھ داری کو نہیں کہتے بلکہ ذہن کی اس حالت کو کہتے ہیں جب غنودگی اور نیم خوابی میں۔ بلکہ کامل بیداری کے عالم میں۔ خیالات کی ایک مستقیم اور مسلسل رد و درمیان میں نوئے بغیر ذہن کی سطح سے گزرے اس کو تجربات کا دھارا (STREAM OF EXPERIENCES) بھی کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سلسلہ خیال، مربوط، منظم اور باقاعدہ ہی ہو، غیر مربوط، غیر منظم اور بے ضابطہ بھی ہو سکتا ہے ضرورت صرف یہ ہے کہ شعور میں تصورات تجربات اور یادداشتوں کا ایک سلسلہ موجود ہو، عالم شعور میں ہونے کی بنیادی شرط یہی ہے! تحلیل نفسی کے سلسلے میں آزاد تلازمہ خیال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ذہن میں آزاد تلازمہ خیال کی رو پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ ایسا لفظ، ایسا نام یا ایسا اشارہ اور استعارہ منتخب کیا جائے۔ جس کے لئے آپ یہ مشق کر رہے ہیں ایسا لفظ یا استعارہ، اس سے متعلق تمام تصورات و

جذبات کو ابھار دے گا اور تلازمہ خیال کی یہ رد و ذہن میں دبے ہوئے سلسلہ خیالات کو ابھار دے گی اگر کسی عاشق کے سامنے لیلیٰ کا نام لیا جائے تو اس کے ذہن میں بے ساختہ اپنی محبوبہ کی یاد تازہ ہو جائے گی، گویا لیلیٰ کا لفظ اس کے ذہن میں تصورات اور جذبات کے ایک وسیع نظام کو حرکت میں لے آئے گا، آزاد تلازمہ خیال کی رد و ذہن میں بعض اوقات ایک لمحے کے لئے ذہن ٹھہر سا جاتا ہے۔ کوئی بات یاد نہیں آتی، کوئی جواب نہیں سوچتا، خیال کی کوئی لہر پیدا نہیں ہوتی۔ سلسلہ خیال کا یہ ٹھہراؤ کسی لاشعوری رکاوٹ کا پتہ دیتا ہے تحلیل نفسی کے دوران میں ذہن کا یہ سادہ نقطہ (BLANK SPOT) معالج نفسیات کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ذاتی تحلیل نفسی کا طریقہ یہ ہے کہ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ لیٹ جائے اور ذہن کو بالکل آزاد و مطلق العنان کر کے خیالات کے دھارے کو آزادی کے ساتھ بہنے دیجئے۔ بیداری کے ہر لمحے میں خیالات کی جو رد و آزادی کے ساتھ بہتی رہتی ہے اگر اس کے راستے میں ارادے کی قوت سے کوئی بند نہ باندھا جائے کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کی جائے، تو وہ ہم رنگ خیالات اور مشابہ تلازمات کے ساتھ بہتی رہے گی۔ جب بھی اور جہاں بھی سوچ خیال کی روانی میں ٹھہراؤ سا ہونے لگے۔ سمجھ لیجئے کہ وہاں لاشعور میں دبی ہوئی کسی دردناک یاد کا گرداب واقع ہے۔ آزادی تلازمہ خیال میں ذہن جب بھی اس لاشعوری بھنور (دردناک یاد) کے قریب پہنچے گا۔ دفاعی موقف اختیار کر لے گا۔ اس طرح "فری فلو آف ایسوسی ایشنز آف آئیڈیاز" یعنی تصور و تحلیل کے خود مختار اور خود کار تلازمات کی راہ کسی حد تک مسدود ہو جائے گی اور سادہ نقطہ (بلینک پوائنٹ) وجود میں آجائے گا۔ بے روک ٹوک موج خیال کے بہاؤ میں استدلال، منطق اور آزادی توجہ کو کسی طرح داخل نہ ہونے دینا چاہئے۔ ذہن جس طرح سوچ رہا ہے ایک کے بعد خود بخود دوسری سوچ پھر تیسری پھر چوتھی۔ اسے اسی طرح سوچنے دینا چاہئے۔ آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ کوئی طبع زاد کہانی لکھیں۔ خواہ وہ کسی عہد کی، کسی معیار کی، کسی طرز کی، کسی اسلوب کی ہو، اس کا تعلق جن

بھوت، پری سے ہو یا انسانوں سے! عالم ارواح سے ہو یا عالم اجسام سے! امر دوں سے ہو یا زندوں سے! نادیدہ دنیا سے ہو یا دیدہ دنیا سے! آپ فرمائش کے مطابق کہانی لکھتے ہیں اب اگر اس کہانی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کہانی ہر جزو ہر جملہ، ہر بیان ہر واقعے کا تعلق، آپ کی کسی فراموش شدہ یادداشت یا کسی بھولے ہوئے ذہنی تجربے سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شعور کسی تجربے کو پیدا نہیں کرتا بلکہ لاشعور میں دبی ہوئی یادوں کو استعمال کرتا ہے۔

☆☆☆

تعبیر خواب

تحلیل نفسی، خواب کے اجزاء کی چھان بین سے بھی ممکن ہے آپ جو خواب دیکھیں اسے فوراً لکھ لیں۔ خواب کا قاعدہ یہ ہے کہ فوراً ہی وہ ذہن سے اتر جاتا ہے۔ اس لئے خواب کو قلم بند کرنے میں دیر نہ کرنی چاہئے۔ اگر فوراً ہی اجزاء خواب کو ضبط تحریر میں نہ لایا جائے تو اجزاء خواب کچھ دیر بعد دھندلے ہو کر غائب ہو جاتے ہیں، جاگتے ہیں خواب کا جو اور جتنا حصہ یاد آئے اس کو لکھ لیجئے پھر تہائی میں بیٹھ کر اس خواب کے ہر جزو اور ہر واقعے سے آزاد تلازمہ خیالات کا سلسلہ شروع کیجئے مثلاً خواب دیکھا کہ میں پہاڑ پر چڑھ رہا ہوں۔ اب تلازمہ خیالات کا سلسلہ شروع کیجئے سکہ پہاڑ کے لفظ سے ذہن میں جتنے خیالات آئیں، غشی یادیں ابھریں، جو تصورات پیدا ہوں۔ ذہن جیسے کیسے سوچ بچار کرے، اس سب کو لکھتے جائیے تا آن کہ آخر میں لاشعور کی وہ غرض و غایت واضح ہو جائے گی جو اس خواب کے پیچھے کارفرما ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد تلازمہ خیالات کے ذریعے خواب کے اسرار اور اس کے پوشیدہ مقاصد کو معلوم کرنے میں وقت ہو۔ اس صورت میں ہمت نہ ہاریے اور ایک مرتبہ پھر آرام سے لیٹ کر یا بیٹھ کر خواب کے کسی جزو سے آزادانہ فکر و خیال کا سلسلہ شروع کر دیجئے۔ رفتہ رفتہ اس چھان بین کے نتیجے میں خواب کی تہہ (جو ہمیشہ لاشعور میں مخفی ہوتی ہے) تک پہنچ جائیں گے۔ ہر خواب کا منبع (STIMULI) پچھلے دن یعنی خواب سے پہلے دن کے تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ آج ہم کو خواب دیکھتے ہیں یقین کیجئے کہ اس کی جڑیں کسی پچھلے پہچان انگیز ذہنی تجربے میں دفن ہیں۔ یہ خواب کا بنیادی قانون ہے جس سے انحراف ممکن نہیں۔

اجزاء خواب کی تحلیل کے ساتھ ان واقعات پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے جو ماضی قریب (24-48 گھنٹے پہلے) میں پیش آچکے ہیں کیونکہ یہ بات طے ہے کہ خواب کا تانا بانا بیداری کے قریبی وقفے کے واقعات کے مواد سے ہی بنتا ہے۔ خواب کی تحلیل یعنی خواب سازی میں دو اصول اور بھی کارفرما رہتے ہیں۔ پہلا اصول ہے تکثیف یعنی (CONDENSATION) اور دوسرا اصول ہے (DISPLACEMENT) یا اجزائے خواب کی بے ترتیبی، ایک جزو کا دوسرے جزو کی جگہ لے لینا! آپ خواب دیکھتے ہیں کہ کسی پرانے دوست سے ملاقات ہوئی ہے۔ چہرہ تو وہی ہے جس سے آپ مانوس ہیں لیکن واٹھی سکھوں جیسی ہے۔ لباس انگریزی ہے، سر پر مارواڑیوں جیسی پگڑی بندھی ہے اور ٹانگوں کی بجائے بال و پر نظر آئیں۔ دیکھا آپ نے کس طرح قانون تکثیف نے خواب میں اس شخص کا حلیہ تبدیل کر دیا۔ گو یہاں ”ڈس پلیس منٹ“ کا قانون کارفرما ہوگا۔ اس خواب میں ٹانگوں کی جگہ دوسری چیز نے لے لی۔ تحلیل خواب کا راز یہ ہے کہ اجزائے خواب کو اتنے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ پھر کوئی چیز قابل تقسیم نہ رہے۔ جسے آپ کسی خواب کی تحلیل اور تجزیے کے لئے نہیں تو اس کے معنی مواد اور مفہوم پر ارادنا غور نہ کیجئے بلکہ خواب کے کسی جزو کو سامنے رکھ کر، سعی و قصد کئے بغیر، آزاد تلازمہ خیال کا سلسلہ شروع کر دیجئے مثلاً خواب کا ایک جزو دریا ہے۔ دریا کے لفظ کو سامنے رکھئے۔ اور ذہن میں خود بخود خیالات، تصورات اور یادوں کے جتنے سلسلے پیدا ہوں ان کو قلم بند کرنا شروع کر دیجئے تحلیل خواب کے عمل میں ذہن کو بالکل بے مہار اور آزاد ہونا چاہئے۔ آخر کار رواں تحلیل، لاشعور کے اس نقطے پر پہنچ جائے گا۔ جو تعمیر خواب میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر خواب کے پس پشت کوئی نہ کوئی تمنا، کوئی نہ کوئی خوف اور کوئی نہ کوئی خواہش کارفرما ہوئی ہے۔ ہر خواب کا مرکزی کردار خواب دیکھنے والے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ خواب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ لاشعور میں دبی ہوئی خواہشوں اور تمناؤں کا ڈرامائی اظہار ہے اور بس، اگر خواب کا کوئی جزو اور کوئی عقدہ

تحلیل اور تجزیے کی کوشش کے باوجود نہ سلجھ سکے تو سمجھ جائیے کہ خیالات کی اوپری رد اس قدر تیز رفتار اور طوفانی ہے کہ اندرونی لہر کو نہیں ابھرنے دیتی۔ مختصر یہ ہے کہ خواب نفس کی مخفی خواہشوں و ہمتوں اور شخصیت کی جذباتی کمزوریوں کے ڈرامائی اظہار کو کہتے ہیں۔ کوئی خواب بظاہر کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو بے معنی نہیں ہوتا اور جب تحلیل خواب کے ذریعے اس کے مخفی مفہوم کو دریافت کر لیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے اس کا مخفی مفہوم انسانی شخصیت کی تعمیر یا تخریب کے سلسلے میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

مرچو
آمین

نفس کا محافظ خانہ

ہماری شخصیت کے بہترین اصول وہ ہیں جنہیں ہم نے ماضی کے صحت مند تجربوں کی روشنی میں بنایا ہے اور بدترین پہلو وہ جنہیں لاشعور نے ناپسندیدہ رجحانات اور تکلیف دہ یادوں کی شکل میں تصنیف کیا ہے، لوگ روحانی کرب اور ذہنی تکلیف سے بچنے کے لئے ناپسندیدہ یادوں کو لاشعور یا نفس کے محافظ خانے میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ذہن کے بھوت اور خوفناک یادوں کے الف لیلائی ہیں ہمیشہ کے لئے بوجھل میں بند ہو گئے۔ لیکن یہ آستین کے سانپ اور سپو لپے بار بار پھنکار کر مار مار کر اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے اور چپکے چپکے انسانی شخصیت کو ڈستے رہتے ہیں۔ اگر لاشعور میں دے ہوئے خطرناک جذبوں پر شعور عمل ارتقاع (SUBLIMATION) نہ کرتا رہے تو یہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں عمل ارتقاع کہتے ہیں کسی ناپسندیدہ جذبے اور کسی حشری خواہش کو تعمیری خواہش کا رنگ روپ دے دینا بہت سے لوگ شعور اور ضمیر کے اخلاقی تقاضوں سے مجبور ہو کر بہترین جذبات اور خواہشات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ زبانی ہوتا ہے۔ آپ کے ہاتھ سے کسی شخص کو تکلیف پہنچتی ہے آپ معاف کیجئے کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن ”معاف کیجئے“ کہنے سے مسئلہ نہیں حل ہوتا۔ کیونکہ معافی طلبی کا یہ انداز بالکل رسی اور روایتی ہے۔ جب تک ذہنی تبدیلی پیدا نہ ہو۔ اخلاق اور اخلاص کی ظاہر داریاں بیکار ہیں۔ ہمیں شعوری طور پر نہیں لاشعوری طور پر اچھا آدمی بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ حقیقی گرم جوشی، سچی محبت، کھری دوستی اور بے غرض خدمت اور ریاکاری و تصنع کے درمیان وہی فرق ہے جو کھرے اور کھولے سکے اور اصلی اور نقلی موتی کے

درمیان ہوتا ہے۔ نفرت اور محبت لگاؤ کے ایک جذبے کے دو رخ ہیں اگر ہم نفرت کے جذبے کو عمل ارتقاع (یعنی ستوار نے نکھارنے اور نچوڑ کر پاک صاف کرنے) کے ذریعے محبت کے جذبے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم کسی ناپسندیدہ رجحان کو ناپسندیدہ رجحان میں منتقل کرنے کے خواہش مند ہیں تو اس کے لئے ہمیں غلوں سے کوشش کرنی پڑے گی اور بار بار اپنی تحلیل نفسی کر کے یہ دیکھنا اور جانچنا پڑے گا کہ ہم فی الواقع نفرت کے جذبے پر غالب آکر محبت کے رجحان کو قوی کر چکے ہیں اگر یہ محسوس ہو کہ ابھی تک سینے میں نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں تو انہیں زبردستی بجھانے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ وہ بھڑک اٹھیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ حسد و نفرت کو ان کی طبعی موت مرنے دیں۔ آخر ایک وقت آئے گا ان منفی جذبات کی شدت خود بخود کم ہو جائے گی۔ آپ اپنے دل سے حالات کا جائزہ لے کر، کامن سنس کے پیش نظر تخریبی پہلو کے بجائے تعمیری انداز نظر سے سوچنے کے قابل ہو جائیں۔ مثلاً کسی دوست سے آپ کو تکلیف پہنچی اور اس کے خلاف آپ کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ کوشش کیجئے کہ نرمی اور خوش دلی سے وہ گرہ کھل جائے وہ گتھی سلجھ جائے۔ اگر آپ محسوس کریں کہ فی الحال آپ اس گرہ کو کھولنے کے قابل نہیں، آپ کے اندر غم و درگزر کا اتنا مادہ موجود نہیں کہ خوش دلی سے اس دوست کا قصور بخش سکیں تو بناوٹ سے کام لے کر غم و درگزر کا مظاہرہ نہ کیجئے بلکہ علی الاعلان اقرار کر لیجئے کہ فی الحال دوست کی طرف سے آپ کا دل صاف نہیں ہے، اس اعلان پر اعتراف سے خود آپ کو کافی سکون قلب حاصل ہوگا اور منافقت برتنے (ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور) سے خود اپنے اوپر جو تکلیف گزرتی ہے، آپ اس سے بچ جائیں گے۔ رفتہ رفتہ خود آپ کا ضمیر عمل ارتقاع کے ذریعے۔ لاگ کو لگاؤ اور دوری کو قربت کے احساس میں منتقل کر دے گا۔ کسی منفی جذبے کو اخلاق اور مصلحت شعور میں چھپانے کی کوشش نہ کرنی چاہئے بلکہ ہمیشہ شعور کی روشنی میں رکھنا چاہئے تاکہ ذہن آزادی کے ساتھ اس پر عمل ارتقاع کر سکے۔ اہم یہ کوشش بھی نہ ہونی چاہئے کہ منفی جذبات کو ہمیشہ

یاد رکھا جائے۔ کسی ناپسندیدہ رجحان کو نہ دانستہ بھلائیے، نہ دانستہ یاد کیجئے بلکہ اُسے مجہول اور مفلوج حالت میں ذہن کے اندر چھوڑ دیجئے۔ اس طرح اس ناپسندیدہ جذبے یا منفی رجحان کی قوت خود دوسرے احساسات (جن سے ذہن ہر وقت دوچار رہتا ہے) سے ٹکرا کر ختم ہو جائے گی، ورنہ دہی ہوئی جذباتی توانائی کسی وقت بھی اُبل کر اخلاقی شخصیت کے ٹکڑے اڑا سکتی ہے بچپن سے اب تک ہم نے کتنے رجحانات کو جن کا اظہار سماجی اور اخلاقی اقدار کی بناء پر ممکن نہیں۔ نفس کی فحشی تہہ کے قبرستان میں دفن کر کے انہیں شعوری طور پر استعمالی مصرف DISPERSION سے محروم کر دیا ہے۔ اگر ان جذباتی قوتوں کو مدفون نہ کر دیا جاتا اور یہ شعوری سطح پر قابل حصول رہتیں تو کبھی کی فتنہ ہو چکی ہوتیں۔ لاشعور کی دنیا میں وہ ابھی تک زندہ اور آپ کی شخصیت کے لئے مستقل چیلنج بنی ہوئی ہیں۔ آپ نے بارہا محسوس کیا ہوگا کسی ظاہری سبب کے بغیر آپ تھکے ہوئے، جھنجھلائے ہوئے اور مکان زدہ ہیں۔ سوچتے ہیں تو اس تھکاوٹ، جھنجھلاہٹ اور مکان کا کوئی بیرونی سبب معلوم نہیں ہوتا البتہ باطنی سبب موجود ہے یعنی لاشعور میں دہی ہوئی کسی جذباتی قوت کا فشار خواب میں بھی دہی ہوئی دردناک یادیں طرح طرح کے روپ بدل کر ظاہر ہوتی ہیں بیداری کے عالم میں شعور کا محاسب ان اندرونی بیانات کو دبائے رکھتا ہے۔ اوتھ ظاہری ہونے کے بعد اس محاسب کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور لاشعور میں ہلچل سی مچ جاتی ہے آپ کے خواب کیا ہیں؟ زندہ درگور احساسات کے بھوت! جو لاشعور کے مرگھٹ سے اُڑ کر شعور کی سطح پر آ جاتے ہیں اور آپ کو خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ دنیا میں وہ کون سا با شعور انسان ہوگا جو اپنے حقیقی حیوانی جذبات اور جبلی تقاضوں کو جوں کا توں دوسرے کے سامنے بیان کر دے۔ مثلاً اگر وہ حسد میں مبتلا ہے کسی سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ کسی سے انتقام لینا چاہتا ہے کسی سے احساس کمتری کی حد تک مرعوب ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ یہ عالم و حواس اپنی ان کیفیتوں کا اظہار کر دے۔ جو لوگ اس کی جرأت کرتے ہیں وہ معاشرے کی نظر سے جاتے ہیں اگر

کوئی دوست بیمار ہے تو آپ ہرگز اس سے نہیں کہہ سکتے کہ بھی! اب خدا کے لئے جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ، ربی تمہاری جوان اور خوب صورت بیوی تو اس کی حفاظت کو میں تیار ہوں۔ ہر شخص ایسے رجحانات کو دبائے اور چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ جنہیں معاشرے کی تصدیق اور سوسائٹی کی منظوری حاصل نہیں۔ یہی دبے اور چھپے ہوئے رجحانات کبھی کبھی خیالات پریشاں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ کبھی پر پچ خوابوں کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی جسم کو مضطرب کر کے اعصابی بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں ان سے بچنے کا واحد حل یہ ہے کہ ان کا رخ تبدیل کر دیا جائے۔ ان اندرونی بلاؤں سے غٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ یا تو عمل ارتقا کے ذریعے ان کی تحریمی قوت کو تعمیری قوت میں تبدیل کر دیا جائے یا انہیں شعوری سطح پر رکھ کر کمزور کر دیا جائے۔ جذبات کو دہانے (REPRESSION) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دبائے جانے والے اور دبائے جانے والے کے تصورات کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اگر دبائے والی جذباتی شخصیت مضبوط ہے تو شخصیت کا مرکزی ڈھانچہ کسی نہ کسی حد تک برقرار رہے گا، اگر صورت حال برعکس ہے یعنی دبائے جانے والے جذبات طاقت ور ہیں تو زبردست نفسیاتی پیچیدگیاں، ذہنی اختلال اور جذباتی بحران سے مقابلہ کرنا پڑے گا یہیں سے ان جان لیوا ذہنی بیماریوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ جو نفس اور جسم دونوں کو تباہ کر دیتی ہیں اگر ناپسندیدہ اور منفی رجحانات کا ارتقا نہ کیا جاسکے تو فطرت (RASFORMATION) کر کے ان پر قلب ماہیت کا عمل کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

جب پودوں پر پھول کھلنے اور بیڑوں میں پھل لگنے کا زمانہ آتا ہے تو درخت کی رگ رگ اور نفس نفس میں زندگی، توانائی اور تازگی کی نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ پودوں کی صورت بدلنے لگتی ہے۔ بیڑوں کا حلیہ تبدیل ہونے لگتا ہے۔ موسم بہار کی اس کیفیت کے بعد خزاں کا مختصر دور آتا ہے۔ ٹہنیوں پر پتے زرد پڑ کر جھڑنے اور شاخیں ست پڑنے لگتی ہیں جب ایک درخت پر اپنے پرانے سازد سامان سے تہی دست ہو جاتا ہے تو فطرت کی طرف سے اسے نیا لباس، نیا حلیہ، نئی صورت اور نیا رنگ روپ عطا کیا جاتا ہے پھر درخت کی جوانی شروع ہو جاتی ہے۔ موسم بہار سے قبل خزاں کے وقفے میں پھولوں، ٹہنیوں، پتوں اور درخت کی جڑوں پر کیا گزرتا ہوگا۔ وہ پت جھڑ کے زمانے میں کس کرب سے گزرتے ہوں گے۔ اس کا مشاہدہ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ ہم ان آلات سے محروم ہیں جن کے ذریعہ درختوں کی روحانی کیفیات کا تجربہ کیا جاسکے۔ البتہ تصور کیا جاسکتا ہے بہار و خزاں کے وقفے میں عالم نباتات کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ اس عالم کو سمجھنے اور اس حال کا تجربہ کرنے کے لئے نسل انسانی کے فہم والوں (نئی نسل) کا ذہنی مطالعہ ضروری ہے۔

نئی نسل کا کرب

پرانے زمانے کے دانش مندوں نے انسانی زندگی کو سات وقفوں اور دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ بچے کی عمر کے ابتدائی سات سال عہد نشوونما کا عہد ہے۔ ان ابتدائی سات سال میں وہ چلتا، بڑھتا اور پھلتا پھوٹتا ہے سات سال کے بعد دوسرے وقفے (سات سے چودہ سال تک کی عمر) میں اس کی نرم ہڈیوں اور آدھ کچے گوشت (جسم کے لوتھڑے) میں پختگی پیدا ہونا شروع ہوتی ہے یعنی عمر کے ابتدائی سات سال میں پلنے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا جو عمل شروع ہوا تھا اس میں استحکام نمودار ہوتا ہے۔ چودہ سے اکیس سال تک زمانہ بلوغ و تکمیل کا زمانہ ہے اور یہی وہ نازک دور ہے جو انسانی زندگی میں غیر معمولی اہمیت کا مالک ہے۔ زندگی کے ابتدائی چودہ سال میں جسم میں نشوونما کی قوتیں مسلسل سرگرم رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کے جسمانی نظام کے وہ غدد کام کرنا

شروع کر دیتے ہیں جن کا تعلق جنسی، شباب اور جذباتی بلوغ سے ہے۔ سات سال کے بعد لڑکے اور لڑکی کے جسم میں واضح تبدیلیاں ہی نمودار نہیں ہوتیں (ان تبدیلیوں کا تعلق غدودی عمل سے ہے) بلکہ ذہن پر بھی نئے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ دماغ، گلے اور جسم کے دوسرے غددوں کے سرگرم عمل ہو جانے سے خون میں نئی حرارت، نئی آتشیں لہر اور نئی توانائی دوڑ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ عمر کے اس حصے میں بے اختیار دوڑنے، بھاگنے، اچھلنے، کودنے، ہنسنے، بولنے اور لڑنے بھڑنے کو جی چاہتا ہے یہ معاملہ صرف جسمانی حرکات تک ہی محدود نہیں جسمانی بلوغ کے ساتھ ذہنی بلوغ کا عمل بھی اسی تیزی سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے (جب غددوں میں حرکت اور خون میں گرمی پیدا ہو جانے کے سبب) ذہن پر نئے تصورات نئے جذبات اور نئی خواہش دھاوا کرتی ہے۔ یہ تصورات، جذبات اور یہ خواہش اتنی نئی انوکھی اور چونکا دینے والی ہوتی ہے کہ لڑکا یا لڑکی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ دس بارہ سال تک لڑکے اور لڑکی اپنے گھر کے ماحول سے ہم آہنگ اور بزرگان خاندان کے زیر اثر رہتے ہیں وہ اپنے والدین کی ہر ہدایت کو بے چون چراں تسلیم کر لیتے ہیں، ان کے ذہن میں بغاوت، انحراف اور جدت پسندی کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہوتا لیکن جب شباب کی طوفانی لہریں ان کے ذہن کے ساحل سے ٹکراتی ہیں (اور یہ سلسلہ سات سال کے بعد ہی بتدریج شروع ہو جاتا ہے) تو نئی نسل اسی کرب، اسی اضطراب اور اسی تلاطم سے دوچار ہوتی ہے۔ جس کا مشاہدہ بیڑوں اور درختوں کی تبدیلی احوال میں ہوتا ہے۔ یعنی پہلے پت جھڑ کا یہ دور، پھر برہنہ شاخوں پر نئی کونپلوں اور ویران ٹہنیوں پر نئی کلیوں کا ظہور۔ میں نے اس سلسلہ میں ہزاروں لڑکوں لڑکیوں کے خطوط پڑھے ہیں، سب کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ کہ پہلے وہ نہایت سکون کی زندگی بسر کرتے تھے حافظہ خوب کام کرتا تھا جو پڑھتے تھے یاد ہو جاتا تھا۔ نیند اچھی طرح آتی تھی، بھوک کھل کر لگتی تھی۔ کسی قسم کی اندرونی بے چینی اور ذہنی اضطراب نہ تھا، وہ ماں باپ کی سعادت مند اولاد اور معاشرے میں پوری طرح رچے

ہے اور حالات سے مطمئن تھے۔ مگر اب نہ جانے کچھ روز سے کیا ہو گیا ہے کہ سکون قلب کی دولت نصیب نہیں، حافظہ غائب ہو گیا یا ہوتا جا رہا ہے پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ نیند نہیں آتی، بھوک نہیں لگتی، ڈراؤنے خواب آتے ہیں، وحشت ناک خیالات ستاتے ہیں، ایسی ایسی شرمناک خواہش گھیرے رہتی ہیں کہ روح لرز جاتی ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے اور سوچتے رہنے کو جی چاہتا ہے، ماں باپ کی ہر تاکید و ہدایت ناگوار لگتی ہے۔ نماز ترک کر دی ہے (عبادت میں جی نہیں لگتا) مذہب کے خلاف باغیانہ خیالات ذہن میں جمع رہتے ہیں یہ جی چاہتا ہے کہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر پھینک دوں، کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جاؤں۔ الغرض نئی نسل کے خطوط ایسی اندرونی بغاوتوں اور روحانی کشمکش کے بیانات سے لبریز ہوتے ہیں کہ ان کی گہرائی کا اندازہ صرف مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، اس کشمکش کا سبب وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی جسم کی بدحوتری کے ساتھ ذہنی بلوغ اور جنسی بیداری کا عمل۔

فاسد خیالات کا ہجوم

ممتاز جہاں (میری بیوی) لکھتی ہیں کہ بڑی صبح بیمار کے بعد قلم اٹھا کر آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت کی ہے چاہتی ہوں کہ خیالات زندگی سے روشناس کرا دوں۔ میری زندگی بالکل درمیانی ماحول میں گزری ہے جب میں گورنمنٹ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی تو خاصی تیز اور اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی مگر عجیب بات ہے کہ کبھی اسکول کے ماحول سے مانوس نہ ہو سکی، نہ لڑکوں سے بے تکلف ہوتی تھی، نہ ان کے ساتھ کھیلوں اور تفریحوں میں حصہ لیتی تھی، اس کی وجہ شاید امی جان کی یہ نصیحتیں تھیں کہ:

خبردار! زمانہ بہت نازک ہے کسی پر بھروسہ نہ کرنا اور میری اجازت کے بغیر کسی کو دوست نہ بنانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں معاشرے سے ڈر گئی، نہ کسی دوست کے گھر جاتی تھی نہ اسے اپنے گھر بلاتی (بہت سے درمیانی حالات کو نظر انداز کر کے) مختصر یہ ہے کہ اب میں ایک دفتر میں برسر روزگار ہوں۔ میری موجودہ کیفیت یہ ہے کہ نہ ادھر کی ہوں نہ

ادھر کی۔ میری عمر فی الحال انیس میں سال کے لگ بھگ ہے نوکری کو وقت کے تقاضوں کے سبب نبھاتی ہوں۔ والدین خوش نہیں تو مطمئن ہیں کہ ان کی لڑکی برسر روزگار ہے۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں کس اندرونی توڑ پھوڑ سے گزر رہی ہوں! (1) ہر وقت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتی ہوں، جب تک کام کاج میں مصروف ہوں ٹھیک ہے۔ ورنہ عجیب و غریب فاسد بے مقصد خیالات ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ نماز میں بھی شرمناک اور فاسد خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ (استغفار پڑھنے کے باوجود شیطان میرا پیچھا نہیں چھوڑتا) (2) موت سے زیادہ دوزخ کا خوف طاری رہتا ہے کسی تقریب میں جانا میرے لئے بے حد مشکل ہے کسی شخص سے سوال کا معقول جواب نہیں دے سکتی (3) اپنی شخصیت مکمل نہیں لگتی۔ کام کے دوران ایسا لگتا ہے کہ لڑکوں کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں (4) ہاتھوں کو کئی کئی بار صابن سے دھوتی ہوں، پھر بھی یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ہاتھ صاف و پاک نہیں ہوئے یہ تو ہوئے انیس میں سالہ ممتاز جہاں کے بیانات۔

اذیت ناک

اب احمد سالہ بچہ شریف (میرے بھائی کے طالب علم ہیں مشغلہ جاسوسی ناول پڑھتا) لکھتے ہیں (1) میرا پڑھائی میں جی نہیں لگتا، لیکن مجھے پڑھائی کا بے حد شوق ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہر شخص میری قدر و منزلت کرے (2) حافظہ خراب ہے (3) چنانچہ نرم سینے کا بے حد شوق ہے، اور اب سرفراز خاں (عمر میں سال) عیسائی خیل میانوالی کی کہانی سننے انہی کے الفاظ میں:

میرے محسن! 4 مارچ کو اپنی زندگی کی تیس منزلیں طے کر لوں گا۔ پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ حال یہ ہے کہ جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میری نقل و حرکت دیکھ رہا ہے، یا مجھ پر ہنس رہا ہے بازار سے گزرتے ہوئے مجھے وہم ہوتا ہے کہ لوگ میری فحاشیاں کر رہے ہیں، طنز کے تیر برسا رہے ہیں۔ اس وقت جسم میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوتی ہیں۔ بولتے وقت زبان

لڑکھڑانے اور قدم ڈمگانے لگتے ہیں۔ ذہن میں شدید قسم کا کچھاؤ پیدا ہو جاتا ہے دل کو تسلیاں دیتا ہوں کہ یہ سب تمہارا وہم ہے کوئی تم پر طعن نہیں کر رہا، کوئی نہیں ہنس رہا، لیکن دل نہیں مانتا، جی نہیں قبول کرتا، یہی حال کسی محفل اور تقریب میں جا کر یا ہوٹل میں قدم رکھ کر ہوتا ہے البتہ جب اس سوسائٹی (مجلس) میں بیٹھ جاتا ہوں تو گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اچھی طرح گفتگو کرتا ہوں پھر جب مجلس سے اٹھنے لگتا ہوں تو وہی حالت طاری ہو جاتی ہے محسوس ہوتا ہے کہ لوگ میرے پیچھے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اپنی اس حالت سے بعض وقت اتنا دل برداشتہ ہو جاتا ہوں کہ زندگی بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے آپ کے پاس بڑی آس اور امید لے کر حاضر ہوا ہوں، خدا را مجھے اس اذیت ناک حالت سے نجات دلائیے۔ میں زندگی بھر آپ کا ممنون احسان رہوں گا، اپنے متعلق اتنا اور بتا دوں کہ دبے پتلے جسم کا قبول صورت لڑکا ہوں۔ خوب صورت چہروں سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہوں احساس کسٹری کا سبب بھی یہی ہے۔ ان لوگوں کی حالت پر رشک کرتا ہوں۔ جو بیباک، مستقل مزاج اور حوصلہ مند ہوتے ہیں، مجھے کچھ ایسی ترغیبات بتا دیجئے کہ میں اپنی اس بے جا گھبراہٹ کو ختم کر کے بیباکی مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی کا مجموعہ اور مجسمہ بن سکوں، الغرض عجیب مشکل میں گرفتار ہوں، میری راہ نمائی کیجئے کہ کس طرح اس افسوسناک ذہنی حالت پر غالب آؤں؟

خودکشی کا ارادہ

شیم اختر (اسلام آباد) کو شکایت ہے کہ ان کے احساسات مردہ ہو گئے ہیں، لکھتی ہیں کہ ایف اے کی طالب ہوں مجھ پر بڑی ذمہ داری ہے، ذمہ داری یہ کہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کروں۔ مگر آہ! مجھ سے محنت نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ حصول علم کی انگ مرچکی ہے اس طرح مطمئن ہوں جیسے سب کچھ آتا ہے حالانکہ آتا جاتا کچھ بھی نہیں۔ میں نے بڑی انگ اور جوش و خروش سے داخلہ لیا تھا لیکن اب وہ جذبہ مرجھا چکا ہے۔ تعلیم میں قطعاً جی نہیں لگتا، امتحان ہو رہے ہیں اور ذرا فکر نہیں، فکر کرنا چاہتی ہوں

لیکن مردہ دلی کے ساتھ! ذرا سا احساس بھی اپنی بد نصیبی کا نہیں ہوتا، ہر دفعہ پڑھنے کا نام نہیں بناتی ہوں اور ناکام رہتی ہوں سوچتی ہوں کہ صبح اٹھ کر پڑھوں گی، صبح سویرے بستر سے اٹھ بھی جاتی ہوں۔ مگر کتاب اٹھانے کو جی نہیں چاہتا یقین کیجئے مجھے اپنے اوپر لاش ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ بڑی بہن بیمار ہوئیں، زندگی کی آس تک نہ رہی۔ میری ساری بہنیں اداس پریشان تھیں۔ رو رہی تھیں ایک میں تھی کہ پتھر بنی بیٹھی رہی۔ ہفتے بھر کی بات ہے میری امی جان اس قدر سخت بیمار ہوئیں کہ انہیں اسلام آباد کینک میں داخل کرانا پڑا۔ جب گھر اطلاع آئی تو میری بڑی بہن بہت روئی میں اس طرح مطمئن تھی جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ دسمبر کی جنگ چھڑی، اسکول کالج بند ہو گئے۔ ہم بھی گھر میں بیٹھ گئے، عام طور پر لڑکیاں جنگ سے بے حد ڈرتی ہیں ایک میں تھی جسے جنگ کی ذرا بھی پروا نہ تھی میں نے اس ہولناک زمانے میں کوئی ہول اور ہلچل محسوس نہ کی۔ حتیٰ کہ سائرن بجاتا تو (بمباری ہوتی) میں بے خوف بت کی طرح بیٹھی رہتی لڑکیاں بے حد حساس ہوا کرتی ہیں حیرت ہے کہ میری شدت احساس کو کیا ہوا؟ ہاں البتہ سقوطِ ڈھاکہ کی خبر سن کر چند آنسو ٹپکے تھے۔ پھر وہی بے بسی اور بے تکلفی! میں اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکی، اندر سے ٹوٹ چکی ہوں، زندگی سے حد درجہ بیزار ہوں۔ نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے اس دنیا میں نہیں ہوں، نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ جینے کا احساس تک ختم ہو گیا ہے، دل میں کوئی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی، کیا میں پاگل ہوں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میرے احساسات مردہ کیوں ہو گئے۔ میں ذہنی طور پر کیوں مر گئی؟ کیا یہ نفسیاتی مرض کی علامات ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے، جس کا انتظار ہے۔ بہر حال میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔

اہم پہلو

حافظ کو تازہ کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر ان لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنی کیفیتوں کے اہم پہلو کو سن لیجئے، کچھ لیجئے۔

ممتاز جہاں: عمر میں سال، گہری ذہنی کشش، فاسد خیالات اور شرمناک تصورات کا جہوم۔ موت سے زیادہ دوزخ کا خوف یہ تصور کہ لوگوں کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں، ناپاکی کا وہم۔

محمد شریف: عمر اٹھارہ سال، پڑھائی میں جی نہیں لگتا، حافظہ خراب ہے، یہ خواہش ہے کہ ہر شخص میری قدر و منزلت کرے۔

سرفراز خاں: عمر میں سال، یہ وہم کہ کوئی میری نقل و حرکت دیکھ رہا ہے۔ لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں طنز کے تیر برسا رہے ہیں، جسم میں سونیاں سی چبھنے کا احساس، ذہن میں شدید کھنچاؤ!

شیم اختر: احساسات مر گئے ہیں، خوف سے خوف نہیں لگتا، خوشی سے خوشی نہیں ہوتی، غم سے غم نہیں ہوتا، بت کی طرح پتھر بن گئی ہوں، خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے جب وقت آئے گا، جان کھودوں گی۔

اس مضمون میں دو لڑکیوں اور دو لڑکوں کے طویل خطوط کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے یہ کیا کیا کیفیتیں محسوس کرتے اور کرتی ہیں اس کا اعجاز ان کے بیانات سے ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پرانے زمانے کے دانش مندوں اور حکیموں نے زندگی کو سات سات سال کے متعدد ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ایک سال سے سات سال تک، سات سال سے چودہ سال تک، چودہ سال سے اکیس سال تک، وغیرہ وغیرہ۔ عمر کے ابتدائی سات سال نشوونما اور بڑھوتری کا زمانہ ہے۔ سات سال سے چودہ سال تک کے زمانے تک میں اس بڑھوتری نشوونما اور اٹھان میں پچھلی پیدا ہوتی ہیں اور دس بارہ سال کی عمر سے وہ جسمانی حدود کام کرنا شروع کرتے ہیں۔ جو لڑکی کو بھرپور عورت اور لڑکے کو مکمل مرد بنادیتے ہیں۔ یہ زمانہ سخت بیچانی اور یہ دور بے حد طوفانی ہوا کرتا ہے جسم اور نفس دونوں انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ مرد کی آواز بھاری اور لڑکی کی نرم اور پچھلی ہونے لگتی ہے، عورت کے جسم پر قوس، خطوط اور ابھار نمودار ہوتے ہیں اور مرد کی داڑھی

موٹھوں کا باغکودہ منظر طلوع ہوتا ہے کہ رعایت لفظی کا شعر یاد آیا، لاجول ولا قوت۔

جب تک خط صاف تھا تب تک جواب صاف تھا

اب تو خط آنے لگا۔ شاید کہ خط آنے لگے

اس بیچانی و طوفانی دور میں انسان کی تمام صلاحیتیں استعدادیں، قوتیں اپنا اظہار چاہتی ہیں۔ بھول دار پودوں میں کلیوں کا ٹکنا طبعی تقاضا ہے اس تقاضے کو دبا دینا ممکن نہیں۔ عمر کے تیسرے دور (چودہ سے اکیس) میں آدمی اپنی بھرپور شخصیت کو نمایاں کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعض جذباتی رکاوٹوں کے سبب شخصیت کے اظہار میں دشواری محسوس ہوتی ہے اور نوجوان طرح طرح کی ذہنی الجھنوں، خوف، وہم، احساس کمتری اپنے اوپر اعتماد نہ ہونا۔ اندرونی شرم گہرے احساس گناہ وغیرہ میں جتا ہو جاتا ہے۔ انہی سطور کی تحریر کے وقت ایک تندرست بیس سالہ لڑکا ظفر ملنے آیا۔ اس نے کہا کہ آج جب میرا افسر مجھ سے کچھ لکھوا رہا تھا تو مجھ پر یکا یک بدحواسی، گھبراہٹ اور شرم کا سادورہ پڑ گیا۔ ایسا لگا کہ سب لوگ مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں اور میری بدحواسی سے لفظ اٹھا رہے ہیں۔ کالوں کی لکڑیں گرم ہو گئیں، جسم میں حرارت سی دوڑ گئی۔ (سرفراز خاں عمر میں سال کا بیان یاد رکھیں کہ مجھے جسم میں سونیاں چبھتی محسوس ہوتی ہیں) میں نے پوچھا کہ تم کون کون سی مشقیں کرتے ہو۔

ظفر نے جواب دیا کہ

مشق نفس نور اور خود نویسی۔

ظفر میری تجویز کردہ یہ مشقیں مسلسل کر رہے ہیں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے نفس نور، خود نویسی اور نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کی دوسری مشقیں نفسیاتی صحت مندی، ذہنی بحالی، دماغی چستی اور اعصابی قوت کے لئے کی جاتی ہیں۔ ان مشقوں کو شروع کرتے ہی لاشعور مزاحمت شروع کر دیتا ہے یعنی اندر سے تقاضہ ابھرتا ہے کہ مشقیں بالکل ترک کر دی جائیں نفس مشقیں ترک کرنے کے ہزار ہا بہانے ڈھونڈتا

ہے بیسیوں عذر تراشنا ہے، ہر طرح کی حیلہ گری، سے کام لیتا ہے۔ لاشعوری کا ایک مزاحمت کا طریقہ یہ بھی ہے کہ جس وحشی الجھن (مثلاً خوف، بیزاری، گھبراہٹ) کو دور کرنے کے لئے مشق شروع کی جاتی ہے یکا یک اس کیفیت کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے ظفر کی تازہ مثال ہمارے سامنے ہے یہ احساس کمتری کے مریض ہیں دوسروں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے، مجمع میں گم مسم ہو جاتے ہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں۔ ان مشقوں (تخص نور اور خود نویسی) کو شروع کرنے کے ایک ہفتے بعد یکا یک اُن کی جذباتی کشش میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے ظفر سے کہا کہ معدے اور آنتوں میں ناہضم شدہ غذا سڑنے لگتی ہے تو تے یا جلاب کے ذریعہ اس فاسد مواد کو خارج کیا جاتا ہے۔ تے اور جلاب دونوں تکلیف دہ عمل ہیں۔ جسم کی صفائی کی خاطر اس تکلیف کو برداشت کر لیا جاتا ہے، جسم کا حال وہی ہے جو نفس کا! بعض رکاوٹوں کے سبب انسان بہت سے ناقابلِ اظہار خیالوں، خواہشوں اور جذبیوں کو ہضم کر جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے خوف یا خود اپنی کمزوریوں سے ڈر کر ان کے اظہار و بیاں پر قادر نہیں ہوتا رفتہ رفتہ یہ خیالات، یہ جذبے اور یہ خواہشیں کی سٹ سے بالکل اوجھل ہو جاتی ہیں لیکن لاشعور میں ان کی کشش جاری رہتی ہے اور اسی طرح وہ الجھاؤ، وہ چپکاک اور وہ کام پلکسز پیدا ہوتے ہیں۔ جنہیں نفسیات کی زبان میں تقسیم شخصیت یا وحشی بنوارے (SCHIZOPHRENIA) کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت کی مشقیں اس فاسد جذباتی مواد کو لاشعور سے اٹھا کر شعور میں لاتی ہیں، اور مریض کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نفسیاتی مرض میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن شدت و بیجان کا دور چند روز سے زیادہ نہیں ہوتا ان مشقوں کی بدولت فاسد جذبات رفتہ رفتہ ذہن سے خارج ہونے لگتے ہیں اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا، چند مرتبہ یہی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ تا آنکہ ذہن کو مکمل صحت نصیب ہو جاتی ہے۔

ممتاز جہان، محمد شریف، شمیم اختر اور سرفراز خاں اپنی زندگی کے طوفانی اور

بیجانی دور سے گزر رہے ہیں، جذبات کا یہ سیلاب، آتشیں ان کی شخصیت کی اندرونی تہوں میں جوش مار رہا ہے اور وہ بیزاری، حافظے کی خرابی، شرم، احساس کمتری، مردہ دلی اور اضمحلال وغیرہ میں مبتلا ہو گئے ہیں ان کا علاج وہی ہے جو ظفر کے لئے تجویز کیا گیا، ہائے جوانی کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہے۔ ہائے زمانہ، ہائے جوانی۔

م۔ ی۔ اسد (راولپنڈی) سے لکھتے ہیں کہ:

مجھے کسی سے قلبی لگاؤ ہے، وہ کافی دن کے بعد کبھی کبھار ہمارے گھر آتا ہے۔ یوں تو میں ہر وقت اس کے انتہار میں رہتا ہوں، لیکن جب کبھی وہ آنے والا ہوتا ہے۔ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ آ رہا ہے۔ خواہ میں کہیں ہوں، میرا دل کہنے لگتا ہے کہ وہ آنے والا ہے یا آچکا ہے بیان نہیں کر سکتا، کہ اس وقت میری جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے میں خود بھی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں اور اگر میں کہیں اور ہوں (یعنی گھر سے باہر) اور ہمارے گھر آجائے تو خود بخود کوئی طاقت مجھے گھر کی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ جوں جوں گھر سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہوں اس کی موجودگی اور قریبیت کا احساس شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ تاہم اسے کوئی دلچسپی نہیں کہ غالباً نفرت سی ہے۔ اس کی نفرت کے باوجود میں اس سے محبت کرتا ہوں آخر کیوں؟

دل کے معاملات

اسد صاحب کو حیرت ہے کہ اسے (یہ اُسے کون ہے؟ اسد صاحب نے اس کی تشریح نہیں کی اور تشریح کچھ ضروری بھی نہیں) نفرت ہے آخر ایسا کیوں ہے کہ وہ اس کی طرف کھینچے اور کھینچے چلے جاتے ہیں۔ مکتوب نگار نے پورے معاملے کو اس قدر اختصار سے بیان کیا ہے اور کہانی کے بعض ضروری حصوں کو اس طرح گول کر گئے ہیں کہ ان کے معاملے کی نسبت کوئی قطعی، واضح اور روشن رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ دل کے معاملات کچھ اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ جب تک روایتی عاشق و معشوق کی شخصیتیں

پوری طرح پیش نظر نہ ہوں، ان کے باہمی تعلق کی سطح کا تعین مشکل ہے۔ تمام انسانی جذبوں میں سب سے زیادہ شدید پرزور اور گمراہ کن جذبہ عشق کا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق جنس سے ہے جنسی جذبے اور جذبہ عشق میں فرق صرف یہ ہے کہ جنسی جذبہ صرف تسکین چاہتا ہے تاکہ جسم کو لذت حاصل ہو۔ خواہ تسکین کا طریقہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جنسی جذبے کی تسکین کے لئے کوئی ایک شخص مخصوص نہیں، اس کیلئے پورا بازار کھلا ہوا ہے لیکن جذبہ عشق کسی ایک شخص کی ذات سے مخصوص ہوتا ہے یعنی ایک طے شدہ عاشق اور ایک متعین عاشق! اس میں شبہ نہیں کہ اکثر حالات میں عشق کی چنگاری بھی جنسی غدد کی تحریک سے فروزاں ہوتی ہے تاہم یہ کوئی ضروری نہیں کہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی محبت، جسمانی ملاپ کے بغیر قائم نہ رہ سکے۔ بہر حال اس وقت عشق کے موضوع پر گفتگو مقصود نہیں، صرف م۔ی۔ اسد کے معاملے کو زیر بحث لانا ہے۔ م۔ی۔ اسد کی حساسیت کا عالم یہ ہے کہ انہیں لاشعوری طور پر اپنے محبوب کی نقل و حرکت کا علم ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں کہیں ہوں، جب بھی وہ میرے گھر آتا ہے، مجھے قدرتی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آیا ہے یا آئے والا ہے۔ اس کی چکنی روح ایسے شدید احساس شخص کا تخیل کتنا تیز رفتار ہوگا۔ ظاہر ہے انہوں نے لکھا ہے کہ میرے محبوب کو جب مجھ سے نفرت ہے تو آخر میں اتنے بے پناہ طور پر اس سے وابستہ کیوں ہوں۔ اسد صاحب کی یہ رائے یکطرفہ ہے کہ ان کا محبوب ان سے نفرت نہیں کرتا اگر واقعی وہ ان سے متنفر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اسد صاحب اس سے اتنا قریبی تعلق محسوس کرتے، دو دلوں کے درمیان کیا کیا حالات پیش آتے ہیں۔ اس کا تجربہ اور تجزیہ کسی سائنسی تجربہ گاہ میں کرنا ممکن نہیں، شعر تو فارسی کا ہے مگر دہرائے بغیر چارہ نہیں۔

میان عاشق و معشوق رمزیت

کرانا کاہنیں راہم خبر نیست

ترجمہ یا مفہوم اس کا یہ ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان ایک رمز، ایک بھید

ہوتا ہے، جس کی کرانا کاہنیں (یعنی انسانی نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔) مجھے کوئی ایسا نفسیاتی طریقہ معلوم نہیں جس سے جذبہ محبت کی گہرائیوں اور اسرار عشق کی پیچیدگیوں کو معلوم کیا جاسکے۔ البتہ ایک تجربہ کار پیشہ ور عاشق، دو دلوں کے رابطہ و ضبط کی کیفیتوں کو سمجھ سکتا ہے اور میں ایک تجربہ کار عاشق کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اسد کا محبوب اسد سے نفرت نہیں محبت کرتا ہے اگر اسے تعلق خاطر نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا، کہ اسد لاشعوری طور پر اس کے قرب کا احساس کر سکتے، یہ بالکل ناممکن ہے۔

غلیظ عادت

میں ایک غلیظ آدمی ہونے کے باوجود آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری غلاطت سے قطع نظر مجھے کوئی مشورہ دیں گے، میری عمر 29 سال کی ہے۔ شادی شدہ ہوں اور تقریباً پندرہ سال اپنی طلاق اپنے ہاتھوں سے منسوخ کر رہا ہوں، رات کو سوتے وقت یا صبح کو جاگنے کے ساتھ میرا ہاتھ بے قابو ہو جاتا ہے اور میں خود کو تباہ کرنے لگ جاتا ہوں۔ دو سال تک سوچتا رہا کہ آپ کو خط لکھوں، آپ سے خطاب کرتے ہوئے غم آتی تھی، کئی بار خط لکھا، اور پرزے پڑے کچل کے پھینک دیا۔ اگر آپ اس گندی، غلیظ عادت سے چھٹکارہ پانے کی کوئی ترکیب بتا دیں، تو زندگی بھر شکر گزار رہوں گا۔ (ملک زہدی، خط مورخہ 5، مارچ 1972ء)

جنسی مسئلہ

ملک زہدی کے خطوط پر گفتگو کرنے سے قبل میں جنسی مسئلے کے بارے میں چند لفظ کہنا چاہتا ہوں، ہر جاندار کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج "جنسی تقاضے" اور اس کی تکمیل کی خواہش کے روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ حیوان اس چیلنج کا مقابلہ اپنے جبلی رجحان کی روشنی میں کرتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں۔ انسان کا معاملہ مختلف ہے آدمی جس طرح کثیر الغذاء مخلوق ہے یعنی شیر کی طرح صرف گوشت پر بھی زندگی بسر کر سکتا ہے، اور

بھیڑ کی طرح عمر بھر گھاس چر کر بھی زندہ رہ سکتا ہے اسی طرح وہ جنسی اعتبار سے بھی منجھون مرکب واقع ہوا ہے۔ انسان کے جنسی تقاضے اتنے رنگا رنگ، اتنے گونا گوں اور اتنے پرچہ ہوتے ہیں کہ بیک نظر ان کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ ملک زہدی کی عمر 29 سال کی ہے، شادی شدہ ہیں اور چہرہ سال سے جنسی کج روی میں مبتلا ہیں۔ صاف ظاہر ہے ازدواجی زندگی ان کے لئے جنسی سکون کا سبب ثابت نہیں ہوئی۔ انہیں صرف اسی وقت سکون ملتا ہے جب وہ اپنے ہاتھ کو استعمال کریں۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ ملک صاحب کو جنسی تسکین اس غیر طبعی طریقے پر کیوں حاصل ہوتی ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کی رفیقہ حیات کہ رفیقہ جسم بھی ہیں، ملک صاحب کے لئے باعث لذت ثابت نہیں ہوئیں۔ انسانی شخصیت بلوغ اور نشوونما کے مرحلوں میں بڑی پیچیدہ راہوں سے گزرتی ہے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی مشکل راستے میں بھٹک جاتی ہے۔ ملک زہدی صاحب کی شخصیت کی نشوونما، درحقیقت مناسب انداز میں نہیں ہوئی۔ اب تک ان کے اندر ایک بچہ چھپا ہوا ہے۔ خود لذتی یا مشت زنی کی عادت ہے، بچے بالعموم اپنے جنسی اعضاء سے کھیل کر تھکتے ہیں اور وہی کھیل کھیل میں ناگہان یکایک انہیں ایک انہجانی لذت کا احساس ہوتا ہے پھر اس انہجانی عجیب و غریب لذت کا احساس انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اس شغل کو جاری رکھیں۔ ملک زہدی کی جنسی کج روی (شادی شدہ ہونے کے باوجود مشت زنی) ذہنی نابالغی کی علامت ہے عام طور سے خود جنسی عمل غلیظ سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس عمل کی تکمیل میں جسم کے وہ اعضاء حصہ لیتے ہیں، جو بدبودار مواد (فضلے) خارج کرتے ہیں۔ ملک زہدی اس غلاطت سے نجات پاسکتے ہیں۔ مگر ایک دم اور بیک وقت مشت زنی کو ترک کر دینا ان کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ جنسی ہیجان کے عالم میں ارادے کی قوت یا تو مفقود ہو جاتی ہے یا ضعیف اور دائمی جنسی ہیجان میں مبتلا ہیں ان کے نفس کی کسی اندرونی تہ میں جنسی جذبات کا جو کوہ آتش فشاں بھڑک رہا ہے۔ وہ پوری شدت سے اپنا اخراج چاہتا ہے۔ ازدواجی تعلق کے ذریعے کسی نہ کسی

جذباتی رکاوٹ کے سبب وہ پوری جنسی تسکین حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ یہ محرومیت انہیں خود لذتی پر اکساتی ہے اور بے اختیار ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ میں نے ملک صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ وہ میری تجویز کردہ چند مشقیں (جن کا تعلق نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت S.C.T سے ہے) کر لیں۔ ان مشقوں سے ان کی قوت ارادی ابھرے گی۔ اور وہ رفتہ رفتہ خود کو ہمیشہ محفوظ رکھیں اس عادت پر غالب آ جائیں گے۔

طاسمی گنبد

ق۔ س (لاہور) اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں۔ کیوں مطمئن نہیں خود ان کے علم میں بھی نہیں ہے، لکھتی ہیں کہ:

بھٹے دو بھٹے بعد عجیب سا بوجھل پن طاری ہو جاتا ہے۔ یہ خیال آتا ہے کہ میں کسی بیوی ہوں کہ وہ مجھے اپنا محرم راز نہیں سمجھتے وہ کچھ مجھ سے چھپاتے ہیں۔ میں ان کی کسی سرگرمی سے واقف نہیں آخر میں اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالوں کہ انہیں مطمئن کر سکوں، وہ کھلتے ہی نہیں بند رہتے ہیں۔ جیسے اپنے آپ میں گم ہیں۔ ان کو سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ انہیں بھی خوش رکھوں اور خود بھی خوش رہوں۔ دس پندرہ روز کے بعد جب طبیعت بیزار ہو جاتی ہے، شوہر سے الجھ پڑتی ہوں۔ میری خودداری بروئے کار آ جاتی ہے اور میں بھی وہی رویہ اختیار کر لیتی ہوں جو ان کا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں پر ایک طویل اور بے کیف خاموشی چھا جاتی ہے۔ شادی سے پہلے میرا مقصد حیات یہ تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں، میں ہر سرگرمی میں حصہ لیتی تھی، بہترین طالبہ سمجھی جاتی تھی، اچھی مقررہ تھی، ہمیشہ جماعت میں اول پوزیشن حاصل کرتی تھی۔ میرے شوہر بہت اعلیٰ کچھ کل قسم کے انسان ہیں۔ مگر آہ مجھے نہیں سمجھ سکے۔ (خط۔ مورخہ 3 فروری، لاہور)

ق۔ سلطان کو یہ شکایت ہے کہ ان کے شوہر ان سے کھلتے ہی نہیں، کچھ بند بند سے رہتے ہیں، انہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ وہ دانشور قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں۔

لیکن اس دانشور ہونے کے باوجود مجھے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قصور کس کا ہے، میاں کا یا بیوی کا، یا دونوں کا! میں ان کے شوہر کے مزاج و اطوار سے واقف نہیں، صرف اس حد تک جانتا ہوں۔ جس تک ق۔ سلطان نے بتانا چاہا ہے۔ کسی کی ذہنی کمزوری ایک آدھ خط پڑھ کر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ آدمی ایک بند طلسمی گنبد ہے۔ اس گنبد کے سات دروازے ہیں، ایک دروازے پر بھوکا شیر بیٹھا ہے دوسرے دروازے پر سانپ رینگ رہا ہے تیسرے دروازے پر جلا دھوا لے کھڑا ہے، چوتھے دروازے پر جہنمی شعلے بھڑک رہے ہیں، جو ان کے نزدیک آتا ہے جل جاتا ہے پانچویں دروازے پر گہرا اندھیرا کنواں ہے جس سے کسی کے مسلسل رونے کی آواز آتی رہتی ہے، چھٹے دروازے پر بلا بال کھولے، دیدے مشکافی بیٹھی ہے، ساتویں دروازے پر اس طلسمی گنبد کی 'مفت خواں اسرار' کے طلسمی محافظ خون آشام کا پہرہ ہے۔ جب آپ یہ ساتویں دروازے کلید طلسم کشا سے کھول لیں گے۔ تو آدمی کے "اندرون" میں قدم رکھیں گے۔ وہاں البتہ آپ کو ایسے عجائبات نظر آئیں گے جن کی مثال اس دنیائے آب و گل میں کہیں نہیں ملتی۔ وہ طلسمی گنبد ہیں۔ اور ان کا شوہر بھی دونوں گنبد ایک دوسرے کے متوازی واقع ہوئے ہیں تو اس صورت میں کیا ہو؟ ق۔ ایک گرم جوش جذبات اور نہایت نازک احساسات رکھنے والی لڑکی ہیں، ان کے شوہر ان سے بے اعتنائی کریں نہ کریں۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان سے بے اعتنائی اور بے توجہی اور بے پروائی برتی جا رہی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے (اور اس اندازے میں غلطی ہوئی نہیں سکتی) کہ ق عدم تحفظ کے خوف میں مبتلا ہیں۔ ہر لمحہ ان کی یہ خواہش ہے کہ دو طاقت ور بازوان کی حفاظت کرتے رہیں۔ ق کے خیال میں ان کی "عزت نفس" اس وقت تک محفوظ رہ سکتی ہے جب شوہر ان کی مسلسل ناز برداری کرے۔ جب ق کے رفیق حیات پر خاموشی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ گفتگو بھی کم کر دیتی ہیں، کھینچ جاتی ہیں، دس پندرہ روز تک یہی گہری بے زبان کشمکش جاری رہتی ہے، اس کے بعد شوہر سے الجھ پڑتی ہیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل اور

تا قابل حل مسئلہ نہیں کہ ق سلطان اسے زندگی اور موت کا سوال بنالیں بعض لوگ کم گو اور اظہار جذبات میں محتاط ہوتے ہیں۔ وہ اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے پر جوش جذبات اور طوفانی احساسات کا اظہار کر دیا تو ان کی کمزوری ظاہر ہو جائے گی۔ ق۔ کے رفیق زندگی اپنے اکیلے نکل ازم (یا دانشوری) کی بناء پر اس گروہ میں شامل ہیں۔ ق۔ ان کی بے اعتنائی کو بے مہری پر کیوں محمول کرتی ہیں۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ان کے شوہر فطری طور پر کم گو اور کم آمیز ہیں۔ ق۔ کو اپنے شوہر کی سرد مہری کا جواب گرم جوشی سے دینا چاہئے اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے وقت ہرگز اس فہم اور اس وہم میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ میری پیش قدمی سے میری خودداری پر حرف آجائے گا۔ میاں بیوی کے درمیان دمی خودداری اور روایتی تکلفات کا سوال ہی نہیں ہوتا چاہئے اور اس آق۔ سلطان رئیس اکاڈمی کی تازہ ترین پیشکش ”لے سانس بھی آہستہ“ کا مطالعہ کریں۔ اس کتاب کو پڑھ کر انہیں اندازہ ہوگا کہ سانس کی مشق کس طرح کی جانی کا یا بلٹ کر سکتی ہے اور اس کے اثرات، فوائد اور نتائج کیا کیا ہوتے ہیں گا

پلٹ کر سکتی ہے اور اس کے اثرات، فوائد اور نتائج کیا کیا ہوتے ہیں؟

تو سعید میاں!

میرا جواب واضح ہے یہ کہ آپ سماج کی اصلاح کرنے سے پہلے اپنی حالت درست کریں سماج افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر افراد اپنی اصلاح ذات کی طرف لگ جائیں تو معاشرہ خود بخود درست ہو جائے گا۔ اے عزیز! تم ایک جوہر قابل ہو، دل و دماغ کی دولتوں سے مالا مال، میں نے تمہاری نثر (خط کی صورت میں) پڑھی ہے۔ اس سے تمہارے جوش بیاں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب نثر کا یہ عالم ہے تو نظم کا کیا حال ہوگا۔ یہ تمام خوبیاں اپنے مقام پر حق بجانب اور بجا ہیں میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن عزیز القدر سعید! دل و دماغ کی ان تمام خوبیوں سے بلند تر ایک خوبی اور ہے وہ ہے حقیقت پسندی کی صلاحیت۔ یعنی یہ صلاحیت کہ آدمی اپنے آپ کو عملی زندگی کی ضرورتوں اور

خارجی ماحول کے تقاضے کے سانچے میں ڈھال لے۔ مثلاً یہی آرٹ اور سائنس کا تقاضہ ہے۔ بے شک تمہارا رجحان ”فنون کی طرف ہے۔ لیکن پسند کے معنی یہ نہیں کہ آپ سائنس کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ کے ذہن میں ایک عظیم الشان آئیڈیل درخشاں ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ آئیڈیل کبھی توڑ پھوڑ کر پھینک دینے کی ضرورت نہیں۔ اس آئیڈیل یا اس مثالیے کو قائم رکھتے ہوئے بھی آپ سائنس پڑھ سکتے ہیں، زندگی کے کسی واقعے کو ڈرامہ نہ بنائیے۔ تخیل کی شدت اور براتی اپنے مقام پر قابلِ تحسین سہی لیکن زمین پر جم کر کھڑے ہونے کے لئے حقیقت پسندی کی سطح پر پاؤں جمانے ضروری ہیں حقیقت یہ ہے کہ آپ عملی طور پر ایک بے بس نوجوان ہیں۔ چاندی کا چھپے لے کر پیدا نہیں ہوئے۔ آپ عام پاکستانیوں کی طرح گونا گوں عملی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ان گونا گوں دشواریوں کا حل تخیل کے بجائے صرف ارادے کی قوت کو بروئے کار لانا سے ہو سکتا ہے۔

سعید میاں میں ہر خدمت کو حاضر ہوں ان صفحات پر آپ کے خط کے اقتباسات اس لئے پیش کیے گئے کہ ہر مصلیٰ نوجوان اسی کرب اور اسی مشقت میں مبتلا ہیں آپ میرے روحانی فرزند ہیں۔ میں آپ کو امکانی خدمات کا یقین دلانا ہوں۔ درخواست صرف اتنی ہے کہ اس مضمون میں جو معروضات پیش کی ہیں۔ ان پر غور فرمائیے اور جس نتیجہ پر آپ پہنچیں اس سے مطلع کیجئے۔

محمد حنیف رضا (نندو محمد خاں) سے لکھتے ہیں کہ:

میں ایک قلفی کے کارخانے میں قلفی ساز کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ 1971ء کا ذکر ہے، رات کا وقت تھا اور میں قلفیاں بنا رہا تھا کہ روشن دان سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

”حنیف بھائی! قلفیاں بنا رہے ہو، اب کتنی قلفیاں بنانی ہیں؟“

میں اس آواز پر حیران رہ گیا، باہر جا کر دیکھا تو کوئی آواز دینے والا نظر نہ

آیا۔ متعدد بار یہی تجربہ ہوا اور ہر مرتبہ میں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ یا تو یہ آواز میرے خیالات کی صدائے بازگشت ہے، یا پھر کان بج رہے ہیں۔ چنانچہ نہ میں اس واقعہ کا کسی سے ذکر کیا نہ اس طرف کوئی توجہ کی اب ایک نیا گل کھلا آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے ایک اور شخص محمد عرس خان رات میں وہیں قلفیاں بنا رہا تھا۔ کہ اسی طرح کی آوازیں روشندان سے آنے لگیں۔

محمد عرس قلفیاں بنا رہے ہو، کتنی قلفیاں بنانی ہیں؟

محمد عرس ڈر گیا اور رات کی ڈیوٹی چھوڑ کر دن کی ڈیوٹی میں کام کرنے لگا۔ اس کی جگہ ثار نامی ایک شخص کام کر رہا ہے، اس نے کہا کہ مجھے بھی ایسی ہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہی نہیں 1968ء میں اسلام الدین نامی ایک قلفی ساز کو بھی یہی تجربہ ہوا تھا۔ وہ بھی کہتا ہے کہ میں نے ایک رات کارخانے میں کسی بزرگ کا نورانی چہرہ دیکھا تھا۔ وہ بزرگ غائب ہو گئے۔ الغرض جو لوگ وہاں کام کرتے ہیں۔ یہ سب کو آوازیں سننا پڑتی ہیں اور اسے اس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ معلوم کرنا یہ ہے کہ آواز کس کی ہے؟

آواز دینے والا کون ہے؟ اور یہ آواز تمہاری میں کیوں سنائی دیتی ہے؟ محمد حنیف صاحب کو معلوم ہے کہ میں علومِ مخفی کا طالب علم ہوں اور اس علم کے خارق العادات کی تحقیق تصدیق اور تردید کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ خارق العادات ان واقعات کو کہتے ہیں جو عادت کے خلاف یعنی سپرنارمل ہوں۔ مثلاً ہماری عادت یہ ہے کہ آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص کانوں سے دیکھنے اور آنکھوں سے سننے لگے۔ تو اس واقعے کو خرق عادت کہیں گے آواز کے لئے ایک آواز دینے والے کی ضرورت ہے۔ اس واقعے میں آواز دینے والے کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی نفسیاتی اور طبی تشریح تو اس طرح کی جاسکتی ہے، کہ جتنے لوگوں نے اس پر اسرار آواز کو سنا۔ ان کے کان بجتے لگے تھے، یا بقول محمد حنیف رضا، خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ عام عقل اس کی تشریح سے مطمئن ہو جاتی ہے۔

میں ممکن ہے کہ کسی ایسے سبب سے جو ہمیں معلوم نہیں جیتے لوگ اس کمرے میں بیٹھ کر قلیاں بناتے ہیں۔ ان کے کان بجنے لگتے ہوں، کم سے کم یہ تشریح اس لئے قابل قبول ہوگی، کہ اسے ہم رد کر دیں تو دوسری صورت یہ فرض کرنی پڑے گی۔ کہ روشندان سے آنے والی آوازیں کسی جن بھوت یا بزرگ کی روح کی ہیں۔ اتنے بڑے خرق عادت (سپر نارمل واقعے کو ماننے کے لئے بڑی ٹھوس شہادتوں کی ضرورت ہے اور یہ شہادتیں سامنے نہیں آئیں۔ میرا طریقہ ہے کہ جب اس قسم کا کوئی نادر الوقوع (یعنی ایسا واقعہ جو عام طریقوں سے ہٹ کر کبھی کبھی پیش آتا ہے) تجربہ سامنے آتا ہے۔ تو اس کی وہ تشریح قبول کرتا ہوں۔ جو عادت کے مطابق ہوتی ہے، عادت کے خلاف نہیں ہوتی، اسلام الدین نے کارخانے میں کسی بزرگ کے نورانی چہرے کا ذکر کیا ہے یہ چہرہ اچانک نظر آیا اور پھر یکایک غائب ہو گیا۔ ہم یہاں تعزیرات پاکستان کے قانون شہادت سے کام لیں گے۔ کسی واقعے کی تصدیق کے لئے کم سے کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ یہاں صرف ایک گواہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ یعنی اسلام الدین قلفی ساز، ہمیں نہیں معلوم کہ یہ صاحب کس مزاج و طبیعت کے ہیں۔ ممکن ہے کہ عام پاکستانیوں کی طرح یہ عام لوہاں میں بھرا ہو کر کسی فریب نظر کا شکار ہو گئے ہوں۔ محمد حنیف رضا البتہ سنجیدہ طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے روشندان سے آنے والی آوازیں۔

حنیف بھائی، قلیاں بنا رہے ہو، کتنی قلیاں بنائی ہیں؟

سنی تھیں تو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ ممکن ہے، میرے کان بج رہے ہوں اس سے ان کی معقولیت اور حقیقت پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ پھر عرس محمد کو یہی تجربہ ہوا اور اب غار نامی ایک شخص اس تجربے سے دوچار ہے۔ میں ان آوازوں کے سلسلے میں فی الحال اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ اور محمد حنیف صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر کوئی نیا واقعہ اب پیش آئے تو مجھے فوراً مطلع کریں۔ خارق العادات (سپر نارمل ازم) کی تحقیق کا کام بہت جان لیوا اور وقت طلب کام ہے ایسے تجربوں پر فوری رائے دینا

منفید ہے نہ مناسب۔

آتش خاموش

میرا مسئلہ گیارہ سال سے حل طلب ہے، میں اور میرے ساتھ ایک پاکیزہ جان کسی خاموش آگ میں برسوں سے جل رہے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو رہنمائی کر سکے۔ چند سال پہلے آپ کی شخصیت ابھری لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں کھلے بندوں آپ کے سامنے اپنی لغزشوں کا اعتراف کر سکوں۔ غالباً یہی مجبوری، شاید یہی بزدلی آج میری محرومی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ میں نے جھوٹ بولنا چاہا کہ کسی فرضی نام کی نقاب اوڑھ کر آپ سے رابطہ قائم کروں، اور آپ سے مشورے حاصل کر کے ان پر عمل پیرا ہوں۔ مگر میرا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ مجھے یہ جھوٹ اور طمع کاری بہت بُری لگی اور جو خط آپ کے نام لکھا تھا اسے شعلوں کی نذر کر دیا۔ پھر ایک عرصے تک ہمت نہ ہوئی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں لیکن ابھی چند روز پہلے کی بات ہے کہ ان۔ش کا خط ملا۔ وہ ان۔ش جو ایک آتش خاموش جل میرے ساتھ جل رہی ہے۔ ان۔ش کے خط نے مجھے چھوڑ کر رکھ دیا، اس کے خط کا لب لباب یہ تھا۔

مبارک ہوں تجھے جانِ وفا، مجبوریاں تیری

ہمیں تو عمر بھر کے پیار کا وعدہ نبھانا ہے

اس کی مظلومیت اور شدت جذبات نے مجھ میں حوصلہ پیدا کر دیا کہ آپ سے مدد طلب کروں۔ میں آپ کے سامنے حاضر ہو رہا ہوں۔ بڑی امیدوں کے ساتھ اپنا پہلا اور آخری سہارا سمجھ کر! یہاں یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ اور کوئی میری مدد نہیں کرے گا۔ ایک تو..... میرے اور ان۔ش کے درمیان رشتہ بہت نازک ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ میں شادی شدہ ہوں! آپ پہلے یہ قصہ سن لیں۔

1961ء میں جب کہ میں سولہویں سال میں قدم رکھ رہا تھا، میری شادی کردی

گئی، مجھے نہ تو شادی کی تمنا تھی نہ وہ لڑکی پسند تھی۔ جو میرے لئے چنی گئی تھی، لیکن

والدین نے عجب قسم کی خاندانی مجبوریاں میرے سامنے پیش کیں۔ پھر ان کا دبدبہ بھی کم نہ تھا میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکا اور بیاہ ہو گیا۔ مجھے اس وقت بھی ن۔ش۔ سے محبت تھی۔ لیکن جوانی کی سوجھ بوجھ سے عاری۔ وہ مجھ سے عمر میں چار سال چھوٹی تھی لیکن مجھ سے کافی لگاؤ تھا اسے۔ وہ اس لگاؤ کا اظہار چھوٹی موٹی قربانیاں دے کر اور خدمت کر کے کرتی تھی، لیکن میں اسے رشتہ داری کی فطری محبت پر محمول کرتا تھا۔ میرے نکاح کے وقت جب لوگ مجھے تھے دینے لگے اور چاروں طرف سے مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا، تو میں نے کسی کی دبی دبی سی سسکیوں کی آواز سنی۔ یہ ن۔ش کی سسکیاں تھیں۔ میں تڑپ اٹھا اور سمجھ گیا کہ اس کی محبت صرف قرابت کا تعلق ہی نہ تھا بلکہ اس میں وابستگی اور خود پسندی کا جذبہ بھی شامل تھا۔

شادی ہو گئی اور میں چودہ مہینے تک اپنی بیوی سے الگ رہا، پھر ایک حادثے نے مجھے بیوی سے قریب کر دیا۔ یہ مثالی بیوی ہے اس کے صبر و ایثار نے مجھے جیت لیا۔ 1962ء اور 1970ء کے درمیان خدائے ازدواجی زندگی کا صلہ چار خوب صورت بچوں بخشے، وہ آپ بھی جانتے ہیں کہ باوجود میں اپنی زندگی کو بے کیف، بھدی اور بوجھل سمجھتا رہا، میں نے ہر لمحہ ن۔ش کی کمی محسوس کی زندگی میں بہت بڑا خلا محسوس کیا۔ ن۔ش ہر وقت ذہن نشین اور دل نشین رہی۔ حالانکہ وہ جب بھی ملی اس قدر محتاط و محفوظ کہ میں سمجھا کہ وہ مجھے بھلا چکی ہے۔ البتہ ایک بات بڑی تشویشناک تھی وہ یہ کہ وہ شادی سے قطعاً منکر ہو گئی تھی اور چپ چپ سی رہتی تھی۔ لطف یہ کہ محبت کی آگ دونوں طرف چپکے چپکے سلگتی رہی، نہ کبھی اس نے اقرار کیا نہ میں نے اظہار کیا۔ البتہ اس کی افسردہ نگاہوں میں عجب دل کو برآمدینے والی عروسی جھلکتی تھی اکثر مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک پڑتی اور وہ تیزی سے کتر کر نکل جاتی، مکمل نو سال اسی کشش میں بیت گئے۔

آخر ایک دوپہر 1970ء کے درمیانی مہینے کی ایک گرم دوپہر تھی کہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اس دوپہر کو میں یورپ کے ایک طویل سفر سے لوٹا تھا۔

میں ن۔ش۔ کے گھر گیا وہ مجھے دیکھتے ہی پاگل کی طرح جھپٹی اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔

”ہائے اللہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں آپ کے بغیر؟“

پھر جیسے اسے ہوش آگیا سر کا ہوا دوپٹہ درست کیا۔ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور کسی ہراساں ہرنی کی طرح اٹنے پاؤں بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس سے زیادہ مجھے یاد نہیں، نہ اپنے پرانے اس سلسلے میں کوئی بات کی۔ عجیب بات یہ ہے نہ اس کا نوٹس کسی نے لیا۔ نہ جانے کیوں؟

اب مجھ پر حقیقت و اشکاف ہو چکی تھی اور یہ خیال کہ وہ میرے لئے مر رہی ہے اور میں، میں ازدواجی زندگی کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ مجھے اپنی بیوی سے پھر دور رکھنے لگا۔ 1971ء کے آخر میں اس کا پہلا خط ملا، لکھا تھا کہ:

آپ خواجہ میری وجہ سے جان کو روگ لگا بیٹھے ہیں مجھے آپ سے ویسا پیار نہیں میں جیسا آپ سمجھتے ہیں۔

میں نے فوراً خط کا جواب دیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی، جواب میں ن۔ش۔ نے لکھا کہ: میں اتنا آگے بڑھ چکی ہوں کہ اب واپسی میرے بس میں نہیں رہی۔“

وہ ابھی تک کنواری ہے اور شادی سے منکر بھی، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن کیا یہ مجھے زیب دیتا ہے کہ میں ایک بیوی کا شوہر اور چار بچوں کا باپ ہوتے ہوئے اسے پیام دوں اور اپنی زوجیت میں لے لوں۔ آپ کے مشوروں کا طالب ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے، (م۔ش۔ علی)

برادر م! علی انسان بھی دوسرے حیوانوں کی طرح کثیر الازدواج حیوان ہے، چار شادیوں کی اجازت اسی لئے دی گئی ہے کہ ایسی مجبور یوں کے موقع پر جن میں آپ گھرے ہوئے ہیں۔ شوہر کی حرم سرا میں ایک بیوی کے بجائے دو بیویوں کی گنجائش پیدا ہو جائے، آپ واقعی مجبور ہیں۔ اور ن۔ش۔ چیخ محروم! کاروباری عقل کا تقاضہ تو یہ

ہے کہ آپ ن۔ش۔ کو بھلا کر "اپنی مثالی بیوی" اور چار خوبصورت بچوں سے جی بہلا لیں۔

اچھا ہے کہ بن میرے گزر جائے کسی کی

اور یوں بھی کسی کی نہ گزر ہو تو مجھے کیا

لیکن شاید آپ اس سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ بہر حال اب ایک منظم لائحہ عمل بنا کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کیجئے۔ آپ نے ن۔ش۔ کی محرومی کے پیش نظر اپنی بیوی بچوں سے دوری اور بیگانگی کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے، یہ سرتاپا غلط ہے، بھلا بے چارے بیوی بچوں نے کیا قصور کیا ہے انہیں آپ کی مجبوریوں کی قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا جائے۔ آپ کے بیوی بچوں کے جذبات بھی اتنے ہی قابل احترام ہیں، جتنے ن۔ش۔ کے، سب سے پہلے آپ اپنی ازدواجی زندگی کو سدھارنے کی کوشش کیجئے۔ پھر ن۔ش۔ کی طرف توجہ فرمائیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر محبت کا انجام شادی ہی ہو، ابھی تک انسانی معاشرہ جذباتی انصاف کے تصور سے محروم ہے معاشرے کا وجود ہی اس لئے عمل میں آیا ہے کہ ہمارے ذاتی جذبات پر مناسب پابندیاں عائد کرے۔ معاشرے نے آپ کو اور ن۔ش۔ کو جو فحش پھیلانے کی وسعت دیا اور کھلا خراش سہی تاہم عزیز من! ان ہی زنجیروں کو بجاتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنا پڑے گا۔

ہائے کیا ہوتا جو قید زیت ہوتی ناگوار

یہ نفیست ہے کہ زنجیریں ہمیں راس آگئیں

م۔ش۔ علی یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ اور ہشت پہلو ہے کہ میرے ایک آدھ مشورے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کو مجھ سے رابطہ رکھنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اس راہ میں کئی خیب و فراز آئیں گے۔ ن۔ش۔ کے کردار میں مزید تہذیبیایاں رونما ہوں گی اور خود آپ کے جذبات بھی زندگی کی عملی حقیقتوں سے ٹکرا کر نیا راستہ اختیار کریں۔ کوئی جذبہ مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتا، وہ نت نئی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ن۔ش۔ کا جذبہ محرومی اور آپ کا جذبہ شوق آئندہ کیا کیا شکلیں اختیار کرتا ہے۔

شدید الذہنی

میں نے اس سے پہلے بے شمار خط لکھے افسوس آپ نے کسی کا بھی جواب نہ دیا ہو سکتا ہے میرا کوئی خط آپ تک پہنچا ہی نہ ہو، خیر کوئی بات نہیں میں آپ کی مصروفیت جانتی ہوں، میں پھر خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مایوس نہ کریں گے، اور مجھے جواب سے نوازیں گے۔ شکریہ۔

اب میری کہانی سنئے میں نے ایک خوش حال گھرانے میں جنم لیا۔ جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ماں کی محبت اور باپ کی شفقت سے محروم پایا۔ چھ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ سوائے اسکول اور گھر کے کہیں آنے جانے اور کھیلنے کی سخت پابندی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں حد سے زیادہ تنہائی پسند اور شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ جب میں سن بلوغت میں داخل ہوئی تو گھر والوں نے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ ایسا مارتے تھے کہ جسموں پر نیل تک پڑ جاتے تھے اور وہ نیل اور نشان آج بھی جوں کے توں قائم ہیں۔ گھر کا کوئی فرد ایسا نہیں جس نے مجھے نہ مارا باپ سے لے کر چھوٹے بھائی تک اس کا اثر یہ ہوا کہ میں زندگی سے بیزار ہو گئی، میرا ضمیر مردہ ہو گیا، مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں نے خودکشی کا ارادہ کئی دفعہ کیا۔ لیکن کسی روحانی قوت نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈری جو قیامت کے دن نازل ہوگا۔ بقول شاعر۔

مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں

کبھی مجھ کو جینا عزیز تھا یہ بجا سہی مگر اب نہیں

اب جب کہ میں کالج میں پہنچ گئی ہوں۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا رویہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا بچپن میں تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب جسمانی اذیت نہیں پہنچاتے ہیں۔ اب میں بھی حساس ہو گئی ہوں، ہر بات جلد اثر کر جاتی ہے، باہر تو کیا اپنے گھر والوں کے سامنے بھی بات کرنے سے کتراتے ہوں کسی کے سامنے نہیں آتی۔

کالج میں بھی میرا یہی حال ہے بات کرتی ہوں تو زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں سے شرماتی ہوں استاد کے سامنے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ خوف سے تحریر کاٹنے لگتی ہوں، سبق یاد ہونے کے باوجود بھی نہیں سنا سکتی۔ مجھے تباہی کے گہرے کنوئیں میں پھینکنے والے ماں باپ ہیں۔ میرے مستقبل کو تباہ کرنے والے میرے ماں باپ ہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے نفرت کا مقام ہے، کبھی کبھی تو میں بغاوت پر بھی اتر جاتی ہوں اور اپنی نفرت کا اظہار کر دیتی ہوں۔ میری اس گھر میں کوئی حیثیت نہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے کوئی محبت نہیں۔ ”رئیس صاحب بچپن میں مجھ سے میری معصومیت کی وجہ سے بے شمار گناہ سرزد ہوئے۔ لیکن ان کا کفارہ ممکن نہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن ایک واقعہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ 1965ء کا ذکر ہے میں تقریباً آٹھ سال کی تھی شام کے وقت ماں باپ کی سخت پابندی کے باوجود گھر سے باہر نکل گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا میں اور میرے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا، جیسے ہی میں باہر نکلی، کسی نے میرے منہ پر رو مال رکھ دیا۔ اس کے بعد مجھے کہاں لے گیا معلوم نہیں، جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو نیم پر ہوا ایک بند کمرے میں پایا۔ بڑی کوشش کے بعد میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی سات سال گزرنے کے بعد بھی میں نے اس واقعہ کا ذکر اپنے ماں باپ سے نہیں کیا کیوں کہ میں ڈرتی ہوں کہ وہ مجھے جان سے نہ مار ڈالیں۔ میں اس شخص کو بخوبی جانتی ہوں جس نے میرے دامن کو داغدار کیا تھا۔ میری کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی معصوم اور بھولی بھالی صورت کو دیکھ کر اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ آج بھی وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے، لیکن کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ماں باپ کے سامنے زبان کھولنے سے ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہو جائے اور لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگیں میں نہیں چاہتی کہ یہ بات بتا کر گھروالوں اور خاندان والوں کے دلوں میں نفرت پیدا کروں۔ لیکن اب میں اس راز کو فاش کر دینا چاہتی ہوں۔ اب میں خود اپنے پاؤں پر کلباڑی مارنا چاہتی ہوں۔ اب میں

اپنے والدین کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ آٹھ سال کی عمر میں اور پھر اس کے بعد مجھ پر کیا گزری؟ آپ کی کیا رائے ہے؟ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ جو آپ مشورہ دیں گے، اس پر عمل کروں گی۔ اب میری زندگی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ اس روکھی پھینکی زندگی سے کیا فائدہ؟ فقط۔

ایک بد نصیب لڑکی

ر۔س۔ح (راولپنڈی)

اُردو میں دستخط کرنے کے بعد خط لکھنے والی نے انگریزی میں بھی دستخط ضروری سمجھے ہیں۔

ONE UN LUCKY GIRL

R.S.H RAWALPINDI

ر۔س۔ح (R.S.H) کی عمر اب پندرہ سال کی ہونی چاہئے آٹھ سال کی عمر میں وہ ایک سنگین ترین حادثے کی زد میں آ گئی تھیں، ان کے ساتھ وہی قیامت گزری تھی۔ جو مرزا ہادی رسوا کے مشہور ترین ناول کی ہیروئن امراؤ جان ادا کے ساتھ! یعنی کم سنی میں ایک شقی القلب انسان نے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ زخم اب تک ان کی روح میں رس رہا ہے۔ ر۔س۔ح دلیر اور باغیانہ رجحان رکھنے والی لڑکی ہیں۔ انہوں نے جرات کی تمام اصطلاحوں، اور غلامداروں سے قطع نظر کر کے اپنا سینہ چیر کر سارے گھاؤ مجھے دکھا دیئے۔ واقعی یہ دلیرانہ قدم ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ر۔س۔ح (R.S.H) کو اس جرات پر مبارک باد دوں۔ یا یہ تاکید کروں گا کہ بی بی خبردار کسی شخص کو اپنا یہ راز اور اپنے یہ اسرار مت بتانا، ورنہ ٹھوکریں کھاؤ گی اور بعد کو پچھتاؤ گی۔ ر۔س۔ح جیسی ہزاروں لڑکیاں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں قلم نہیں اور وہ کسی رئیس امر و ہوی کو خط لکھنے کی جسارت سے محروم ہیں۔ بقول خود اس بد نصیب لڑکی (UN LUCKY GIRL R.S.H) کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا راز قالب گور میرے سینے میں محفوظ رہے گا اور پھر میرے ساتھ خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا۔ اب میں براہ راست ر۔س۔ح سے مخاطب ہوں۔

تم نے خط لکھا ہے کہ میں نے بے شمار خط لکھے۔ افسوس کہ آپ نے کسی کا

کرنا چاہئے۔ ان کے گناہوں سے جتنا درگزر کیا جائے گا۔ اتنا ہی بہتر ہے اور ان کی مجبور یوں پر جتنا ترس کھایا جائے گا۔ اتنا ہی انسانیت کے حق میں سودمند ہوگا۔ بی بی! تم نے اس خط میں اپنی جتنی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے میری نظر میں تمہاری قدر ہی بڑھا دی ہے۔ تمہارے حق میں رحم و مروت کے اتنے ہی جذبات پیدا ہو گئے بہر حال اب میں تمہاری ذہنی کیفیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

تمہارا خط بہت مختصر ہے، تم نے لکھا ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبالا۔ اپنے کو محکوم اور مظلوم پایا، میرے ماں باپ مجھے بری طرح پیٹتے تھے، ان کا رویہ کبھی شفقت آمیز نہیں رہا۔ انہوں نے مجھے پیار نہیں دیا، ہمیشہ پابندیوں میں جکڑے رکھا۔ اس پابندی بلکہ اپنی نظر بندی کا ذکر کرنے کے بعد تم نے لکھا ہے کہ ایک روز میں ان پابندی سے گھبرا کر اور ماں باپ کی نظریں بچا کر نکل گئی اور ایک شخص تمہیں زبردستی اغوا کر لیا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ تم نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ گھر کا کوئی شخص ایسا نہیں (ماں، باپ، بہن، بھائی) جس نے مجھے زور و کوب نہ کیا ہو، اتنا مارتے تھے کہ جسم پر نیل پڑ جاتے تھے۔ وہ نیل اور نشان آج بھی میرے جسم پر موجود ہیں۔

ر۔س۔ج! مجھے یقین نہیں آتا کہ کسی بچے کے ماں باپ اتنے ظالم اور پتھر ہو سکتے ہیں۔ معاف کر دینا، بچپن سے تمہارے رویے میں کوئی ایسی بات تھی کہ گھروالے تمہیں سزا دیتے تھے۔ چھ سال کی عمر میں تمہیں پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ خود تم نے لکھا ہے چھ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ سوائے اسکول اور گھر کے کہیں آنے جانے اور کھیلنے پر پابندی تھی اس پابندی کا نتیجہ تمہارے خیال میں یہ نکلا کہ میں حد سے زیادہ تہائی پسند اور شدید احساس کسری میں مبتلا ہو گئی۔ یقیناً تم مخالف ماحول میں تہائی پسند اور احساس کسری میں مبتلا ہو گئی ہوگی لیکن اسی کے ساتھ گھر والوں کے خلاف تمہارے ذہن میں انتقامی رویہ پیدا ہو گیا۔ اس انتقامی رویے نے تمہیں خاصا انقلاب پسند بنادیا۔ آٹھ سال کی عمر میں بغیر کہے سے گھر سے بھاگ لیا اس انتقام پسندی کا

ثبوت ہے۔ عورت (لڑکی ہو یا بوجھی عورت) جب انتقام پر اترتی ہے تو بعض اوقات اندھی ہو کر سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ر۔س۔ج! تم اپنے ماں باپ! اپنے بھائی بہنوں سے اور اپنے سر پرستوں سے انتقام لینا چاہتی ہو۔ کیونکہ تمہارے خیال میں وہ تم پر ظلم ڈھاتے تھے۔ تمہارے لاشعور نے ماں باپ سے بغاوت کی بڑی غلط راہ سمجھائی۔ اچھا ہم آٹھ سال کی عمر والے حادثے کو نظر انداز کئے دیتے ہیں۔ اور یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ تم اس سلسلہ میں بے قصور تھیں۔ (یقیناً بے قصور تھیں) لیکن آٹھ سال کے بعد بھی تم نے اپنی ذات کو بار بار خطرے میں ڈالا۔ بار بار تم پر دست درازی کی گئی تم اپنے کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتی ہو کہ میری جہاں میں میرا قصور نہیں، قصور وار دوسرے ہیں لیکن بی بی! معاف کر دینا، میں اس عذر کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ایک نابینہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ایسی طرح انتقام لے سکتی ہے کہ وہ خاندان کے تنگ و ناموس کو جان بوجھ کر یا جانے بوجھے بغیر کسی اندرونی باغیانہ رجحان سے مجبور ہو کر ضائع کر دے تمہارے کھلے اور چھپے ہوئے باغیانہ رجحان نے خود ایسے مواقع پیدا کئے کہ خاندان کی عزت پر حرف آئے۔ اور اب ر۔س۔ج! تم سرکشی کی ایسی منزل پر ہو کہ ماں باپ کے سامنے بڑا کارناموں (جنہیں میں صرف بچپن کی غلطیاں اور نا تجربہ کاری کی فروگزاشیں سمجھتا ہوں) کی فہرست پیش کرنا چاہتی ہو تاکہ وہ جلیں، کڑھیں اور اس طرح تم اپنے جذبہ انتقام کو آسودہ کر سکو۔ نہیں بی بی! یہ بڑا غلط طریقہ ہے۔ تم ایک اعتبار سے مظلوم اور ایک اعتبار سے ظالم ہو۔ مظلومیت کی داستان تو میں بیان کر چکا ہوں۔ جہاں تک قلم کا تعلق ہے تو تم نے کسی اور پر نہیں خود اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، تمہاری ساری کہانی میرے علم میں نہیں ہے۔ تم نے صرف چوبیس پچیس سطروں میں اپنی داستان بیان کی ہے اس داستان کے اہم گوشے اب تک میرے علم میں نہیں آئے۔ آخر وہ تمہاری کون سی حرکتیں تھیں جن پر تم فحش تھیں چار پانچ سال کی بچی کو ماں باپ (بشرطیکہ وہ بھی تمہاری طرح ایب نارمل ہوں) اس بیدردی کے ساتھ نہیں مار سکتے، اس کے جسم پر نیل پڑ جائیں۔ اور عجیب بات

یہ ہے کہ ان چوٹوں کے نشان اب تک تمہارے جسم پر باقی ہیں کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ پانچ چھ سال کی عمر میں تمہارے گالوں پر طمانچے مارے گئے تھے ان کے نفل اب تک پڑے ہوئے ہیں۔ ریس۔ ح! مکناٹم خط لکھنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ تم براہ راست مجھ سے خط و کتاب کرو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ والدین کے خلاف تمہارا باغیانہ رویہ آگے چل کر سنگین اور شدید نتائج پیدا کرے گا۔ اور تم اپنے ساتھ اپنے خاندان کو بھی لے ڈوبو گی۔ تم نے اپنے ماں باپ سے زیادہ مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ بی بی! میں تمہارے اس اعتماد پر پورا اتروں گا میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا، انشاء اللہ، شرط یہ ہے کہ مجھ سے کوئی بات چھپاؤ گی نہیں اور میں جو مشورہ دوں، اس پر صدق دل سے عمل کرو۔

خود تباہی

رکیں صاحب! میں ایک سولہ سالہ لڑکا ہوں بد صحبت میں اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوں یہ عادت بد معاش دوستوں کی صحبت میں پڑی ہے۔ حضرت! میں نے "یہ خود تباہی" خود مول لی ہے، میری صحبت تباہ ہو چکی ہے، آنکھوں میں گڑھے پڑ چکے ہیں۔ وزن صرف 102 پاؤنڈ رہ گیا ہے۔ نمازیں پڑھتا ہوں و نمازت کرتا ہوں واللہ سے کہتا ہوں۔ لیکن کوئی کردعا مانگتا ہوں کہ مجھے اس بد معاشی اور تباہی کے عذاب سے نجات دلائے، لیکن کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔ رکیں صاحب! میں کیا کروں۔

(محمد زید، کراچی)

بیٹے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہر لڑکا (اور لڑکیاں) خود تباہی کے اس دور سے گزرتا ہے۔ تم اپنے جسم سے کھیلتے ہو، نانوے فیصدی بیچے اور پچیاں کھیا کرتے ہیں۔ بچہ نادانگی بھولے پن اور دوسروں کی تقلید میں اس شرارت (میں تو اسے طغیان شرارت ہی سمجھتا ہوں) یہ اور بات ہے بعض لوگ بڑھاپے کی حد تک کھیل سے دستبردار نہیں ہوتے) کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس عادت پر غالب آنے کے لئے خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور خود اعتمادی S.C.T کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔

مشورے، تجربے، مشاہدے

کسی نہ کسی حد تک یہ بات ممکن ہے۔ ایک شخص بچپن میں تہیہ کر لے کہ وہ اردو زبان کی تصانیف (جو لاکھوں سے کیا کم ہوں گی) کا خلاصہ تیار کرے گا، اور پھر یہ حسن اتفاق بھی پیش آئے کہ وہ شخص کامل جسمانی صحت و تندرستی کے ساتھ دو سو سال کی عمر میں دن رات کے چوبیس گھنٹے تمام اردو علم و ادب کی تصانیف ترجموں اور اخباری فائلوں کا خلاصہ تیار کرنے میں لگا رہے اور اس مہم میں کامیابی حاصل کر لے، بلاشبہ اردو زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ ایک شخص دن رات محنت کر کے دو سو سال کی عمر میں تیار کر سکتا ہے۔ مجھے اس ناممکن الوقوع بات کا یقین ہے لیکن میں ایک لمحے کے لئے بھی باور نہیں کر سکتا کہ آپ دو سو سال تو دو سو سال دو ہزار سال تک دن رات مطالعہ کر کے ایک شخص کی بھی واردات قلبی کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ آدمی کے اندر اتنی بڑی دنیا آباد ہے کہ نہ اس کی وسعت کا اندازہ۔ "سال فوری سے لگایا جاسکتا ہے، اور نہ الیکٹرونک دور بین سے۔ ایجاد کاری اور ٹیکنالوجی کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے یہ بظاہر ممکن ہی نہیں۔ انسانی نفس کی صفات اور کمزوری کو دور یاقت کیا جاسکتے۔ نفسیاتی مشوروں کے سلسلے میں ہزاروں خطوط میری نظر سے گزر چکے ہیں، بے شمار افراد میرے مطالعے میں آئے ہیں۔ نہ جانے کتنے افراد نے میری تجویز کردہ مشقوں پر عمل کر کے ذہنی اور روحانی چستی کا احساس کیا ہے لیکن اس وسیع اور طویل کدو کاوش کے باوصف مجھے اعتراف ہے کہ میں کسی ایک شخص کے "اندرون" اور "بطون" (یعنی اس کے اندر کیا بلکہ کیا کیا چھپا ہوا ہے) سے بھی مکمل آگاہی اور واقفیت حاصل نہیں کر سکا۔ بعض حضرات کا اعتراف یہ ہے کہ آپ لوگوں کے خطوط کے اقتباسات تو نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مسائل کو تشنہ حل چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک شکایت نامہ ملاحظہ فرمائیے۔

الفاظ کی جادوگری

میرے عزیز دوست سید انیس جیلانی (محمود آباد، رحیم یار خان) لکھتے ہیں کہ..... آپ معالج نفسیات کم اور روحانی پیشوا زیادہ بن گئے ہیں۔ بن رہے ہیں، یا بننا چاہتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کے نفسیاتی مضامین کو (شروع میں تو نہیں بعد میں) بنظر احتسان ہی دیکھا ہے یقیناً اس سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہوگا۔ مگر یہ کیا کہ آپ نے لوگوں کے خطوط تو شائع کر دیئے ان کا حل قارئین پر چھوڑ دیا۔ اس لئے لوگ پوچھتے ہیں کہ رئیس صاحب کا مقصد کیا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کے بچکے کے سامنے کسی صاحب کا انتقال ہوا تھا تو میں بھی آپ کے ساتھ وہاں گیا تھا کھانے پر ٹیبلیراف کے ایک اعلیٰ افسر نے آپ سے یہی کہا تھا کہ پڑھتے تو ہیں ہم، سمجھ میں کچھ نہیں آتا، بچے کچھ نہیں پڑتا، ہوتا یہ ہے کہ غالباً افراد متعلقہ ہی اس سے مستفید ہوتے ہوں گے۔ حذرم اس میں شبہ نہیں کہ محض الفاظ کی جادوگری سے (ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے نہیں) آپ نے ہزاروں نہ سہی ٹیکڑوں کی اصلاح کر دی اور یہ بھی بڑی بات ہے، مگر آپ صرف دوسروں کی بکری بنا جاتے ہیں تو یہ بھی بڑے کام کا کام ہوتا ہے۔

ازراہ کرم

سید انیس شاہ جیلانی نے ازراہ محبت جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں، قارئین سے میری درخواست صرف یہ ہے کہ اگر انہیں کسی سوال کا جواب مبہم اور الجھا ہوا نظر آئے تو ازراہ کرم اس کی نشاندہی کر دیا کریں۔ میں بعض خطوط کے اقتباسات نقل ہی اس لئے کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس آئینے میں اپنے چہرہ نظر آجائیں، نفسیاتی مریضوں کے مسائل اور ان کی ذہنی الجھنیں بہت حد تک ایک جیسی ہوتی ہیں، اور میرے نزدیک ان کا حل بھی ایک ہے یعنی میری تجویز کردہ مشقیں (نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت یا S.S.T) پابندی سے کرنی جائیں اور میری ہدایت پر مکمل عمل کیا جائے تو انسان بہت حد تک ذہنی الجھنوں سے نجات پاسکتا ہے۔ بخدا میں روحانی پیشوائی کا نہ

مدعی ہوں اور نہ اس کا اہل، مشکل یہ ہے کہ آج بھی نفسیات کے فن کو سائنس کے بجائے ”سحر سامری“ کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔ فن نفسیات سائنس ہے کہ نہیں اس کا جواب تو معالجین نفسیات ہی دے سکیں گے۔ البتہ یہ بات نہایت وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نفسیات سحر و ساحری ہرگز نہیں ہے۔ جہاں تک کہ الفاظ کی جادوگری کا تعلق ہے تو ایک حد تک نفسیاتی علاج معالجہ الفاظ کی تاثیر ہی سے تعلق رکھتا ہے آپ ایک شکستہ دل انسان سے یہ کہہ دیں کہ ماشاء اللہ آج چہرے پر کافی بشارت ہے۔ تو چند لمحے کے لئے شکستہ دل اور افسردہ خاطری کی کیفیت زائل ہو جائے گی اور کسی صحت مند کے منہ پر کہہ دیں کہ نصیب دشمنان یہ کیا حال ہو گیا تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے قدم ڈمگ جائیں گے۔ یہی تو ہے الفاظ کی جادوگری۔

یہ فیصلہ

بہر حال میں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ ان مضامین میں انہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر ہوتا ہے تو فوراً مجھے میری کوتاہ قلمی اور کوتاہ نظری پر ٹوک دیں اور جہاں تشنگی کا احساس ہو بغیر کسی جھجک کے اصلاح دے دیا کریں۔ میں اور میرے پڑھنے والے تعلق خاطر کے ایک اُن دیکھے دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں جس طرح میں ہر روز (خطوط اور مضامین کی صورت میں) ان کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں اسی طرح انہیں گاہے گاہے مجھے کو مخاطب کر کے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہئے۔ ہاں تو اس گفتگو کا آغاز یہاں سے ہوا تھا کہ دنیا بھر کے علوم و فنون کا مطالعہ آسان ہے، لیکن انسان کا مطالعہ مشکل ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

کہ خبث نفس نہ گردد بہ سالہا معلوم

نفس کی خباثت اور بدی کا پتا برسوں تک نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ آپ پچاس سال تک ایک شخص کو ”ولی اللہ“ سمجھتے رہیں اور اکیاون سال میں آپ کو معلوم ہو کہ وہ تو کاشیطان تھا۔ ابلیس نے کروڑوں سال تک عرش الہی کے ایک گوشے میں عبادت کی۔

فرشتوں کو درس دیئے معلم الملوک (فرشتوں کے استاد) کا خطاب پایا۔ مگر ایک ارب سال کی عبادت کے بعد جب امتحان (آدی کو سجدہ کرنے کا) موقع آیا تو معلم الملوک مردود اور شیطان ثابت ہوا۔ یقین کیجئے کہ ہر انسانی نفس الف لیلیٰ کی طلسمی بوتل ہے جس میں ایک ”جن“ بند ہوتا ہے یہ ساری تمہید میں نے اس لئے اٹھائی ہے کہ میرے قارئین ان مضامین کی ترحیب میں میری مدد کریں۔ مشورے دیں کوتاہیوں کی طرف اشارہ کریں۔ غلطیوں کی نشاندہی فرمائیں، تاکہ خامہ فرسائی اور قلم کی گھس گھس نکھنے والے پڑھنے والے کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔

جس نے خود کو پہچانا

اچھا آئیے! اب ایف۔ ج۔ طاعت کے خط کا مطالعہ کریں، لکھتے ہیں کہ۔ میری طبیعت بچپن ہی سے اصلاح نفس کی طرف مائل ہے۔ اصلاح نفس کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے۔ چلو و ظیفہ، مذہبی اشغال کی پابندی اور فن نفسیات کا مطالعہ دوسروں کا اور اپنا ذہنی جائزہ اور نفسیاتی محاسبہ اپنے متعلق میرا خیال ہے کہ سنجیدہ، حقیقت پسند اور جمالیاتی ذوق کا مالک ہوں۔ اقتدار پسندی کا جذبہ ذہن پر غالب ہے۔ میرا نام الف۔ ج۔ ہے۔ سادات سے متعلق ہے۔ نانا مرحوم بہت اچھے بزرگ تھے، بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا خالہ نے اپنے سایہ شفقت میں لے لیا، چونکہ سب بچوں میں کم عمر تھا۔ لہذا ڈھیروں لاڈ پیار میرے حصے میں آیا۔ بچپن ہی سے میرا رجحان، روحانیت کی طرف تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ میں بہت سی قوتوں کا مالک ہوں۔ بچپن ہی میں قول ذہن پر چپک کر رہ گیا تھا کہ، جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا (مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ) میں نے اپنے اندر حسب ذیل قوتیں محسوس کیں۔ خواب یا بیداری کی حالت میں ایسے اشارے ملتا جن کا تعلق مستقبل سے ہے۔ مثلاً میں بیٹھا ہوں، باہر جانے کا ارادہ ہے، اچانک نظر کے سامنے ایک وژن (تصور) آتا ہے۔ اتنا واضح کہ گویا میں سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت فلاں

دوست فلاں جگہ ہے اور فلاں جگہ موقع پر ملے گا۔ پھر ایسا ہی ہوتا ہے یہی نہیں کبھی کبھی تو یہاں تک معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں عزیز یا دوست تکلیف میں ہے بیماری میں مبتلا ہے۔ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ضمیر سے آواز آئی کہ تم کتنی ہی کوشش کرلو۔ فلاں کام نہیں ہوگا، حالانکہ بظاہر وہ کام یقینی ہے اس میں کسی شے کی گنجائش نہیں، تاہم باوجود امکانی کوشش کے کام نہیں ہوتا، جس زمانے میں آپ نے نفسیات و مابعدالطبیات پر لکھنا شروع کیا تھا مجھے نفسیات کے فن سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ آپ کے مضامین نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ میرے پاس شروع کے تمام مضامین کی قسطیں ہیں جن کے اہم نکات کو میں نے خط کشیدہ (انڈر لائن) کر دیا ہے۔ آپ کی تحریروں سے 1964ء سے 1965ء بلکہ 1966ء تک جو استفادہ ہوا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

چراغی تک پرواز

میں نے سانس کی مشقیں شروع کیں، پابندی نہ ہو سکی۔ تاہم ذہنی بحالی اور روحانی ترقی کے لئے ان مشقوں کو بے حد مفید اور موثر پایا۔ کم و بیش آٹھ نو مہینے شیخ بنی کی، شیخ بنی سے توجہ میں رکھوں اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ شیخ بنی میں محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی آدمی سو رہا ہے، میں اسے جگاتا ہوں، وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اور پھر سو جاتا ہے، شیخ بنی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ آنکھیں بند کر کے لیٹا اور جہاں چاہتا، چلا جاتا یعنی یہ تصور کر لیتا کہ میں اس وقت وہاں ہوں اس کیفیت میں عجیب عجیب تجربے ہوئے۔ یہ محسوس ہوتا کہ اڑا چلا جا رہا ہوں جیسے بادل کا ٹکڑا، ایک مرتبہ مردان میں تھارات میں (شیخ بنی کے بعد) آنکھیں بند کیں اور تصور کیا کہ ہوا میں پرواز کر رہا ہوں۔ بارش، جنگل، دریا، پہاڑ، گزرتے چلے جا رہے ہیں اور میری پرواز جاری ہے، یہ سارے مناظر حقیقی نظر آتے تھے اور میں ان سب سے لطف اندوز ہو رہا تھا، یہاں تک کہ مردان سے کراچی پہنچ گیا۔ پھر یہ خیال کیا کہ سفر حج کیا جائے اور وہ بھی پانی کے جہاز سے! کراچی کی فضا میں پرواز کرتے ہوئے سمندر نظر

آیا۔ پانی پر جہاز رواں دواں تھا کہ جوئی جہاز پر اترنا چاہا۔ توجہ کا تسلسل ٹوٹ گیا اور سارا منظر غائب ہو گیا۔ کیا بتاؤں کہ کس قدر افسوس ہوا۔ ایک مرتبہ پرواز کرتے ہوئے عالم تصور میں پاکستان سے عرب پہنچ گیا۔ نیچے کھجور کے درخت پھیلے ہوئے تھے اور ریگستان! کس قدر..... حیرت انگیز اور ہوش ربا نظارہ تھا۔

آپ کو دیکھا کہ

ایک روز اسی تصور کے عالم میں آپ سے ملاقات کا خیال آیا۔ میرے ”خیال“ نے اپنی جگہ سے پرواز کی (خیال نے پرواز کی کا فقرہ اس لئے استعمال کیا کہ جسم بدستور چارپائی پر موجود تھا۔) محسوس ہوا کہ میرے خیال کی لہریں آپ کے دماغ سے ٹکرائیں واپس تو آ رہی ہیں مگر آپ کا کوئی پیغام نہیں لارہیں، یہ بھی دیکھا کہ آپ بیدار ہیں مگر کسی کام میں مصروف ہیں۔ یہ بھی عرض کروں کہ ”پرواز خیال“ کی حالت شب سہیں غنودگی کے وقت طاری ہوتی ہے، دل میں کئی بار کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا،

نہ جانے کیا بات ہے۔
ہم زاد کا عمل

آپ نے کسی مضمون میں ہمزاد کے عمل کا ذکر کیا تھا۔ اور اس کی ترکیب لکھی کہ چاندنی میں سائے پر نظریں گاڑ کر دماغ ذہن اور توجہ کی قوت اس نقطے پر لگا دی جائے اور آسمان کے نسبتاً تاریک حصے کی جانب دیکھا جائے تو اپنا سایہ وہاں تیرتا نظر آئے گا، میں نے اس عمل کو شروع کیا۔ چند روز کے بعد سر پر سایہ نظر آنے لگا مگر اس رنگ سیاہ تھا، پھر سائے میں چاند جیسی ہلکی نیلی روشنی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک روز سایہ آسمانی فضا میں بالکل نمایاں ہو گیا۔ یکایک یہ خیال آیا کہ میں زمین پر ہوں اور میرا سایہ آسمان پر ہے سائے کو میری طرف آنا چاہئے، اس خیال کے ساتھ ہی کیا دیکھ کہ سایہ حرکت کر رہا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ زمین پر اتر آیا۔ مجھ سے

چند گز کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا، پھر اور قریب آیا اور قریب آیا اور قریب آیا۔ تا آنکہ میرے جسم میں سما گیا۔ ان مشتوں کے سبب میں نے آپ کو روحانی استاد تسلیم کر لیا۔ آپ کو یاد ہوگا، ایک مرتبہ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بستر پر سوتا ہوا دیکھے، اگر ممکن ہے تو وہ کون سی چیز ہے جو سوتا ہوا دیکھ رہی ہے (کیونکہ آدمی تو بستر پر سو رہا ہے)

حادثہ جانکاہ

میری یہ پراسرار قوتیں آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہی تھیں کہ میری پیاری، بے حد محبت کرنے والی خالہ کی موت کا حادثہ جانکاہ پیش آیا۔ نہایت دل توڑ دینے والا صدمہ تھا۔ خالو صاحب بھی بچھ کر رہ گئے۔ اگرچہ غم و الم کا اتنا بڑا پیرائہ سر پر ٹوٹ چڑھا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ میرے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ خالہ کی وفات کے بعد گھر کا سارا انتظام میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا، گھر کا بندوبست خود کرنے لگا۔ مہمانوں کی خاطر مدارات، غم زدہ خالو کی خدمت یہ تمام فرائض میں نے بخوش اسلوبی ادا کئے۔ ایک مہینے تک گھر میں تنہا میں یہ تمام کام داریاں پوری کرتا رہا۔ مہینے بھر کے بعد والد بھائی کراچی سے آ گئے اور انہوں نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں کتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہو گیا ہوں۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے بہنے لگا اور بری حالت ہو گئی۔ اس زمانے میں شمع بنی چھوٹ گئی اور ایسا لگا کہ ساری قوتیں ختم ہو گئی ہیں۔ نہ مستقبل بنی کی صلاحیت باقی ہے نہ پرواز خیال کی تقریباً آٹھ مہینے یہی بحران طاری رہا۔ لیکن اب پھر سنبھل رہا ہوں، وہی قوتیں بیدار ہو رہی ہیں، فرمائیے کیا کروں۔

تبدیلی قلب کے لئے

الف۔ رح طلعت کو میں نے خط کا براہ راست جواب دے دیا ہے۔ سید انیس شاہ جیلانی کو شکایت ہے کہ آپ خطوط تو نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن اطمینان بخش جواب نہیں

دیتے ان کی شکایت بسر و چشم، لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے دس سالہ تجربہ کے مطابق ذہنی بحالی و دماغی چستی اور اندرونی قوتوں کی بیداری کا واحد طریقہ یہ ہے کہ نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کی مشقیں استقلال کے ساتھ کی جائیں۔ جسم کی بعض بیماریوں کا علاج گولیوں، سفوف، عرقیات، شربت، انجکشن اور آپریشن کے ذریعہ نہ صرف ممکن بلکہ مفید ہے۔ بعض اوقات دوا کے بغیر چارہ نہیں، اگر کسی پر ہڈیاں یا ہچکان کا دورہ پڑ جائے تو بلاشبہ اسے سکون بخش گولیاں کھلانی چاہئیں۔ لیکن کسی اکسیر اور کسی آب حیات سے شخصیت کے بنیادی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کے نفس میں کوئی مٹھی پڑ گئی ہو مثلاً آپ کسی احساس میں مبتلا ہو گئے ہیں، یا خوف کے دورے پڑتے ہیں، یا مجمع سے گھبراتے ہیں، لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، دوسروں کے سامنے زبان نہیں کھلتی، یا اگر آپ مستقل گھبراہٹ کے مریض ہیں، بیزاری کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ صنفِ مقابل کی تاب نہیں لاسکتے۔ جنسی کج روی میں مبتلا ہیں، یا ہر وقت اندر سے یہ آواز آتی رہتی ہے کہ میں مجرم اور گناہ گار ہوں یا اپنے آپ کو ناپاک محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ ناپاکی کا کوئی غائبی نہیں، یا ایک فضول سا خیال آتا ہے تو وہ دماغ سے چپک کر رہ جاتا ہے، یا دکھنے یا دکھ دینے کو جی چاہتا ہے۔ خود ستم اٹھا کر یا دوسروں کو سزا کر لذت محسوس ہوتی ہے، عملی جدوجہد سے بھاگتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خیالات کی جنتوں میں گم ہو جاتے ہیں یا اپنے بارے میں مبالغہ پسندانہ رائے رکھتے ہیں کہ میں یہ ہوں۔ مگر خالم دنیا میری قدر نہیں کرتی۔ یا خواہ مخواہ اندیشوں میں گھرے رہتے ہیں۔ مثلاً میری حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ میں تپ دق (ٹی بی) کا مریض ہو جاؤں گا، یا مجھے سرطان (کینسر) ہونے والا ہے۔ یا وہم کے بیمار ہیں، ہر شخص پر شبہ کرتے ہیں۔ الغرض یہ اور اس قسم کی دوسری الجھنوں میں اسیر ہیں تو اس کا علاج دوا کے ذریعہ ممکن نہیں، شخصیت کی مٹھی اس وقت سلجھ سکتی ہے جب اسے ناخن تدبیر سے کھولنے کی کوشش کی جائے۔ دوا، غذا، پرہیز اور جسمانی ورزش یہ ساری چیزیں برحق ہیں۔ مگر ایک حد تک

انسان کی تبدیلی قلب کے لئے شعوری کوششوں کی ضرورت ہے جسم اور نفس یعنی ذہن و بدن کے درمیان کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اس کا تخمینہ لگانا آسان نہیں، ہاں یہ مقولہ صحیح ہے کہ صحت مند دماغ کے لئے صحت مند جسم ضروری ہے بخار میں ذرا سی بات آپ کو ناگوار گزرتی ہے۔ درد سر ہو تو سوچ بچار میں خلل پڑ جاتا ہے۔ معدہ خراب ہو تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ روزمرہ کے مشاہدے اور تجربے ہیں اور ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ جسم کس حد تک ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن ذہن کی جسم پر اثر اندازی کی حدود کا ابھی تک تعین نہیں ہو سکا اور درحقیقت ذہنی مسائل کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ان کے بارے میں فوراً کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی جاسکتی، بے شک بہت سے قارئین کو میرے جوابات سے تشکی کا احساس ہوتا ہوگا، لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ انسان کا نفس اور انسان کی روح یہ دو چیزیں انتہائی، اُن دیکھی اور اُن بوجھی چیزیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم یعنی آدم کی اولاد، کئی لاکھ سال سے کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ سوال لاکھ تک کی تحقیق ہو چکی ہے۔ ان لاکھ سوال لاکھ سال میں جسم کی حد تک تو بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ لیکن روح کے متعلق (خاص علم اور مائنس کی روشنی میں) کچھ چٹا نہیں چلا کہ یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر یہ کیفیت ہو تو مجھے معذور تصور کیجئے اگر میں کسی سوال کا جواب تسلی بخش نہ دے سکوں۔ اب ایک مرتبہ الف۔ ح طلعت کے معاملے پر نظر ڈالتے ہیں۔

(1) یہ ایک حساس نوجوان ہیں۔ (2) انہیں بچپن ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غیر معمولی قوتوں کے مالک ہیں۔ (ان کے تجربات کو ایک بار پڑھ لیجئے)۔ سوال یہ ہے کہ میں انہیں کیا مشورہ دوں؟ میں نے طلعت کو لکھا ہے کہ وہ میری تجویز کردہ مشقیں کر لیں تو یہ ساری قوتیں جو کبھی دب جاتی ہیں، کبھی ابھر آتی ہیں۔ پوری طرح نمایاں ہو جائیں گی۔

۱۔ جدید تحقیقات کے نتیجے میں ثابت ہوا کہ ماڑھے سترہ لاکھ سال پہلے زمین پر انسانی آبادی موجود تھی۔

یہ بات

یہ بات یاد رکھنے کی ہے اور یاد رکھنی چاہئے۔ کہ دنیا کے ہر فرد کے نفس میں مستقبل جینی کی صلاحیت موجود ہے، سچے خواب دیکھنے کی استعداد موجود ہے۔ لوگوں کے دلوں کو پڑھنے کی قوت پائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان ”موجودات ذہنی“ کو فسانہ نہیں حقیقت سمجھئے ہوتا یہ ہے کہ بعض افراد کی اندرونی قوتیں پوری طرح اور اچھی طرح بروئے کار آ جاتی ہیں۔ اور بعض بلکہ بکثرت (سو میں ننانوے) ان قوتوں کی موجودگی سے بھی بے خبر ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی اندرونی شخصیت مرجھا کر رہ جاتی ہے اور وہ شکایتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جنہیں ہم نفسیاتی امراض یا روحانی بیماریاں کہتے ہیں۔ اکثر بیشتر نفسیاتی الجھنوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ نفس پوری طرح بروئے کار نہیں آنے پاتا۔

دلربا لڑکی

س۔ م۔ ف (راولپنڈی) لکھتے ہیں کہ:

میری عمر بائیس سال کی ہے، شادی کو چھ مہینے ہوئے ہیں۔ یہ عرض کر دوں کہ شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ والدہ نے میری پسند کو نظر انداز کر کے اپنے بھائی کی لڑکی سے میری شادی کر دی۔ حالانکہ میرا راجحان ہی کیا، تعلقات اور حد درجہ بے تکلفانہ تعلقات کسی اور سے قائم تھے۔ وہ ایک دلربا لڑکی تھی جب میرے قریب بیٹھتی تو محسوس ہوتا کہ جسم میں خون نہیں آگ دکھ رہی ہے۔ جب تک اس آگ کو سرد نہ کر لیتا سکون نہ ملتا شادی کے بعد بھی اس سے ملتا ہوں، تو آتش شوق میں جلنے لگتا ہوں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میری رفیقہ حیات نہ دلکش ہے نہ دلچسپ، جب وہ میرے قریب آتی ہے تو رگوں میں محسوس ہوتا ہے کہ خون جم گیا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے، مگر اس سے کہ

نہیں سکتا کہ۔۔۔ ”تم سے مجھے نفرت ہے“ جب ہم یکجا ہوتے ہیں۔ تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بلا ہے جو مجھے نکل جائے گی۔ اگرچہ بیوی میرا بہت خیال رکھتی ہے مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ لیکن میرے ذہن نے اُسے بیوی کے طور پر قبول نہیں کیا۔ مجھے اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے سے نفرت ہے۔ گھن آتی ہے مجبوراً مجھے اس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ میرے لئے کھانا نہ پکایا کرے۔ اس سلسلہ میں میرے گھر والوں کو بھی بے حد تشویش ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب میری بیوی میرے قریب بیٹھتی ہے تو میری ساری قوتیں جواب دے جاتی ہیں، اس کے برخلاف محبوبہ پر نظر پڑتی ہے تو جوان ہو جاتا ہوں۔

ہر کہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

اب میرے دماغ میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے اسے لے کر دور کہیں چلا جاؤں، اگر میں نے یہ قدم اٹھایا تو ظاہر ہے کہ میری اس کی اور ہم سب کی کتنی بدنامی ہوگی؟ میری بیوی ماموں زاد بہن ہے، اس پر کتنا ظلم ہوگا؟ خدا کی قسم اگر میں اس عذاب سے چھوٹ جاؤں۔

تلوار کی دھار

س۔ م۔ ف محبت و نفرت کے قطب شمالی اور قطب جنوبی کے درمیان معلق کھڑے ہیں۔ ان کی محبتوں کا تمام خزانہ ایک کے لئے وقف ہے۔ ان کی نفرتوں کی بوچھاڑ دوسری کے لئے۔ یہ بڑی تشویشناک صورتحال ہے۔ اس قسم کے سوالوں کا واضح، قطعی اور حتمی (کیسز کٹ) جواب دینا آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان معاملات کی تہوں میں بہت سی نزاکتیں اور گتھیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک ان کی قانونی بیوی اور دوسری روحانی ساتھی، قانونی، شرعی، سماجی اور اخلاقی بیوی ان کی ماموں زاد بہن بھی ہے۔ بیوی سے تعلقات کی خرابی پورے خاندانی معاشرے کو تکلیف کر دے گی۔ س۔ م۔ ف تلوار کی دھار پر چل رہے ہیں۔ اگر ذرا سی بھی لغزش ہوئی تو خاندان دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ سوال

یہ ہے کہ کیا کیا جائے اس کا جواب آسان نہیں۔ مجھے مکتوب نگار کی جذباتی کشش اور ان کے ذہنی کرب کا پورا پورا اندازہ ہے تاہم انہیں یہ رائے دینا کہ محبوبہ کو لے کر کہیں بھاگ جائیں۔ گویا خودکشی کی ترغیب دینا ہے نہ بیوی کا مسئلہ جذباتی طور پر حل ہو سکتا ہے نہ محبوبہ کا۔۔۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی کیفیات قلب کا علم رکھنے کے باوجود یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیوی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے۔ شادی کی ہانی بھری، جب بنیاد کی اینٹ ہی میزجی رکھی جاتی ہے تو چھت دیوار تک میزجی چلی جاتی ہے۔ شادی کی ایجاب و قبول کے بعد س۔م۔ف کی خاموشی سے تین زندگیاں خراب ہوئیں خود ان کی، ان کی بیوی کی، اور ان کی محبوبہ کی! اب کیا ارادہ ہے ان تینوں زندگیوں کو مزید تباہ کر دیا جائے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے، ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ بعض جسمانی بیماریوں کی طرح بعض روحانی بیماریاں بھی لاعلاج ہوتی ہیں۔ اب تک سرطان کا تسلی بخش علاج دریافت نہیں ہوا۔ اگر کوئی شخص کینسر میں مبتلا ہو جائے تو آپ اسے کیا مشورہ دیں گے؟ یہی تا کہ علاج میں کوتاہی نہ کرو، اور مستقبل سے مایوس نہ ہو۔ خود سرطان کا مریض بھی انجام کار اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسے "نرمانی برضا" رہنا چاہئے، اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے۔ س۔م۔ف روحانی سرطان میں مبتلا ہیں۔ انہیں وہی طرز عمل اپنانا چاہئے جو ان حالات میں مایوس علاج مریض اپنایا کرتے ہیں یعنی صحت کے حصول کی کوشش کرنا اور امید قائم رکھنا، ابھی ان کی شادی کو چھ ماہ گزرے ہیں۔ یقیناً یہ چھ ماہ انہوں نے سخت بیزاری، محرومی اور کرہا کی کے عالم میں بسر کئے ہیں۔ س۔م۔ف کے ذہن نے اب تک بیوی کو بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا، یہ حالت پریشان کن تو ہے لیکن اگر ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے انتہا پسندانہ ترکیبیں استعمال کی گئیں۔ مثلاً س۔م۔ف بیوی کو طلاق دے دیں یا محبوبہ کو لے کر فرار ہو جائیں۔ تو عمر بھر کی تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ جسم میں سے پھانس نکالنے کے لئے بھالا استعمال کیا جائے۔ بیوی سے نفرت ایک امر واقعہ ہے۔ یہ امر واقعہ ایک سنگین حادثے میں تبدیل ہو جائے

گا۔ اگر انہوں نے ذکر کئے ہوئے دو راستوں (طلاق/فرار) میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی حماقت کی، فی الحال س۔م۔ف کو میرا مشورہ یہ ہے کہ آنے والے چھ مہینوں میں اصلاح حال کی کوشش کریں، کوشش کر کے تو دیکھیں۔ انہیں اعتراف ہے کہ بیوی ان سے غیر معمولی محبت کرتی ہے جان چھڑکتی ہے۔ ممکن نہیں کہ س۔م۔ف کا دل ہمیشہ اس کی طرف سے کڑ بنا رہے ہو سکتا ہے یہ پتھر محبت کی آٹھ سے پتھلے گئے۔ س۔م۔ف بھلت میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ یاد رکھیں کہ روحانی زخموں، صدموں کا سب سے بہتر معالج "وقت" اور صرف وقت ہوتا ہے۔ وہ معالج وقت کو چھ ماہ کی مہلت دے دیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل کی سنگین دیوار میں کوئی ہوادار دریچہ کھل جائے۔

کج رائی بہت

کیا شعر ہے مولانا حالی کا۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت

پہ جوانی ہم کو یاد آئی بہت

میرا نام ہے کج رائی کج رائی اور کج رائی کی داستانیں لکھ کر بیچتے ہیں اور میرا مشورہ چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھئے، اسی ایک بات کو طرح طرح سے لکھ چکا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر سنی، آسانی کے لحاظ سے انسانی زندگی کو سات سال کے دس درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک سال سے سات سال تک، سات سال سے چودہ سال تک، چودہ سال سے اکیس سال تک، اکیس سال سے اٹھائیس سال تک، اٹھائیس سال سے پینتیس سال تک، پینتیس سال سے بیالیس سال تک، بیالیس سال سے انچاس سال تک، انچاس سال سے چھپن سال تک، چھپن سال سے تریسٹھ سال تک، تریسٹھ سال سے ستر سال تک۔ (اوسط انسانی زندگی کی شرح یہی ہوتی ہے) ہر سات سال ایک دور حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ بچپن کے سات سال تیز جسمانی نشوونما کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں بچے کا ذہن خام اور نفس ناپختہ ہوتا ہے اور وہ گرد و پیش کے اثرات اس گہرائی اور گیرائی سے

قبول کرتا ہے کہ ابتدائی نفوش تاثر عمر بھر کے لئے امنت ہو جاتے ہیں۔ میں نے ہزاروں ذہنی مریضوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور ہمیشہ ان کی جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپے پر بچپن کے اثرات کی گہری چھاپ پائی ہے سات سے چودہ سال تک کا زمانہ بھی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے اعتبار سے اہم ہوتا ہے اور کچ راکھ راکھ کی بنیادیں اس زمانے میں پڑتی ہیں۔ جن کا بھرپور اظہار تیسرے سات سالہ دور (14 تا 21) میں ہوتا ہے۔ کچ راکھ سے میری مراد جذباتی میزاج اور جنسی کچ راکھ ابتدائے جوانی میں انسان کے بعض ایسے غدد تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں جن کا تعلق عورت کے عورت پن اور مرد کی مردانگی سے ہے۔ یہ زمانہ بچوں اور بچیوں کے لئے سخت تشویش کرب اور اضطراب کا زمانہ ہوتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ جسمانی طور پر بدل رہے ہیں لڑکوں اور لڑکیوں میں بلوغ سے قبل و بعد جو عضوی تبدیلیاں (اُبھار، گولائیاں، جسم کے مختلف حصوں پر بال، آنکھوں میں چمک، آواز میں تبدیلی، چہرے پر شباب اور دوسری علامت بلوغ) نمودار ہوتی ہیں۔ انہیں تو سب دیکھ لیتے ہیں لیکن اُن کے ذہن و نفس میں جو ہلچل برپا ہوتی ہے۔ سینہ جس طرح محشرستان بے قراری بن جاتا ہے۔ انجان تمنا میں روح کی جس طرح کدکداتی ہیں خوابوں میں جو رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ تصورات میں جو انوکھا پن سما جاتا ہے، اس کا اندازہ ایک بالغ لڑکا اور لڑکی ہی کر سکتی ہے۔

دنیا جوان تھی میرے عہد شباب میں

تو اس عہد شباب میں دانش یا نادانستہ طور پر نو جوان ایسی حرکتوں میں مبتلا اور ایسی عادتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ جنہیں قوت کا بے تحاشہ استعمال کہا جاسکتا ہے۔ اُن کا نفس ایک انجانی لذت کا متلاشی رہتا ہے اس لذت کے حصول کا قریب ترین اور آسان ترین ذریعہ خود اپنا جسم ہے۔ جنسی کچ راکھ کوئی ایک شکل میں نہیں ہزاروں شکلیں ہیں، بلکہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ ہر نو جوان اپنے سکون کے لئے کسی نئی راہ کی تلاش میں رہتا ہے۔ خود لذتی، ہم جنس پرستی، نیم خوابی، لڑکیوں کی یہ خواہش کہ وہ مردوں کی طرح

اظہار قوت کریں۔ اور لڑکوں کی یہ تمنا کہ انہیں لڑکیوں کی طرح برتا جائے۔ اسی ایک بیجان قوت کے مختلف مظاہر ہیں۔ جنسی خامی اور خام کاری کا ذہنی ناچنگی سے گہرا تعلق ہے۔ اگر ذہن کی مناسب نشوونما چودہ سال کی عمر تک نہ ہو پائے تو جنسی انحراف یعنی جذباتی طور پر بھٹک جانے کی منزل ضرور آئے گی کوئی لڑکا یا لڑکی اس جذباتی بیجان سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن کہاں ہے کہ خون میں بجلیاں دوڑ رہی ہوں اور جسم نہ سنبھلے۔ نوے فیصدی لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ مختلف پگڈنڈیوں پر بھٹکنے کے بعد، عقل، مصلحت اندیشی کی رہنمائی میں آخر شاہراہ حیات پر حقیقت پسندی کے ساتھ گامزن (ہو جاتے اور) ہو جاتی ہیں۔ البتہ دس فیصدی اپنی جگہ ایک کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے جسم سے کھیلنے کا تجربہ نہ تو حیرت انگیز ہے، نہ مخصوص، بلکہ یہ دور شباب کی ایک عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ جو بچے اور بچیاں تنہائی اور محرومی اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی واحد جائے پناہ ہوتی ہے۔ جنسی لذت اندازی کی عادت، جنسی کچ راکھ کا علاج صرف ایک ہمدرد، شفیق اور حقیقت پسند آدمی ہی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دوا کی ضرورت بہت کم اور گاہے گاہے پڑتی ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ پوجاوتی کے نام سے ہوئے نو جوانوں کو از سر نو زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی جائے۔ ہر شخص کے مسئلے بھی الگ ہوتے ہیں اور ان کے مسکوں سے نمٹنے کے طریقے بھی! سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نو جوانوں کو ملامت نہ کی جائے اور نہ چند وعظ کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے طنز کا پہلو نکلتا ہو۔ نو جوانوں کی اصلاح کے سلسلے میں طنز و ملامت، چند نصیحت کا سلسلہ چنداں مفید ثابت نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ ہم نو جوانوں کی جذباتی کشمکش کو سمجھیں، ان کے اندرونی بیجان کا تجزیہ کریں۔ ان کی محرومی، مایوسی اور کچ راکھ کے اسباب کی چھان بین کریں۔ پھر ان کی رہنمائی۔ حقیقت پسندی اور صحت مندی کی طرف آسانی ہوگی۔ میں جنسی کچ راکھ اور جذباتی کچ راکھ کے ستم رسیدوں کے لئے جنس نور کی چند مشقیں تجویز کیا کرتا ہوں اور علی العموم اس تدبیر میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

بے جنس ہوں

ن۔ زلا زکمانہ سے لکھتی ہیں کہ ”آپ کو شاید یاد نہ تھا کیونکہ آپ بے حد مصروف آدمی ہیں کہ میں نے دو سال قبل آپ کو اپنے مسئلے کے بارے میں تحریر کیا۔ توقع کے خلاف آپ نے جلد ہی جواب دے دیا۔ میں نے اس خط میں لکھا تھا کہ:

”مجھے بُرے بُرے خیالات ستاتے ہیں۔ جس قدر جھکتی ہوں اتنے ہی خیالات بھوتوں کی طرح میرا پیچھا کرتے ہیں اور مجھ پر غالب آجاتے ہیں۔ ان خیالات کو دبانے کے سبب اعصاب پر غیر معمولی بوجھ پڑتا ہے اور اعصابی بوجھ نے میری صحت خراب کر دی ہے۔ آپ نے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا کہ:

”آپ کے ذہن میں جس قدر خیالات آتے ہیں۔ انہیں آنے دیجئے اور گزر جانے دیجئے۔ خواہ وہ کتنے ہی گندے اور شرمناک ہوں، ہمیں جس طرح پیشاب یا منی پر قابو نہیں ہوتا۔ اسی طرح خیال بھی ہمارے بس سے باہر ہے۔ خیال آئے گا اور ضرور آئے گا، خواہ ہم اسے پسند کریں نہ کریں۔ ان خیالات کو زبردستی دبانے اور انہیں روکنا، خطرناک اور تباہ کن اور ذہنی صحت کے لئے سخت نقصان رساں ہے۔ خیالات کو دبانے کی بجائے یہ مہلک ہے، جتنا زہر پیلا، اسی کے ساتھ آپ نے دو مشقیں تجویز کی تھیں۔ تحس نور اور خود نویسی۔ میں دو سال سے کوششیں کر رہی ہوں مگر آپ کی ہدایت پر ذرا عمل نہ کر سکی۔ میں ان خیالات کو روکنے اور ذہن سے یہ جبر دھکیلنے پر مجبور ہوں، کیونکہ مجھے یہ بھی وہم ہوتا ہے کہ ان خیالات کو آزادانہ طور پر ذہن میں آنے دیا تو مجھے سخت نقصان پہنچے گا۔ یہ عجیب طرح کی جان لیوا کشش ہے کاش میں آپ کی ہدایت پر عمل کر سکتی۔ ایک اور خوفناک تصور ذہن پر غالب آ رہا ہے۔ وہ یہ کہ میں ”بے جنس“ ہوں۔ یعنی میرا تعلق نہ لڑکیوں سے ہے نہ لڑکوں سے، بار بار اندر سے خوف کی لہر اٹھتی ہے کہ میرا شمار تیسری جنس میں نہ ہونے لگے۔ اگر ان خیالات کو نہ روکوں، نہ جھکوں (یعنی آپ کی ہدایت کے مطابق اس خیال کو بے روک ٹوک آنے دوں) تو عجیب حالت ہو جاتی ہے۔

رکھیں صاحب! آپ نے جو علاج تجویز کیا ہے کہ:

”کسی خیال سے خواہ کتنا ہی گندہ، شرمناک، مہمل پر از خطر، بھرمنا، کافرانہ اور ٹھکانہ کیوں نہ ہو ہرگز نہ ڈریئے۔ اور اس خیال کو ذہن میں آنے اور گزر جانے دیجئے۔“

جناب! میں اس خطرناک علاج پر قادر نہیں، کیا آپ کوئی متبادل علاج تجویز کر دیں گے۔

واحد علاج

نہیں بی بی! دنیا بھر میں اس کشش کا واحد علاج وہی ہے، جو میں نے تجویز کیا تھا۔ یعنی جتنے گندے اور غلیظ خیالات آئیں ان سب کو تفصیل کے ساتھ کاغذ پر لکھ لیجئے اور پھر اس کاغذ کو چاک کر کے پھینک دیجئے۔ جب بھی خطرناک خیالات کا ریا اور انہیں کاغذ پر لکھنا شروع کر دیجئے۔ خواہ ان گندی باتوں کو قلم بند کرنے سے ذہن کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ ن۔ زتم یہ بتاؤ کہ جب تمہارے معدے اور آنتیں اپنے گندے مواد کو خارج کر دیتی ہیں، یا خود بخود قے آجاتی ہے، قے آنا، قدرت کا طبعی نظام ہے، اسے روکنا، آنا، آنسو بہنا، قہقہہ خارج ہونا، پیشاب کرنا، بواسیر کا خون بہنا، نزلے کی کھانسی، چھینکیں، کھانسی، تھوک بہنا، ناک سے نکسیر پھوٹنا یہ سب وہ قدرتی تدابیر ہیں، جن کے ذریعے طبیعت جسم کے گندے مواد کو خارج کرتی ہے۔ اگر جسم سے فاسد اور زہریلے مادے خارج نہ ہوں، تو شدید بیماری بلکہ موت یقینی ہے، جو حالت جسم کی ہے، وہی حالت ذہن کی ہے۔ جس طرح جسم میں ناہضم شدہ (یعنی بچے ہوئے) مادے جمع ہو جاتے ہیں، اسی طرح ذہن میں ڈرانے والے جذبات کی تمہیں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ ہونکہ ان خیالات کے اعادے اور بازگشت سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے اس لئے انہیں دبانے پر مجبور ہیں۔ بھلا کون گوارہ کرے گا کہ وہ تکلیف پہنچانے والی یادوں کو دہرائے تاہم قدرت اپنے طریقوں پر عمل کرتی ہے۔ ن۔ ز ان خیالات کو کتنا ہی کیوں نہ دلائیں۔ یہ خیالات آئیں گے، بار بار آئیں گے، پے درپے آئیں گے۔ اور ان کی

زندگی کو اجیرن بنادیں گے۔ اگر وہ روحانی علاج چاہتی ہیں تو انہیں مشقِ حُسنِ نور اور خود نویسی ہی کرنی چاہئے۔

مہ رخوں کو دیکھ کر

نعیم عزیز (پنجاب) نے وہی بات لکھی ہے جو اٹھارہ سالہ لڑکے کو لکھنی چاہئے۔ اپنے خط مورخہ 7، جون 1972ء میں رقم طراز ہیں کہ:

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں خوب صورت لڑکوں کو دیکھتا ہوں، آپ سے کیا چھپانا؟ میں ان مہ رخوں کو دیکھ کر دیوانہ سا ہو جاتا ہوں، دل پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔ حسنِ اعضاء کے تناسب کا نام ہے، اور اعضاء کا تناسب مجھے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے، پتا نہیں دل کیا کیا چاہتا ہے۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

اے منجھلتے ہی میں اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ آٹھویں جماعت میں تھا کہ ”ج“ پر مرنے لگا۔ پھر ”م“ پر پھر ”ز“ پر اور آج کل ”ش“ پر فریفتہ ہوں۔ جو چیز حقیقت میں حاصل نہیں ہوتی اسے عالم خیال میں حاصل کر لیتا ہوں۔ کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر خیال کرتے ہیں، کہ ہم کس لعنت میں پھنس گئے۔۔۔ اپنے خاندان کی طرف نظر کرتے ہیں تو لرز کر رہ جاتے ہیں، کہاں ہمارے بزرگوں کا اخلاقی معیار۔ ان کا رکھ رکھاؤ، کہاں ہم؟ مزید پریشانی یہ ہے کہ استلذ از بالید (جسم سے ہاتھ کے ذریعہ لذت حاصل کرنا) کے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب بتائیے ہم کیا کریں؟ آپ اخبارات و رسائل میں نفسیاتی کالم لکھنے والے نفسیات دانوں کی طرح یہ نہ فرمائیں کہ میاں کس چکر میں پڑ گئے ہو؟ ایک دو مہینے بعد تمہارا GRADUATION کا امتحان ہونے والا ہے تم تعلیم میں جی لگاؤ اور ان خیالات سے باز آؤ، میں آپ سے متاثر ہوں۔ آپ کا مضمون پڑھ کر خیال ہوتا ہے، کہ واقعی نفسیات کوئی علم ہے، ”مجھے مشورہ دیجئے۔“

اگر نعیم عزیز کا خط پورا نقل کر دیتا تو آپ کو ان کے شاعرانہ ذوق اور تخیل آفرینی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا، نعیم عزیز کا ذہن شاعر ہے۔ اور ان کا انداز فکر بھی شاعرانہ ہے، یہاں تک کہ انہوں نے حافظ شیرازی کے نام سے ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔

اے دل! اگر از چاہ زخداں بدر آئی

ہر جا کہ روی زور پشماں بدر آئی

نعیم عزیز کی عمر 18 سال ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں شعر و ادب کا اتنا پاکیزہ ذوق قابلِ قدر ہے مگر اس 18 سالہ نوجوان کا شاعرانہ ذوق ہی اس کے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ بچپن کے کسی نہ کسی حادثے کے سبب ان کے جمالیاتی تصور میں قبل از وقت حرکت پیدا ہو گئی۔ اور وہ اپنے ہی الفاظ میں مہ رخوں پر مرنے لگے۔ ہائے! مہ رخوں کی مناسبت سے کیا شعر یاد آیا ہے۔

دیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

میں نعیم عزیز کو برادرانہ اور بزرگانہ مشورہ دینے پر تیار ہوں۔ لیکن اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ ان کی مکمل کس ہسٹری (واردات مرض) میرے علم میں ہو۔ نفسیات کا فن نہ مجاز پھونک کا فن ہے نہ اس کا تعلق جادو سے ہے، یہ تو قریب قریب ایک سائنسی طرز علاج ہے جب تک نعیم عزیز کے خاندانی پس منظر کا علم نہ ہو۔ یہ نہ معلوم ہو کہ ان کی عمر کے 14 سال کس جذباتی ماحول میں گزرے؟ مہ رخوں کو ٹکٹے کا شوق کب سے پیدا ہوا؟ ان کے خیال میں اس حد سے تجاوز کئے ہوئے رجحان کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ صنفِ نازک کے بجائے اپنی ہی جنس پر ان کی نظر کیوں ہے؟ یہ تمام سوالات جواب طلب ہیں۔ اگر نعیم عزیز کی نظر سے یہ مضمون گزرے تو وہ ان سوالات کے مفصل جوابات لکھ کر بھیجیں۔ میں ”واردات مرض“ پر غور کر کے انشاء اللہ کوئی مشورہ پیش کروں گا۔

کر لیتی ہوں۔ میں نے یہ خط بے حد ہمت کر کے لکھا ہے مجھے احساس گناہ مارے ڈالتا ہے اپنی بربادی کا افسوس ہوتا ہے، گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں، گیت گائے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھ پر کیا گزر رہی ہے اسے صرف میں ہی جان سکتی ہوں۔ میں ہی جانتی ہوں، مارے فکر اور اندیشے کے میری جان کھلی جا رہی ہے۔ اپنے مستقبل کو سوچ سوچ کر دہلی ہو گئی ہوں روح جسم سے زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔ (بد نصیب لڑکی۔ ع۔ ن)

ع۔ ن۔! اب تمہاری عمر بیس سال کی ہے، تمہارے منگیتر باہر تھے۔ اب وہ آنے والے ہیں، اور انشاء اللہ دو تین ماہ بعد تمہاری شادی ہو جائے گی، گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ گیت گائے جا رہے ہیں اور تم بقول خود مارے فکر کے کھلی جا رہی ہو۔ کیوں، اس لئے کہ تم آج سے بارہ سال پہلے کسی شرمناک حادثے کا شکار ہو گئی تھیں۔ تم سمجھتی ہو کہ تم برباد ہو گئیں اب سوائے تباہی کے کچھ باقی نہیں بچا۔ لیکن جاننا یہ سب تمہاری غلط فہمیاں ہیں۔ طبی اور سائنسی حقیقت کہ بارہ سال بعد انسانی جسم کی ظاہری ساخت تو وہی رہتی ہے لیکن اندرونی طور پر جسم بالکل بدل جاتا ہے، اور پرانے جسم کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ بی بی! دنیا کا ہر چیز ایٹم (نچے نچے برقی ذروں) سے مل کر بنی ہے۔ انسانی جسم جن نچے نچے ذروں سے مل کر بنا ہے انہیں سِلے (SELLS) کہتے ہیں۔ ہمارے جسم کے ہر مربع انچ میں کروڑوں خلیے ہوتے ہیں۔ ہر منٹ پر لاکھوں خلیے مرجاتے ہیں اور لاکھوں نئے خلیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب جسم پرانے خلیوں کے مرجانے اور نئے خلیوں کی پیدائش سے معذور ہو جاتا ہے، تو وہ واقع ہو جاتی ہے۔ وہی پرانا گھسا پٹا شعر سن لو:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

تو! ع۔ ن۔ تم جسمانی حیثیت سے وہ نہیں جو آٹھ سال کی عمر میں تھیں۔ اب بارہ سال میں تم جسمانی حیثیت سے بالکل بدل چکی ہو۔ وہ بچی جو آٹھ سال میں ایک

تباہ کن حادثے کا شکار ہو گئی تھیں۔ اب کہیں موجود نہیں، اس لئے کہ جسم کا ایک ایک خلیہ بدل چکا ہے۔ جسم ایک خود کار، خود کفیل اور خود کفایت مشین ہے۔ جو اپنی نوٹ پھوٹ کی مرمت خود کرتا رہتا ہے۔ وہ کسی شکاف اور دراڑ کو باقی نہیں چھوڑتا، ہر خلا کو بھر دیتا ہے۔ نہ جھپیں رونے دھونے کی ضرورت ہے نہ دہلی ہونے اور گھٹنے پکھلنے کی۔ تم ایک نئی ع۔ ن ہو، جسم کے اعتبار سے الہیہ ذہنی طور پر تم وہی بچی ہو جو اس سے قبل تھیں۔ انسان کی انا ذات یا روح کسی جسمانی تبدیلی سے متاثر و متغیر نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ وہی رہتی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ ہر بچہ یا بچی کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہوتا ہے اس میں اس کا قصور نہیں ہوتا۔ بہت سے بچے اغوا کر لئے جاتے ہیں۔ بہت سی بچیاں تشدد کا نشانہ بن جاتی ہیں کسی حادثے کو مستقل مرض نہیں بنالینا چاہئے۔ تم نے ایک تلخ یاد کو مستقل مرض بنا لیا ہے تا آں کہ خود کشی تک کا خیال آنے لگا۔ لا حول و لا قوۃ، انشاء اللہ دو مہینے بعد تمہاری شادی نہایت عمدگی اور خیر خوبی کے ساتھ انجام پائے گی۔ اور تم شاعر ترین از دو ابھی زندگی بسر کرو گی، اس سلسلہ میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ اچھا، اب اپنے آنسو پونچھ ڈالو اور دلہن بننے کی تیاری کرو، میرا قصہ ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے گا۔ تم اپنے متعلق سخت لطف جی میں مبتلا ہو۔ تمہارا جسم بھی پاکیزہ ہے اور روح بھی، بی بی! میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے غور سے پڑھو، بار بار پڑھو۔ میں تمہارے اندیشوں سے واقف اور تمہاری فکر مند یوں سے بے خبر نہیں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ اندیشہ فضول اور فکر مندی طفلانہ ہے۔ بھلا اللہ تمہارا ضمیر صاف، روح شفاف، دامن پاک اور تخیل پاکیزہ ترین ہے، تمہاری سب سے بڑی دولت و عظمت یہی ہے۔

جادو اور وظیفے

محبوب اللہ دکان دار محلہ جہانگیر آباد مسجد احمدیہ ضلع شیخوپورہ لکھتے ہیں کہ:

السلام علیکم۔ بڑی مدت سے آپ کے مضامین کا قاری ہوں۔ آپ کے مضامین کو ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں، اور ان کو پڑھ کر تقویت حاصل ہوتی ہے، بالکل

ایسا سہارا ملتا ہے جیسا والدین کی شفقت سے۔ آپ نے لکھا تھا کہ اپنی ناکامیوں کی وجہ اور ان کے اسباب و علل کو جانے بغیر انہیں جادو، ٹونے، ٹونکے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے کو قریب دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ رئیس صاحب چار سال سے اپنی ناکامیوں محرومیوں اور تباہیوں کے اسباب تلاش کر رہا ہوں اور ناکام ہوں جب سبب کی گرفت نہ ہو سکے۔ 2 تدبیر کی چارہ گری کام نہ آ سکے۔ 3 تقدیر روٹھ جائے، اس وقت انسان کیا کرے۔ تقدیر کو کس طرح جگایا جائے۔ ستاروں کی گردش کو کیسے بدلا جائے۔ بتائیے رئیس صاحب اس مخالف ترین صورتحال میں بندہ بچا رہے کیا کر سکتا ہے؟

بہت سعی کیجئے تو مر رہے میر

بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

ان چار سالوں میں کون سی افتاد ہے جو مجھ پر نہ پڑی، وہ کون سا دکھ ہے جس میں نے نہیں سہا، وہ کون سا فریب ہے جو میں نے نہیں کھایا، مگر بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ بچے بیمار پڑ گئے اور صورت یہ ہے کہ ایک صحت مند ہوتا ہے، دوسرا بیمار ہو جاتا ہے، بیوی کو سب وقت (T.B) ہوگئی اور اب وہ روحانی اور اقتصادی بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ اس زمانہ امتحان میں مختلف موتیں ہوئیں۔ خود میری حالت بیماروں سے بدتر ہے، مزاج میں چڑچڑاہٹ آگیا، کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہنسی مذاق سے طبیعت نفرت کرنے لگی۔ عزیز رشتے دار دور ہو گئے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ اس وقت دہا کے مصائب کا سامنا کرنے کے لئے اکیلا ہوں، اور تو اور سر صاحب تک نے لڑکی کو نہیں پوچھا۔ ایک پیسے کی دوا لا کر نہیں دی، نہ کبھی خود آئے نہ کوئی پیغام بھیجا، کاروباری حالت یہ ہے کہ میری کریانے کی دکان ہے۔ آج سے چار سال قبل اس دکان کی بکری ڈیڑھ سو روپے روزانہ سے کم نہ تھی، اب صرف پچیس روپے روزانہ ہے، یہ مہنگائی کا زمانہ اور پچیس روپے روز کی بکری (سیل) خود اندازہ کیجئے کہ اس میں کتنا منافع ہوتا ہوگا؟ پھر دوا دارو کا خرچ، نتیجہ یہ کہ اپنا سب کچھ سرمایہ کھو چکا ہوں۔ یہی نہیں، بلکہ مختلف دکان

داروں کا قریب بارہ سو کا قرضہ دینا ہے، اب علاج کی سنئے۔ ان بیماریوں اور آفتوں کا ہر ممکن علاج کرایا، ہومیوپیتھی، طبی اور روحانی مگر:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حال ہی میں ایک عامل عورت سے سابقہ پڑا۔ مشہور ہے کہ اس کے قبضے میں جن ہیں وہ حاضرات کرتی ہے۔ اس کی فیس سو پانچ روپے ہے وہ نو یا دس سال کے بچے کو اپنے پاس بٹھاتی ہے اور اس کو حکم دیتی ہے کہ آنکھیں خوب بند کر لو اور جو تمہیں نظر آئے۔ بیان کرتے چلے جاؤ، چنانچہ اس نے میرے دس سالہ بچے کو سامنے بٹھایا عمل پڑھا اور جو کچھ ہم پوچھتے رہے وہ لڑکے سے اس کا جواب دلاتی رہی۔ مثلاً ہم نے سوال کیا کہ ہم پر گردش کیوں آ رہی ہے؟ عامل عورت نے لڑکے کو حکم دیا کہ جن سے پوچھ کر اس کا جواب دو۔ (لڑکے کو آنکھیں بند کر کے جن نظر آتا ہے) لڑکے نے بیان کیا کہ (جن کہتا ہے) کہ آپ کے رشتہ داروں نے آپ پر جادو کرایا ہے، ہم نے سوال کیا کتنے آدمیوں نے جادو کرایا ہے؟ عامل عورت نے لڑکے سے کہا کہ جن سے کہو کہ جادو کرنے والوں کو حاضر کریں۔ عامل کے حکم پر معمول یعنی جبرے لڑکے نے کہا کہ میرے سامنے دو عورتیں اور ایک مرد ہے۔ ہم نے لڑکے سے پوچھا۔

”تم انہیں پہچانتے ہو؟“

”جی ہاں (لڑکے نے جواب دیا) خالو ہیں، خالہ ہیں اور پھوپھی یہی تینوں نظر آتے ہیں۔“

پھر سوال کیا گیا کہ

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“

لڑکے (معمول جو عامل کے حکم پر جواب دے رہا تھا) نے کہا کہ پھوپھی اور خالہ، امی کو تعویذ پلا رہی ہیں اور خالو دکان میں تعویذ دبا رہے ہیں۔ آخر عامل عورت نے عمل ختم کر دیا اور لڑکے سے کہا کہ آنکھیں کھولو۔

پھر ہم سے کہنے لگی کہ تمہاری ساری بد نصیبی ان ہی تعویذوں کے سبب ہے۔

ہم نے کہا کہ ان تعویذوں کا توڑ کیا کریں؟

کہا کہ انہیں نکلوا دو۔ اس پر عامل عورت خاموش ہو گئی، کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ پانچ مہینے سے نال منول کر رہی ہے، تعویذوں کا توڑ نہیں کرتی۔ سنا ہے کہ اس کی کافی فیس لیتی ہے۔ یعنی دو، ڈھائی سو روپے۔ سمجھتی ہے کہ یہ غریب آدمی ہیں، اتنی فیس کہاں سے دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی ساری کاروائی شعبہ بازی پر مبنی ہے۔ میں اس کی توجیہ کرنے سے قاصر ہوں، بعض اصحاب نے مختلف قرآنی آیتیں اور وظیفے بتلائے، پڑھا کوئی نتیجہ نہ نکلا، وظیفے پڑھنے کا شوق ہے اس کے علاوہ مختلف رسالوں اور کتابوں میں لکھے ہوئے وظیفے بطور خود پڑھتا ہوں۔ لیکن جب کچھ حاصل نہیں ہوتا شدید رد عمل ہوتا ہے۔ طبیعت مذہب سے سخت متغیر ہو جاتی ہے اور یہ تمام اعتقادات مہمل نظر آتے ہیں۔ مذہب بیزاری کی یہ کیفیت مہینوں طاری رہتی ہے پھر طبیعت رجوع ہو جاتی ہے اور وظیفہ خوانی شروع کر دیتا ہوں (در حقیقت شعور، عملی زندگی میں ناکام ہو کر وظیفوں کی پناہ لیتا ہے) بتائیے وظائف کیوں اثر نہیں کرتے۔

میں نے محبوب اللہ صاحب کے خط کی تفصیلات اس لئے نقل کیں کہ ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی اس محضے اور چکر میں گرفتار ہیں۔ محبوب اللہ صاحب نے اپنی ناکامیوں کی وجہ تلاش کرنے کی بے انتہا کوشش کی، ناکام رہے، چار سال سے دکان نہیں چلتی، بیوی تپ دق میں مبتلا ہے، بچے بار بار بیمار پڑتے ہیں۔ خود ان کی اپنی صحت درست نہیں، مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے۔ عزیزوں کا سلوک تکلیف دہ ہے پچھلے چار سال میں کئی دردناک موتیں ہوئیں۔ بد نصیبی اور اسی بد نصیبی..... ناکامی اور ایسی چہار گونہ ناکامی، گردش اور ایسی بد بلا گردش۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

امروا قہ ہے کہ جب انسان کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی تشخیص تک نہ ہو سکے (علاج تو درکنار) جب وہ تمام کوششوں کے باوجود اپنے حالات کو بہتر بنانے سے قاصر رہتا ہے، جب ذہنی صورت حال گمراہ جاتی ہے۔ اپنے اوپر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے، قوت فیعلہ جواب دے جاتی ہے۔ تو بے چارہ انسان کوئی پناہ نہ پا کر اپنی جانی کے ناویدہ اسباب کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ محبوب صاحب اگر اپنی ناکامی اور بیوی کی بیماری کا سبب خالہ، خالو اور پھوپھی کے تعویذوں کو قرار دیتے ہیں، تو ہرگز جائے ملامت نہیں۔ اب رہا اس عامل عورت کا مسئلہ حاضرات ارواح یعنی محبوب اللہ کے دس سالہ لڑکے کو سامنے بٹھا کر اپنی ترغیبات (پیشکش) کے ذریعے بچے پر تنویدی نیند یا (HYPNOTIC TRACE) کر دینا اور اس تنویدی نیند میں آنکھیں بند کر کے بچے کو جن نظر آنا اور جن سے سوال و جواب۔ تو بھائی ایہ سارے کرشمے ہیناثر کم کے ہیں۔ بچے کا ناپختہ ذہن کسی ترغیب کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے..... ترغیب کو قبول کر لینے کے بعد عامل کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ خیر یہ بحث اور ہے۔ محبوب اللہ صاحب کے اعتقاد کا ایک خاص ضلع ہے اور اس ضلع کو بدلنا مشکل ہے۔ لہذا ان کے لئے مشورہ صرف یہ ہے کہ وہ تمام وظائف ترک کر دیں۔ وہ جب تک وظائف کرتے رہیں گے انہی الجھنوں میں مبتلا رہیں گے۔ ہر کام کا ایک طریقہ ہے اور وظیفہ کا ایک اصول ہوتا ہے بہت سے افراد کو دیکھا گیا ہے وہ خواخواہ وظیفوں اور چلوں میں وقت ضائع کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر وہ مقررہ وظیفہ نہ کریں۔ تو سخت الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وظیفہ خوانی کی یہ لت انہیں کہیں کا نہیں رکھتی۔

دل کو احساس کی شدت نے کہیں کا نہ رکھا

خود محبت نے محبت کو کہیں کا نہ رکھا

محبوب اللہ صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ قطعاً وظیفہ نہ پڑھیں۔ صرف نماز و چنگانہ کی پابندی کافی ہے۔ وظیفے ترک کرنے کے بعد چالیس روز میں ایک بنیادی اور

ذہنی سکون محسوس کریں گے اس کے ساتھ مجھے برابر حالت سے مطلع کرتے رہیں۔

مرگی یا آسیب

مس ن۔ و۔ (کراچی سے) لکھتی ہیں کہ:

میری عمر انیس سال کی ہے پچھلے سال چار یا چھ مہینے سے مجھے ایک عجیب مرض نے آگھیرا ہے وہ یہ کہ مجھے ہر مہینے میں تقریباً دو دفعہ سخت قسم کا دورہ پڑتا ہے۔ منٹھی ہوں، لپٹی ہوں، کوئی کام کر رہی ہوں، دورہ پڑتا ہے اور میں چیخ مار کر زمین پر منہ کے بل گر پڑتی ہوں۔ کبھی پانچ منٹ، کبھی پندرہ منٹ کے بعد ہوش آجاتا ہے قابل ذکر بات یہ ہے کہ مجھے ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہوتا کہ مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے، نہ دورے سے ہوش میں آنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مجھ پر کیا قیامت گزر گئی؟ یہ سب کیفیت گھر والوں سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ابھی ابھی تم پر یہ حالت گزری تھی۔ لیکن مجھے احساس نہیں آتا کہ مجھ پر یہ کیفیت گزری ہوگی۔ ہاں اگر بے تحاشہ اچانک دھڑام سے زمین پر گر پڑتی ہوں اور بے ذہب چوٹ لگ جاتی ہے۔ تو ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کا احساس ہوتا ہے، گئی بار ہوش چھٹ گئے۔ یہ تکلیف قری مہینے کی دوسری تیسری، چھٹی، ساتویں تاریخ تک یا پھر چاند کی بائیس، تیس سے اٹھائیس تک ہوتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دو دفعہ دورہ پڑنے کے بعد دوبارہ دورہ پڑ جاتا ہے، ہاں تعجب یہی ہے کہ مجھے بالکل احساس نہیں ہوتا اور نہ کچھ یاد رہتا ہے۔

آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر گزارش کرتی ہوں کہ آپ میری اس کیفیت پر روشنی ڈالیں عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ میں اس حالت میں سسرال کیسے جاؤں گی۔ اگر وہ دورہ پڑ گیا تو میرا حشر کیا ہوگا۔ میں تو اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی، جانے اور ایسے کتنے مریض ہوں گے۔ کیا یہ کسی آسیب کا اثر ہے؟ مرگی ہے؟ یا کوئی اور نفسیاتی بیماری ہے اور کیا اس کا علاج ممکن ہے، ویسے عام طور پر میری صحت ٹھیک رہتی ہے اور کوئی ظاہری تکلیف نہیں ہے! یہ خط ایک انیس سالہ لڑکی کا ہے جو عنقریب دلہن بننے والی

ہے۔ دورے کی وہی کیفیت ہے جو مرگی میں ہوتی ہے اور جدید طب میں مرگی کا علاج ہے۔ مس ن۔ و۔ قطعی پریشان نہ ہوں، وہ کسی مستند ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ مائی سولین کی گولیاں اس دورے کو روکنے کے سلسلے میں کافی مفید ہیں۔ بہر حال ان کی دوا کوئی ڈاکٹر ہی تجویز کرے گا۔ ہمارا کام تجویز دوا نہیں ہے۔ عام طور پر لڑکیاں بے حد حساس اور جذباتی ہوا کرتی ہیں۔ ہسٹریا، سکت، دماغی دورہ اور اعصابی زودحسی خاص طور پر عورت کی خصوصیت ہے۔ عورت بڑی آسانی سے چپنا چم کے زیر اثر آجاتی ہے۔ مس ن۔ و۔ نے اس دورہ کی خصوصیت یہ بھی لکھی ہے کہ اس کا تعلق چاند سے ہے۔ قمری مہینے کی دوسری تیسری سے چھٹی، ساتویں تک اور پھر مہینے کے آخر میں بائیس تیس سے۔ اٹھائیسویں انیسویں تک۔ عام طور پر وہ اس دماغی دورے میں جتا ہو جاتی ہیں اور اس عالم میں بالکل کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہیں اور ان پر کیا گزر رہی ہے؟ ہوش میں آنے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ تم پر یہ حالت گزری تھی۔ ن۔ و۔ بے حد جذباتی اور قمری مزاج کی واقع ہوئی ہیں۔ قمری مزاج (لیونٹک) کی لڑکیاں اس قدر حساس ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ چاند کی کرنیں انسانی روح میں (سندر کی طرح) جوار بھانے کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اب تک اس امر کی سائنسی تحقیق نہیں کی گئی کہ اترتے ہوئے چاند اور چڑھتے ہوئے چاند کا انسانی جذبات پر کیا اثر پڑتا ہے، میں اس حساس لڑکی کو یہی مشورہ دوں گا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ یہ فرض کر لیں کہ مجھ پر مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ بیشک ان دوروں میں ان کی جذباتی کیفیت کو بھی دخل ہے اور یقیناً جذباتی الجھنوں کا نفسیاتی علاج ہونا چاہیے۔ تاہم فی الحال وہ اصل مرض (مرگی نما دورے) کی طرف توجہ کریں اور مناسب علاج سے صحت ممکن ہے۔

نظر لگ گئی ہے

جناب! میں ایک سترہ سال کا لڑکا ہوں۔ اور کالج میں پڑھتا ہوں، پہلے میرا ذہن بہت تیز اور صاف تھا۔ لیکن دو سال سے ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اندر سے کسی نے

تمام در تپے بند کر دیے ہیں۔ یادداشت غائب ہو گئی ہے۔ کورس کی کتابوں میں جی نہیں لگتا۔ وحشت ناک خیالات آتے ہیں۔ والدین کی ہر بات ناگوار لگتی ہے۔ نماز چھوٹ گئی ہے، لڑکیوں سے ڈر لگنے لگا ہے، یہاں تک کہ اپنی بہنوں سے بھی شرمانے لگا ہوں، والدہ کا خیال ہے کہ مجھے نظر لگ گئی ہے، کیا یہ سچ ہے۔ (حسن اعظم۔ از کراچی)

حسن اعظم! میاں اگر تم مستقل طور پر مضامین کا مطالعہ کرتے ہو تو خود سمجھ جاتے کہ تمہیں کسی کی نظر نہیں لگی بلکہ اس جذباتی الجھن میں مبتلا ہو۔ جس میں 90 فیصد لڑکے اور لڑکیوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں تمہارا ذہن بہت تیز اور صاف تھا۔ لیکن اب تم محسوس کرتے ہو کہ ذہن کے تمام در تپے بند ہو گئے ہیں، تم سمجھو یہ کیا کیفیت ہے؟ برادر زادے بات یہ ہے کہ جوانی کا دور شروع ہوتے ہی بچے اور بچیاں نئے تصورات نئے خیالات نئے خوابوں اور نئی امنگوں کے دوچار ہو جاتے ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ یہ تصورات نئے، یہ خیالات انوکھے، یہ خواب "نہرے اور یہ امنگیں ایسی عجیب و غریب ہوتی ہیں کہ زبان ان کی تشریح کرنے سے قاصر ہے، یہی زمانہ ہے (یعنی نو جوانی یا عقوان شباب کا زمانہ) کہ انسان میں اپنی انفرادیت کا مکمل احساس پیدا ہوتا ہے۔ یعنی "بھرپور میں" جاگ اٹھتی ہے۔ بھرپور میں کے جاگنے کے بعد نو جوانوں میں خاص قسم کی خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ بزرگوں کی ذرا سی بات ناگوار گزرنے لگتی ہے۔ پہلے وہ جن عقیدوں پر جان دے سکتا تھا وہ اب اسے حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ چاہے، چاہے جانے، کسی کو اپنے میں سمو لینے، کسی میں سما جانے اور کوئی عظیم الشان کارنامہ کر گزرنے کی تمنا، ایک پر زور اندرونی تقاضے کی طرح اندر ابھرتی ہے۔ یہی زمانہ ہے کہ انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا اور ہر ٹھوکر سے بے تحاشہ حظ اٹھاتا ہے۔ حسن اعظم! اگر تمہیں نظر لگی ہے تو خود تمہیں اپنی نظر لگ گئی ہوگی۔

کیونکہ ماشاء اللہ چشم بد دور۔

زمانے میں تم ہی تم ہو نظر پڑتی ہے عالم کی

بہر حال جذباتی کشش کا یہ دور عارضی ہے اگر تم اس زمانے میں نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کی کوئی مشق کر لو۔ تو مجھے امید ہے کہ تم با آسانی ذہنی کشش پر غالب آ جاؤ گے۔ کیا تیار ہو؟

دانت پینا

عبدالواحد بلوچ (دوبئی، متحدہ عرب امارات عربیہ) لکھتے ہیں کہ:

میں نیند میں دانت پیتا ہوں، سوتے میں دانت پینا، نیند میں بولنا اور نیند میں چلنا۔ یہ کیا چیزیں ہیں، کیوں پیش آتی ہیں۔

خواب خرابی

عرض یہ ہے کہ سوتے میں دانت پینے کا ایک سبب تو معدے کی خرابی (اسٹوں میں ریاخ کا بھر جانا) ہو سکتا ہے، دوسرا سبب گہرا جذباتی ہیجان! بیداری کی حالت میں انسان غصے کے مارے دانت پیتا ہے۔ یہ بالکل حیوانی حرکت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کچا چبا چاؤں کا۔ اگر کچا چبانے کی خواہش بیداری میں پوری نہ ہو سکے (کیونکہ عملی شعور اہل حیوانی حرکت سے باز رکھتا ہے) تو آدمی خواب میں (جب شعور معطل ہو جاتا ہے) دانت پینے لگتا ہے اب معلوم نہیں کہ جناب عبدالواحد معدہ کی خرابی کے مریض ہیں یا کسی گہرے بے پناہ غصے کو دبائے ہوئے ہیں۔ جب تک تمام تفصیلات معلوم نہ ہوں کیا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ نیند میں بولنا اور بڑبڑانا بھی جذباتی کشش کی علامت ہے۔ ہم جاگتے میں سوسائٹی کے آداب اور معاشرے کے تقاضوں کے پیش نظر بہت سی باتیں پی جاتے ہیں، زبان پر نہیں لاتے ہیں۔ نیند طاری ہوتے ہی شعوری کنٹرول کمزور پڑ جاتا ہے اور آدمی جو بات بیداری میں نہیں کہہ سکتا خواب میں کہہ جاتا ہے جہاں تک نیند میں چلنے یعنی خواب خرابی (SOMNOM BULISM) کا تعلق ہے تو یہ ایک اعصابی اور نفسیاتی مرض ہے۔ جن لوگوں کے اعصاب کمزور اور لاشعوری

تقاضہ قوی ہوتا ہے۔ وہ خواب میں اٹھ کر چلنے لگتے ہیں۔ اس لاشعوری حالت میں بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ اور پھر چپ چاپ بستر پر آکر لیٹ جاتے ہیں۔ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا بحالت خواب انہوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ جی ہاں ان کی شکایت کا علاج نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کی مشقیں ہیں۔ جو میں بذریعہ خط و کتابت اپنی نگرانی میں کراتا ہوں، یہ مشقیں دس منٹ صبح و شام کرنی پڑتی ہیں۔

ماموں جان

م۔ ب اپنے خط مورخہ 26 مارچ میں لکھتی ہیں کہ:

حضرت ماموں جان رئیس صاحب! دماغ کام نہیں کر رہا۔ کہیں خودکشی پر مجبور نہ ہو جاؤں۔ جب سے میں نے ہوش سنبالا ہے، شادی کا شوق تھا۔ 28 سال کی عمر میں شادی ہوئی، شادی سے قبل جو حال تھا آج بھی وہی ہے، رات دن غم و اندوہ میں گزار رہے ہیں۔ کنواری تھی تو پردہ کرتی تھی، اکیلی رہتی تھی۔ شادی کے بعد صورتحال یہ ہے کہ جذبات ہر وقت موجزن رہتے ہیں۔ بچوں تک سے پردہ کرتی ہوں لیکن مرد آدمی کو بغور چور نظروں سے دیکھتی ہوں۔ غلط خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، پہلے منہ سے نکال کر چلتی تھی۔ اب دو دو نقاب منہ پر ڈال رکھے ہیں، مزاج میں غصہ زیادہ ہے۔ نہ شوہر سے محبت ہے نہ اولاد سے۔ میرے والد، عورتوں کے بے حد لالچی تھے۔ میرا بڑا لڑکا گیارہ سال کا ہے عورت کے وجود کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں ماں ہوں مجھ سے نظریں جوکا کر بات کرتا ہے۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہتا ہے۔ لڑکیوں کا یہ حال مردوں کو دیکھ کر گھر کے اندر بھاگ آتی ہیں۔ ایک دم چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ شوہر کا حال یہ کہ کنوارے تھے تو اکیلے رہتے تھے ماں بہنوں سے پردہ کرتے تھے، دو مرتبہ دماغ خراب ہو چکا ہے۔ کسی عورت یا لڑکی کو دیکھتے ہی رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

فساد کا آغاز

بی بی! جہاں تک تمہاری جسمانی شکایتوں کا تعلق ہے مثلاً چائے کے رنگ کا پیشاب۔ یہ جگر کی خرابی کی علامت ہے۔ ممکن ہے کہ تم حرارت جگر میں مبتلا ہو، باقی تمام الجھنیں، ذہنی و جذباتی ہیں، تمہارے والد عورتوں کے لالچی تھے۔ تمہاری شادی 28 سال کی عمر میں ہوئی فساد کا آغاز یہیں سے ہوا ہے تم نے کنوارے پن میں اپنے والد کی جذباتی سرگرمیاں دیکھیں۔ اس طرح کا ایک تمہارے جذبات بھڑک اٹھے۔ تم نے خود لکھا ہے کہ تم شادی کی بہت شوقین تھیں۔ کیوں؟ وہی جذبات انگیز گھریلو ماحول، تم کہتی ہو کہ ایک طرف تو میں بچوں تک سے پردہ کرتی تھی۔ دوسری طرف مردوں کو چور نظروں سے دیکھتی تھی (بلکہ دیکھتی ہوں) پہلے تم نقاب سر کا کر چلتی تھیں اب دو دو نقاب ڈال کر نکلتی ہو۔ یہ سب کیا ہے؟ تمہارے ذہن میں چور چھپا ہوا ہے۔ دو نقاب ڈالنے سے جذبات کی پردہ پوشی ممکن نہیں۔ تم نے مجھے ماموں جان لکھا ہے تو میری عزیز بھانجی! یہ منافقت (اندر کچھ باہر کچھ) چھوڑ دو۔ جو عورتیں حد سے زیادہ پردہ کا اہتمام کرتی ہیں۔ وہ چھنناں کہلاتی ہیں اور ایک ذرا سے اشارے پر گمراہ ہو جاتی ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ تمہارے شوہر کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تمہاری جذباتی تسکین سے قاصر رہتے ہیں۔ بی بی! تمہارے کردار کا اثر (جذباتی رویے) تمہاری اولاد پر بھی پڑا ہے، ان میں بھی ذہنی منافقت پیدا ہو گئی ہے۔

روحانی محبت

ح۔ س۔ (1) تمہارا جی کسی کام میں نہیں لگتا (2) تم زندگی سے بیزار اور ماحول سے مایوس ہو۔ (3) مستقل ذہنی غلجائے اور متواتر سوچ نے ہاضمہ خراب کر دیا ہے دو سال سے بار بار اجابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں دماغ کا اثر معدے پر پڑ گیا ہے، (ڈاکٹر جی کہتے ہیں) تم نے لکھا ہے کہ جب تک میں اپنا حال دل کسی مہربان اور شفقت کو

نہ سنادوں گی اور جب تک جی کی بجز اس نہ نکلے گی، مجھے سکون نہیں مل سکتا۔ (یہ بھی سو فیصدی ایک نفسیاتی حقیقت ہے) تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ بچپن سے تمہارا تصور یہ تھا کہ جسمانی محبت کے علاوہ ایک روحانی محبت بھی ہوتی ہے۔ بے غرض محبت! گناہ کی آلائش سے پاک، 23 سال کی عمر میں تمہاری شادی ہوگئی۔ تمہارے شوہر بقول تمہارے بہت اچھے ہیں۔ (تم نے یہ نہیں لکھا کہ تم ان سے مطمئن بھی ہو یا نہیں) اس زمانے میں بچوں کو نیوشن پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر صاحب آنے لگے انہیں دیکھ کر بیک نظر تم نے ایک فیصلہ کر لیا کہ جس کی مجھے تلاش تھی۔ شاید وہ یہی ہے۔ "تم ان ماسٹر صاحب کی طرف کھینچی چلی گئیں (اور یہاں تک بے تکلفی پیدا ہوگئی) کہ ماسٹر صاحب نے تم سے کھل کر کہا۔

"تمہیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟"

تم نے کہا۔ "نہیں"

ماسٹر صاحب نے فرمایا۔

"تم میرے جیسے ہو۔ تم دونوں ایک ہیں۔ تم لکھتی ہو کہ اس (راز و نیاز کے) زمانے میں میرے دل و دماغ پر پاکیزگی کی فضا چھانی رہتی تھی۔ اتنا سکون تھا کہ بیان نہیں کر سکتی! ایسا سرور کہ اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔ آخر تم نے سوچا کہ روحانی محبت کا یہ راستہ گناہوں کی وادی کی طرف جاتا ہے (بی بی! تم نے صحیح سوچا) اس لئے ماسٹر صاحب کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اب تمہاری عمر پچاس سال کی ہے اور اب تک تم ماسٹر صاحب کی روحانی محبت کے تصور سے، سرشار ہو۔ اس قصے کی بناء پر تمہاری دماغی، ذہنی اور جسمانی صحت بھی خراب ہوگئی ہے۔

ج۔س! بے شک محبت کا ایک روحانی پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی منزل بہت بعد میں آتی ہے۔ بچپن میں تمہارے ذہن نے محبت کے روحانی پہلو کے تصور کو کیوں قبول کیا۔ یہ ایک سوال ہے۔ تم بھرپور عورت ہو، بیوی بھی، ماں بھی۔ تم

اب تک حقیقت پسند کیوں نہ بن سکیں، یہ دوسرا سوال ہے۔ ان سوالات پر بحث اس وقت ممکن ہے جب تمہاری ذہنی اور دماغی نشوونما کے مختلف پہلو میرے پیش نظر ہوں۔ نچوڑ اس پورے مسئلے کا یہ ہے کہ ہنوز تم ذہنی طور پر نابالغ ہو۔ پچاس سال کی ہونے کے باوجود تمہارا شعور سات آٹھ سالہ بچی سے زیادہ بالغ نہیں۔ بی بی! تم صرف خود ترقیبی سے اپنے آپ کو بدل سکتی ہو۔ روزانہ شب میں جب نیند آنے لگے، تو 21 مرتبہ حسب ذیل فقرہ دہرایا کرو۔

میں بچپن کے طفلانہ تصورات پر غالب آکر روز بروز حقیقت پسند بنی چلی جا رہی ہوں۔

دن میں بھی یہ فقرہ جتنی مرتبہ ہو سکے دہرایا کرو۔ ج۔س! میری تمام روحانی توجہ تمہارے ذہن پر مبذول ہے، مطمئن رہو۔

دماغی مرض

اکبر علی (کراچی) نے لکھا ہے کہ دماغی مرض میں مبتلا ہوں۔ بقول ان کے دماغی مرض یہ ہے کہ چھٹی جماعت میں حافظہ کافی تیز تھا بعد کو زیادہ پڑھائی کے سبب حافظہ خراب اور ذہن کند ہو گیا، میں بے حد محنتی ہوں۔ جو عزم کر لیتا ہوں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اب دل و دماغ ساتھ نہیں دیتے۔ برادر ام اکبر علی! ہر نوجوان پندرہ سال کی عمر کے بعد عارضی طور پر حافظے کی خرابی اور دماغی بندش (جیسے دماغ پر تالے پڑے ہوئے ہیں) کی کیفیت سے دوچار ہوا کرتا ہے۔ (سو میں سے 60 فیصدی لڑکے اور لڑکیاں اسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آغاز جوانی میں سینہ جذبات کی حشرگاہ بن جاتا ہے۔ نئے نئے تصورات ذہن پر بلہ بول دیتے ہیں۔ ان تصورات میں جنسی جذبات کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہی خیالات، خواہشات، تصورات سے گھبرا جاتے ہیں اس کشمکش کا اثر حافظے پر بھی پڑتا ہے، اور شعور پر بھی۔ اکبر علی! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم (S.C.T) کی مشقیں کرلو۔ انشاء اللہ اس

لکھا ہے۔ تین مرتبہ انشاء اللہ، انشاء اللہ، انشاء اللہ، جناب رکھیں مجھے عورتوں کے بارے میں ذرا بھی معلومات نہیں نہ SEX کے بارے میں عملاً کچھ جانتا ہوں۔ میں نے ہیولاک ایس او دوسرے یورپی مصنفین کی تصانیف پڑھی ہیں۔ ان کتابوں میں جنسی زندگی کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے، لیکن میں جنسیات کے بارے میں سب کچھ جانا چاہتا ہوں۔ اب تک میرا مطالعہ صرف کتابی ہے۔ عملی جنس (بجز خود لذتی) میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ازراہ کرم عورت کے بارے میں کچھ فرمائیں۔ اقبال نے کہا ہے کہ:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اور آپ کا یہ شعر پس غبار میں پڑھا تھا کہ

بس وہی عہد محبت ہے وہی عہد شباب

مرد جس وقت سمجھ جائے کہ عورت کیا ہے!

تو ازراہ کرم مجھے بتائیں کہ عورتوں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔

چار چار قسمیں

آپ نے SEX کے بارے میں مغربی مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آئیے ہم آپ کو پراجین انڈیا (قدیم ہندوستان) میں لے چلیں۔ اور یہ دیکھیں کہ ہندو عالموں نے (جو بلاشبہ نفسیات و جنسیات سے بخوبی واقف تھے) عورتوں کی کتنی قسمیں بیان کی ہیں۔ ہندوؤں کے کام شاستر (جنسی لٹریچر) میں عورت کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(1) پدمنی (2) چترنی (3) سنگھنی (4) ہستنی۔ پدمنی درجہ اول کی عورت ہوتی ہے۔ اس کی علامات بھی سن لیجئے ہرن جیسی آنکھ گوش تا چشم سرخ، چہرہ جیسے چودھویں کا چاند۔ سینہ ابھرا ہوا بھرپور۔ اس کی خوشبو کنول کے پھول کی طرح ہوتی ہے۔ معتدل مزاج، چمپنی، نسائی جسم کنول کی کلی کی طرح۔ آواز بھری پرندے جیسی، چھریا بدن، رفتار مستانہ، گردن شاہانہ، ناک خوب صورت یہ ہے پدمنی، اور چترنی؟ نازک اعضاء، ہاتھی

جیسی چال، چمکدار آنکھیں، آرٹ اور موسیقی کی دلدادہ، نہ لمبی، نہ چھٹی، مور کی آواز، سینہ گداز اور بلند، اس کے جنسی رس میں شہد جیسی خوشبو ہوتی ہے۔ ہونٹ سرخ ہوتے ہیں اور نسائی جسم بے ریشہ و مو ہوتا ہے، چترنی قربت کا میلان کم رکھتی ہے۔ سنگھنی کا قد لمبا ہوتا ہے، پیشانی تنگ، بڑا جسم، بڑے پیڑ، بھاری سرتن، تنگ سینہ، مستقل مزاج، رفتی ماوے اخراج کم ہوتا ہے۔ اور اس میں نمکین بو ہوتی ہے، جسم نازک پر گھنے بال، کمان جیسی آنکھیں اور گرم ہونٹ، عالم اختلاط میں ناخن چھوٹی ہے۔ یہ نہ پر خور ہوتی ہے نہ کم خور ہوتی ہے، سرخ پھول پسند کرتی ہے آواز میں کراہا پن ہوتا ہے۔ عورت کی سب سے کم تر قسم ہستنی (HASTINI) ہے، موٹی، بھدی، سخت ڈھیت، چھوٹا قد، آہستہ آہستہ چلنے والی، شادی کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے جذبات غیر مستقل ہوتے ہیں۔ موٹے ہونٹ! پھر قدیم ہندوستان کے رشیوں اور مہارشیوں نے پدمنی، چترنی، سنگھنی، ہستنی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ تو براہ کرم مزہ صاحب آپ رفاقت حیات کے لئے کسی پدمنی کا انتخاب کریں اور اب ط۔ خانم! تم سنو۔ تم سے مردوں کی اقسام بیان کروں کام شاستر کی رو سے مردوں کی بھی چار اقسام ہیں۔

(1) خرگوش (2) ہرن (3) نیل (4) گھوڑا۔ (1) خرگوش مرد کی آنکھیں سرخ، دانت چھوٹے، خند و خال و گلش، گول چہرہ، شاندار نقش و نگار اور انگلیاں سیدھی اور خوب صورت ہوتی ہیں۔ (2) ہرن مرد لمبا سڈول جسم والا ہوتا ہے۔ بال نرم ہوتے ہیں اس کی بغل اور چھاتی پر بھی بال کم اُگتے ہیں۔ (3) نیل مرد کے ہاتھ لمبے، سر چوڑا اور بلند ہوتا ہے، پیشانی کشادہ، بڑے کان اور خصوصاً ہتھیلیاں سرخ ہوتی ہیں۔ مرد کی آخری اور کم تر قوم ہے۔ (4) گھوڑا مرد اس کی چال شیر جیسی ہوتی ہے، مضبوط جسم کا ٹھکانا ہوتا ہے۔ توبی بی ط۔ خانم یہ ہیں سرسری طور پر ایک نظر میں مرد کی قسمیں، اب کیا رائے ہے؟

خودکشی یا طلاق

ایک چونتیس سالہ بی اے پاس خاتون آپ سے مخاطب ہے۔ میرے پانچ بچے ہیں، ایک جوان لڑکی اور چار لڑکے! آخری لڑکا میرا سب سے چھوٹا بیٹا میرے لئے نفسیاتی مسئلہ بن گیا ہے۔ کس طرح؟ سنئے! جب میں چودہ سال کی تھی تو لاہور سے ہمارے رشتے کے ماموں کا لڑکا کراچی آیا۔ یہ لڑکا صرف قبول صورت تھا، یہ عرض کردوں کہ چودہ سال کی عمر میں راقم بہت پرکشش تھی۔ میرے چچیرے میرے بھائی مجھے بری طرح گھورا کرتے تھے۔ میں نے اس رشتہ دار لڑکے سے جھجھکاؤ شروع کر دیا۔ مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اب میں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا، پھر بھی بے اثر، رفتہ رفتہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مگر مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگنے لگی۔ ایک روز میں گھر میں اکیلی تھی۔ وہ رات کے 9 بجے آیا ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ جب میں نے آگے بڑھنا چاہا۔ تو وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا کہ جو چیز قانونی ذرائع سے حاصل ہو سکتی ہے اسے ناجائز طور پر حاصل کیا جائے؟ اس کے انکار پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے ”بڑولی“ کہہ کر اس کے منہ پر مٹا نچہ رسید کر دیا۔ صبح ہوتے ہوئے اس کی عظمت کا فقدان میرے دل پر بیٹھ گیا۔ کچھ دن کے بعد وہ لاہور چلا گیا اور میں اس کے فراق میں تڑپتی رہ گئی، ڈیڑھ سال کے بعد وہ پھر کراچی آیا۔ تو اس وقت ہم لوگ زبردست مالی بحران میں مبتلا تھے، میں نوکری کی تلاش میں تھی۔ اس نے کہا کہ تم نوکری کے چکر میں مت پڑو۔ میں تمہیں بیس روپے ماہانہ دیتا رہوں گا، میری امانت اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اس زمانے میں والد صاحب کے ایک دوست نے مجھے نوکری دلانے کے بہانے گھر سے لے جانا شروع کر دیا اور اس ظالم شیطان نے مجھے بے آبرو کر ڈالا۔ لیکن میں مجبور تھی کس سے کہتی؟ خون کے آنسو بہا کر بیٹھ گئی۔ ٹھیک اسی زمانے میں اس کی والدہ میرا پیام لے کر گھر آئیں۔ ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی اور دوسرے روز آنے کو کہا گیا۔ دوسرے روز وہ مجھے سونے کی انگوٹھی دے گئیں۔ (یہ شادی کا پیغام تھا) دوسرے روز مجھے التیایا آنے

لگیں۔ میں سمجھ گئی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ (میں ماں بننے والی تھی) میں نے اسی روز شام کو والدہ سے کہہ دیا۔ کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ چند روز بعد ان کو بھی پتہ چل گیا کہ حقیقت واقعہ کیا ہے؟ آخر بدنامی سے بچنے کے لئے میری شادی بھجور و اصرار انہی بزرگ سے کر دی گئی۔ جو اس شیطیت کے ذمہ دار تھے۔ شادی کے بعد وہ ہمارے گھر آیا، اس کا گندی رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ادھیڑ عمر شوہر کی موجودگی میں بے ساختہ رو پڑی۔ اور اس طرح ہماری محبت کا راز فاش ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ساری برادری میں یہ بات پھیل گئی کہ یہ اور وہ محبت کی سنہری زنجیر میں اسیر ہیں۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس سے انوہوں میں شدت پیدا ہوئی آخر میرے رونے دھونے اور یہ کہنے سے کہ تمہاری شادی سے میرے گھر بے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اُس نے بدقت ایک رشتہ دار لڑکی سے شادی کر لی اور لاہور چلا گیا۔ میں نے بھی ملازمت کر لی مگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ بخدا اس کے خطوط ہر اعتبار سے شہ پارہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں اس نے لاہور سے ایک خط لکھا کہ ”میں چاہتا ہوں ہم اپنے بعد ایسا نقش چھوڑ جائیں جس کی مہکتا ابد اللہ تک قائم رہے“ اس خط سے متاثر ہوئی، اور آج سے چار سال قبل اس کے ایک بچے کی ماں بن گئی (یہی بچہ میرے لئے نفسیاتی مسئلہ بن گیا ہے)۔ میرے شوہر اس راز سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں علم ہے کہ سب سے چھوٹا لڑکا کس کا ہے؟ وہ اسے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ میرا یہ بچہ اپنے سوتیلے باپ (یعنی میرے قانونی شوہر) سے بہت ڈرتا ہے۔ لیکن جب اس کا حقیقی باپ آتا ہے تو شیر بن جاتا ہے۔ میرے قانونی شوہر اسے اس لئے برداشت کر رہے ہیں، کہ وہ ان کی مالی امداد کرتا ہے۔ میرے قانونی شوہر جب چھوٹے بچے کو مارنے لگتے ہیں تو میں ان کے بچے کو مارنے لگتی ہوں۔ اس طرح پانچوں بچے ماں باپ کے ہاتھوں سب عذاب میں مبتلا ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کروں؟ خودکشی کر لوں یا طلاق لے لوں؟ (آپ کی پرستار۔ ب۔ ر)

زندگی ایک المیہ

بی بی! انسانی زندگی ایک المیہ ہے یا مختلف المیوں کا ایک تسلسل! تم شروع ہی سے مصائب کا شکار رہی ہو، اس میں کچھ تمہاری غلطیاں ہیں، کچھ معاشرے اور ماحول کی۔ تمہارے والد کے دوست نے نوکری دلانے کے بہانے جو سلوک کیا وہ آدمی سے بعید نہیں۔ تم ان مصائب کو کم کرنے کے لئے صرف اتنا کر سکتی ہو کہ پانچواں بچہ باپ کے حوالے کر دو آہ تمہاری زندگی تو تباہ ہوئی تھی۔ تمہارے پانچوں بچے بھی جتنا ئے عذاب ہیں۔

آنکھیں۔ آنکھیں۔ آنکھیں

ایک باشعور نوجوان کے خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

السلام علیکم..... میں کافی مدت سے آپ کا سلسلہ مضامین (نفسیات مابعدالطبیات) پڑھ رہا ہوں، ان مضامین میں نفسیات مابعدالطبیات (سپر فزیکل) علوم سے تعلق رکھنے والے مختلف مسئلوں پر دلچسپ بحث کی جاتی ہے، خوشامد پر محمول نہ کریں۔ مبالغہ نہ سمجھیں۔ آپ کی علمی اور روحانی استعداد کا ہر باشعور انسان دل سے متعجب اور مداح ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو اس خدمت کا اجر عظیم عطا کرے۔ سعادت دارین نصیب ہو۔ بار بار سوچا کہ آپ کی خدمت میں اپنے حالات کے بارے میں مفصل عریضہ بھیجوں۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی عذر مانع ہو گیا، آج جی کڑا کے اپنی روداد مشورے کی غرض سے پیش کر رہا ہوں۔

عجیب و غریب

دیکھیں صاحب میں تقریباً چھ یا سات سال سے عجیب و غریب ذہنی مرض میں مبتلا ہوں۔ اس مرض نے زندگی اجیرن کر دی ہے۔ خوشیاں میرے لئے اجنبی بن گئی ہیں۔ اس اندرونی تکلیف کے سبب جسمانی نشوونما بھی رک گئی ہے، میں جس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مرض کی ابتداء اس طرح ہوئی، میرے

سر میں اپنی آنکھیں بس لگیں۔ ہر وقت یہی خیال کہ میری آنکھیں ہیں..... آنکھیں ہیں آنکھیں..... آنکھیں ہیں۔ صرف آنکھیں فقط آنکھیں..... محض آنکھیں..... یہ بات اپنی آنکھوں سے شروع ہوئی تھی یعنی یہ کہ میرے چہرے پر آنکھیں ہیں۔ ہر وقت بس یہی خیال اور تصور رہتا تھا۔ اس کے بعد وہم کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہوا۔ یعنی یہ کہ میں جس شخص کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ آدمی زندہ ہے یا نہیں کیا واقعی زندہ ہے..... سچ بچ زندہ ہے چونکہ ایک شخص دوسرے کی زندگی (جان) کو اپنے اندر محسوس نہیں کر سکتا۔ اس لئے بے یقینی سی ہونے لگی کہ فلاں شخص میں زندگی ہے یا نہیں اس معاملہ میں بے شمار ذہنی الجھنیں پیدا ہونے لگیں، ذہن خود ہی سوال کرتا، خود ہی جواب دیتا یعنی میں اپنے سے الجھ کر رہ گیا۔ اس وہم کے درخت سے وہم کی نئی شاخ یہ پھوٹی کہ وہ خدا جس نے مجھے بنایا ہے۔ وہ میری طرح کے لاکھوں انسان بنا سکتا ہے لہذا دوسرے آدمی کو بھی زندہ ہونا چاہئے (جس طرح میں زندہ ہوں) آخر یہ آدمی چل رہا ہے۔ پھر رہا ہے، گفتگو کر رہا ہے۔ یہ سب زندگی کی علامتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان علامتوں کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بدن میں جان اور دماغ میں شعور کا دفرا ہے۔ خود اپنے کو طرین طرح کی یقین دہانیاں کراتا تھا۔ مگر یہ کیفیت ٹس سے مس نہ ہوتی تھی، مجھ پر کوئی منطقی دلیل اثر نہ کر سکتی تھی۔ وہم اور بداندیشی کا وہی عالم تھا۔ یقین و عقیدہ ختم اور وہم و گمان غالب اب یہ سوچ شروع ہوئی۔ کہ جو چیز میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ چیز واقعتاً موجود ہے یا نہیں، یعنی آنکھوں پر سے بھرور اٹھ گیا۔ بات اور آگے بڑھی بے یقینی یہاں تک کہ دائرگی کہ چھوٹے اور محسوس کرنے پر سے بھی اعتبار اٹھ گیا۔ یعنی جس شے کو چھو رہا ہوں۔ اسے واقعی چھو رہا ہوں یا نہیں یہ محض غلط فہمی تو نہیں ہے چھو رہا ہوں..... چھوٹے کے بعد وزن سے اعتبار اٹھا۔ یعنی جو چیز میں اٹھا رہا ہوں۔ اس میں وزن ہے یا نہیں، میں خود سمجھتا تھا کہ وہم بے یقینی کے شیطانی چکر میں مبتلا ہوں۔ میرے حواس خمسہ (آنکھیں، کان، ناک وغیرہ) جو گواہی دیتے ہیں ان پر یقین کر لینا چاہیے، جس چیز کو دیکھتا ہوں۔ وہ سچ بچ دکھ رہی

ہے۔ جس شے کو چھو رہا ہوں۔ درحقیقت اس کا وجود ہے اس میں وزن ہے، مگر یہ تمام دلیلیں بے سود ثابت ہوئیں اور ذہن بدستور ادہام کے چکر میں مبتلا رہا اور جلتا ہے۔

پاگل نہیں ہوں

صرف ایک پاگل آدمی ہی ایسی مضحکہ خیز الجھنوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مگر میں پاگل نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں، تاہم اپنے ادہام کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اپنے بارے میں اتنا عرض کر دوں کہ بدعقیدہ نہیں ہوں، پانچ وقت کا نمازی ہوں، دین سے محبت رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ شیطان کے شر سے نجات دے۔ مختصر یہ کہ تین چار سالوں تک ان وہموں اور خود فریبیوں میں مبتلا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا۔ عقل سلیم نے کچھ راہ سمجھائی! عام سمجھ بوجھ کی صلاحیت کسی قدر ابھر آئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ افادہ کس طرح ہو گیا۔ تاہم ہو گیا۔ ایسا لگا کہ وہم تحت الشعور میں چلا گیا۔ پھر بھی شعور پر اس کے تھوڑے بہت اثرات باقی تھے۔ افادے کی یہ کیفیت عارضی تھی۔ اب ذہن نے خود فریبی کا دھڑا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ کسی حادثے کی خبر سنی تو اندیشہ ہوا کہ یہ حادثہ میرے ساتھ پیش نہ آجائے۔ یا جب کام میں کر رہا ہوں، کیا واقعی اس سے صحت بہتر ہو جائے گی۔ یا یہ بھی فریب ہے، ورزش میں ٹانگیں تنگی ہو جاتی ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ تو ناراض نہ ہو جائے گا اور اگر خدا ناراض ہو گیا تو صحت پر اثر تو نہ پڑے گا۔ عقل سلیم یہ دلیل دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ قوانین بنائے ہیں۔ جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی) خواہ ٹانگیں تنگی ہوں یا ڈھکی ہوئی۔ قانون الہی یہ ہے کہ جو شخص ورزش کرے گا اس کی صحت بہتر رہے گی۔ اس کے باوجود کبھت دل عقل سلیم کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا عجب بات یہ ہے کہ چند روز تک وہم دماغ پر غالب رہتا ہے۔ چند روز کے بعد اس کے پیٹ سے دوسرا وہم جنم لیتا ہے، بہر حال ادہام کی ہر قسم سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے اور پڑتا ہے۔ مثلاً آج کل اس وہم میں مبتلا ہوں کہ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ یہ کیسے دھڑک رہا ہے۔ کہا

یہ تھکتا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ دھڑکنا بند کر دے۔ جی چاہتا ہے کہ وہم کے اس کانٹے کو ذہن سے نکال پھینکوں۔ تو یہ واہمہ ذہن میں سر اٹھاتا ہے اگر یہ وہم ہے کہ دل دھڑک رہا ہے یا نہیں ختم ہو گیا تو ہو سکتا ہے کوئی حادثہ پیش آجائے۔ غرض صورت یہ ہے کہ

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

رکھیں صاحب! خدا کے لئے ہٹا دے کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

تل اور مسا

میں نے اس وہم زدہ نوجوان کے خط کا بڑا حصہ صرف اس لئے نقل کیا کہ آپ واہمہ کی قوت اور شدت کا اندازہ کر سکیں، اصولی اور بنیادی طور پر وہم کی قوت ایک مفید قوت ہے۔ ہم جتنی چیزیں دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، چھوتے ہیں، سوچتے ہیں، چکھتے ہیں۔ جس سے اس غم کے ذریعے جتنے تجربات ذہن کو ہوتے ہیں وہم کی قوت ان تجربوں کو یکجا کر کے ایک نئے تجربے (نئی صورت نیا مشاہدہ) کو جنم دیتی ہے۔ مثلاً آپ کے ذہن میں پہاڑ اور سونے کی تصویر موجود ہے، پہاڑ کو بھی دیکھا ہے۔ سونے کو بھی پرکھا ہے قوت واہمہ نے یہ کہاں کہا کہ ان دونوں تصویروں (پہاڑ اور سونے) کو ملا کر سونے کے پہاڑ کا تصور نگاہ باطن کے سامنے پیش کر دیا۔ حالانکہ سونے کے پہاڑ کا کہیں وجود نہ تھا۔ یہ قوت واہمہ (واہمہ کی قوت) ہی تو ہے جو انسانی تخیل کو اس شدت سے حرکت میں لاتی ہے کہ ذہن نئی دنیا تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کیوں کہتے جہاں میں نے ذروں سے تراشے ہیں

بول اے مرے ویرانے، چیخ اے میری تہائی

گفتگو کا نیچوڑ یہ ہے کہ قوت واہمہ بھی اصولی طور پر انسان کے لئے اتنی ہی مفید جتنی قدرت کی بخشی ہوئی دوسری قوتیں۔ دوسرے جذبے اور دوسری صلاحیتیں! لیکن جس طرح حل بڑھ کر مسا، یعنی خوبصورتی، بد صورتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہم حد سے گزر جائے تو وہی صورتحال پیش آتی ہے۔ جو صاحب خط کو پیش آتی۔ (غالب

کے مصرعے میں خفیف سی ترمیم کے بعد)۔

وہم کا حد سے گزرتا ہے جنوں ہو جانا

شخصیت اور آنکھیں

اس نوجوان کی ذہنی سوانح عمری یا "نفسیاتی آپ بیتی" کے خاص خاص نکتوں پر آئیے۔ ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیں (1) وہم کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ مریض کے ذہن میں اس کی آنکھیں بند گئیں۔ بس ہر لمحہ نگاہ کے سامنے اپنی آنکھیں رہتی تھیں۔ تحلیل نفسی (یا نفسیاتی خرابیوں کی چھان بین) کے نقطہ نظر سے مریض کی نفسیاتی زندگی میں اس کی آنکھیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسے اپنی آنکھوں کا وہم کیوں ہوا؟ چہرے مہرے خدو خال اور قد و قامت کا وہم کیوں نہ پیدا ہوا۔ اگر مریض میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اپنی نفسیاتی جرح کا آغاز کیوں سے ہی کرتا۔ پوچھتا کہ تمہارے جسم میں تمہاری آنکھیں کیوں بسی ہوئی ہیں۔ دوسرے جسمانی اعضاء کو کیوں نظر انداز کر کے بکھا ہے، مگر مریض چونکہ موجود نہیں۔ اس لئے میں اس مقدمے کا فیصلہ اس کی عدم موجودگی میں کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کے بعض گہرے جذبات کو مؤثر اعتبار اور ابلاغ صرف اس کی آنکھوں کے ذریعے ہوتا ہے اس ضمن میں دوسرے اعضاء جسمانی کی حیثیت ثانوی ہے پر اعتماد شخصیت (وہ شخص جسے اپنے اوپر پورا بھروسہ ہو) سب سے پہلے آنکھوں کے اشاروں اور پتلیوں کی حرکت سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اگر انسانی وجود کو فلسفی گنبد سمجھ لیا جائے تو اس فلسفی گنبد کے اسرار کا علم صرف "روزن چشم" یعنی آنکھوں کے دریچوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

سامنے آؤ کہ آنکھوں میں بٹھالوں تم کو

یہ درپے ہیں میرے دل میں اترنے کے لئے

یہ اس نوجوان کی شخصیت کی بنیادی کمزوری ہی تھی جو اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے ذہن کی توجہ اپنی آنکھوں کی

طرف مبذول ہوئیں اور وہ اپنی پلکوں میں الجھ کر رہ گیا، جب آنکھوں کا وہم پختہ ہو گیا۔ تو اس نے دوسری شکل اختیار کی۔ یعنی یہ وہم شروع ہوا کہ میں جس شخص کو دیکھ رہا ہوں وہ زندہ ہے یا نہیں؟ یعنی آنکھوں کے بعد واسطے کا حملہ دماغ پر ہوا اور زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ بظاہر یہ تمام باتیں آپ کو عجیب و غریب نظر آئیں گی۔ مگر یقین کیجئے کہ وہم کا مریض ہر ناممکن بات کو سوچ سکتا ہے۔ وہم کی ضد یقین ہے۔ جہاں یقین اور عقیدے کی قوت ہوگی۔ وہاں وہم و گمان کا گزر کہاں؟ اس خط لکھنے والے کو جب اپنی ہی ذات پر بھروسہ نہیں تو پھر وہ دوسروں کی زندگی کا یقین کس طرح کر سکتا ہے؟ انسان سے بے عقیدہ ہونے کے بعد خدا کا نمبر آیا۔ یہ وہم کہ خدا لاکھوں انسانوں کو کس طرح خلق کر سکتا ہے؟ پھر یہ لے لے اور آگے بڑھی۔ اور خود جو اس خسرہ پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ یہ سب ایک ہی سلسلہ توہم کی کڑیاں ہیں۔

خدائے سخن اور وہم

جب میں اس نوجوان کا خط پڑھ رہا تھا۔ تو مجھے میر تقی میر بے ساختہ یاد آرہے تھے جنہیں اردو شاعری کے "خدائے سخن" کا خطاب دیا ہے، میر صاحب فرماتے ہیں۔

یہ توہم کا کارخانہ ہے

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

یعنی دنیا وہم کا کارخانہ ہے اور یہاں صرف اسی چیز کو موجود اور حقیقی کہا جاسکتا ہے جس پر آپ اعتبار کر لیں، اس کے علاوہ نہ کوئی شے موجود ہے نہ حقیقی، یعنی جو کچھ ہے اعتبار کی بات ہے۔ ہم سرخ کو سرخ کہتے تو وہ سرخ ہے۔ ہز کہتے لگیں تو ہز ہو جائے گی۔ یہ نوجوان میر صاحب سے بھی دو قدم آگے ہے یہ کسی شے کو چھوٹا ہے تو اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں نے اسے چھوا ہے یا نہیں۔ بلکہ اس حد تک بے یقینی بڑھ گئی ہے کہ آیا وہ شے موجود بھی ہے یا نہیں، جسے چھوا گیا ہے۔ بے اعتقادی، بے اعتباری اور بے یقینی کی اس شدید کیفیت کے باوجود خط لکھنے والے کا دعویٰ یہ ہے کہ میں

”بدعقیدہ یا بے عقیدہ“ نہیں ہوں، پانچوں وقت کا نمازی ہوں۔ دین سے محبت رکھتا ہوں اور اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ اس شیطانی چکر سے نجات دے مگر کون اس دعوے پر اعتبار کر سکتا ہے؟ اگر اس شخص کو ایک قادر مطلق الرحمن الرحیم اور سمیع و بصیر خدا پر یقین ہوتا تو اس چکر میں ہی کیوں مبتلا ہوتا، جس حقیقت کو شیطان کہتے ہیں، وہ صرف بے یقینی کا نام ہے۔ عقیدہ کے بغیر روح محض ایک خلا ہے، اندھی، اندھیری اور سرد و خاموش خلا ہے۔ جہاں نہ کوئی کرن جگمگاتی ہے۔ نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ عقیدہ اور مذہب ہم معنی الفاظ نہیں، الحاد بھی عقیدہ ہے، مادیت بھی عقیدہ ہے، قومیت بھی عقیدہ ہے، وطن پرستی بھی عقیدہ ہے۔ سوشلزم بھی عقیدہ ہے عقیدہ اس قوت کو کہتے ہیں، جو انسانی روح کو بے اختیار حرکت میں لاتی ہے۔ اور انسان کی ساری ذہنی جذباتی اور دماغی توانائیاں اس نقطہ پر اس شدت سے سمٹ آتی ہیں کہ اس تصور کے بغیر نہ جینے میں لطف ہے نہ مرنے میں۔

شاہ دولہ کے چوہے

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی معنی کیفیت ہے، جس کے زیر اثر انسان ہر شے کی طرف بے عقیدہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خود اپنے کانوں، ہاتھوں اور آنکھوں پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ بے عقیدتی اور بھروسہ اٹھ جانے کی کیفیت کے بہت اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً غدودی خرابی کے باعث انسان کے دماغ کی نشوونما ٹھیک طرح نہ ہوئی ہو پیدائشی غبی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دماغ اور گلے کے غدود میں کوئی نقص رہ جاتا ہے۔ مثلاً اگر خون میں آئیوڈین کی کمی ہو تو دماغ اپنا فعل صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا اور انسان بچوں جیسی حرکات کرنے لگتا ہے۔ پنجاب میں شاہ دولہ کے مزار پر بطور عقیدت جو بچے چڑھائے جاتے ہیں ان کے سر بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور انہیں شاہ دولہ کے چوہے کہا جاتا ہے۔ ذہنی کمزوری کا دوسرا سبب نفسیاتی ہوتا اور خاص نفسیاتی ہے۔ یعنی بچے کی تربیت اور پرورش اس ڈھنگ سے کی جاتی ہے کہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے نہیں پاتی، کوئی قدم روک ٹوک کے بغیر نہیں اٹھا سکتا وہ جب کوئی فیصلہ کرنے

کی کوشش کرتا ہے اسے وہیں ٹوک دیا جاتا ہے بچے کو باتوں سے اشاروں کنایوں سے قول و عمل سے یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر اس نے اپنی مرضی سے کوئی قدم اٹھایا تو اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ ایسے ناسازگار ماحول میں پروان چڑھے گا۔ اس کی قوت فیصلہ اور خود اعتمادی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ وہ ہمیشہ تذبذب اور بے یقینی کے عالم میں مبتلا رہے گا، ہر باشعور آدمی واقف ہے کہ زیادہ لاڈ پیار ہو یا ڈانٹ ڈپٹ دونوں چیزیں بچے کی شخصیت کی نشوونما کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہ خیال کہ بچے پر کبھی سختی نہیں کرنی چاہیے۔ نفس انسانی واقفیت کی دلیل ہیں، انسان بھی ایک کتے، بلی، اور اونٹ گھوڑے کی طرح ایک تربیت پذیر حیوان ہے۔ جس طرح کتے کو شکار اور چوکیداری کی تربیت دی جاتی ہے۔ گھوڑے کو دوڑنا سکھایا جاتا ہے، اونٹ کو طبل پر ناپچنے کی تعلیم دی جاتی ہے (اور اس تعلیم و تربیت میں سختی کے بغیر کام نہیں چلتا) اسی طرح بچے کی تربیت میں نرمی اور گرمی دونوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے، نرمی کس حد تک؟ یہ فیصلہ ہر شخص خود اپنے مزاج کے پیش نظر کر سکتا ہے جہاں تک اس وہمی نوجوان کا تعلق ہے تو مجھے علم نہیں کہ اس کی تعلیم کس ماحول میں ہوئی ہے، اس کا بچپن خوش گوار گزارا ہے یا ناخوش گوار، والدین کا سلوک ہمت افزا ہوا ہے یا حوصلہ شکن؟ اور نہ معلوم ہے کہ اس نوجوان کا موجودہ ماحول کیا ہے۔ لوگ اس سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ کیا عزیز و احباب کی طرف سے اسے سدھارنے سنوارنے کی کوشش کی جاتی ہے، یا اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اس نوجوان کے مقصد حیات کیا ہیں؟ اس نے اپنے کچھ مقاصد متعین بھی کئے ہیں۔ یا محض خلا میں زندگی بسر کر رہا ہے؟ کسی مریض کی مکمل نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے اور جاننے کے لئے ان تمام سوالات کے جوابات پیش نظر ہونے چاہئیں۔ مجھے اس نوجوان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم کہ یہ وہم اور خبط میں مبتلا ہے، وہم اور خبط ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو پہلو ہیں۔ وہم کی حالت میں کوئی ایک فضول خیال کے گرد چکر کاٹنے لگتے ہیں مثال کے طور پر نجاست کا وہم یعنی یہ غلط فہمی

کہ میں اپنے کو کتنا ہی پاک کیوں نہ کر دوں ہمیشہ ناپاک رہوں گا۔ یا یہ کہ اگر فلاں اور فلاں کام میں نے کیا تو مصیبت نازل ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کو وہم ہو گیا تھا کہ اگر شمال کی طرف سر اور جنوب کی طرف پاؤں کر کے نہ سو یا رات میں موت واقع ہو جائے گی..... اس قسم کے وہموں کو جو صرف ایک معاملے کے متعلق ہوں، خطہ کہتے ہیں، خطہ میں آدمی صرف ایک خیال اور تصور سے چٹ جاتا ہے اور اس کی تمام ذہنی قوتیں جو دوسرے مفید کاموں میں صرف ہونی چاہیے تھیں۔ ایک احمقانہ مشغلے کے پیچھے صرف ہونے لگی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو اداکاری کا خطہ تھا، اس خطہ کے پیچھے اس شخص نے ساری زندگی لگا دی، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ فارسی کا مصرعہ ہے کہ:

ہر کس خیال خویش خطے دارد

ہر شخص کسی نہ کسی خطہ میں مبتلا ہے۔ اداکاری کا خطہ، لیڈری کا خطہ، تجارت کا خطہ، شوق اور رخطہ میں فرق یہ ہے کہ کسی چیز سے دلچسپی اور اس کا شوق طبعی رجحان سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً میرا طبعی رجحان شاعری میں نے ورثے میں پایا تھا۔ اس رجحان نے شوق شعری اور ذوق سخن کی شکل اختیار کی اور میں خطہ کا خطرہ مول لئے بغیر شعر کہنے لگا۔ خطہ کے پس پشت طبعی رجحان کا فرمان نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی جذباتی الجھاؤ (کام پلکس) ہوتا ہے کہ انسان کسی سعی رائیگاں (خطہ) کے پیچھے ساری عمر گزار دیتا ہے۔ خطہ اگر شوق کی حد تک محدود رہے تو وہ زندگی اور ترقی کا سرمایہ ہے، وہم کے درجے تک پہنچ جائے۔ تو زندگی اور ترقی سے کھلم کھلا فرار ہے۔ جسے معاف نہیں کیا جاسکتا، گفتگو شروع ہوئی ہے، وہم سے اور شوق تک آنچلی۔ آئیے پھر اسی نوجوان کی طرف واپس چلیں، اس مریض کے وہم کا علاج کس طرح ممکن ہے۔ کیا سکون بخش اور خواب آور گولیوں کے ذریعے؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک نفسیاتی دواؤں کی طویل فہرست میں کوئی ایسی گولی موجود نہیں، جو وہم کی شدت کو کم کر سکے۔ طبی نقطہ نظر سے وہم ایک سوداوی مرض ہے یعنی خون میں سودے کی زیادتی ہو جائے۔ (جگر کا فعل خراب ہو) تو آدمی طرح

طرح کے ادہام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یقیناً طب میں ایسی دوائیں موجود ہیں، جو سوداوی کیفیت کو دور کر کے انسان کو وہم اور شک سے نجات دلا سکتی ہیں (شک وہم ہی کی ابتدائی شکل ہے) لیکن سوداوی امراض بہت ضدی اور جان لیوا ہوتے ہیں۔ ایک آدھ مہینے میں شفا یابی کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ سالہا سال علاج کے بعد افادہ ممکن ہے۔ کلاسیکی نفسیات میں اس جبری وہم (آب سیشنل نیوراسمز) کا علاج تحلیل نفسی ہے۔ جس کی مدت فرائڈ کے بیان کے مطابق تین سال سے کم نہیں۔ میں وہم کا علاج (S.C.T) (انصاب تعمیر و تنظیم شخصیت) کی مشقوں کے ذریعہ کرتا ہوں۔ (ان کی مدت بھی ایک سال سے کم نہیں) صبح و شام کی دس دس منٹ سانس کی مشق اور دوسری مشقیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور الحمد للہ بالعموم کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ انسان ایب نارمل کے بجائے رفتہ رفتہ نارمل بننے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کیونکہ نفسیات کی دنیا میں معجزے نہیں ہوا کرتے۔

رودادِ غم

آپ کے مضامین برابر زیر مطالعہ ہیں ان ہی مضامین کے بھروسے پر اپنی رودادِ غم آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ شاید آپ کا مجھ پر مشورہ ہمیری دکھ بھری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا کر سکے۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے، کہ میں ٹائیفاؤڈ میں مبتلا ہو گئی تھی، ایک مقامی معالج سے رجوع کیا۔ انہوں نے گہری توجہ سے علاج کیا معالج کے شفقت آمیز رویے اور مخلصانہ علاج سے میں بہت جلد صحت مند ہو گئی اور مجھے اس کی ذات پر ایک عجیب و غریب قسم کا اعتماد پیدا ہو گیا۔ ایک روز باتوں باتوں میں میرے قابل معالج نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر آپ روزانہ اپنی والدہ، بھائی یا شوہر یا کسی ایسے رشتہ دار کے ساتھ جس پر آپ کو اعتماد ہو، میرے پاس آجایا کریں، تو میں عمل تنویم کر کے آپ کے ذہن کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کو بیدار کر دوں گا، جو اب تک آپ کے اندر دبی پڑی ہے۔ ان صلاحیتوں کی بیداری کے بعد آپ حیرت انگیز (سپر نارمل) قوتوں کی مالک ہو جائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ آپ کے اندر

چھٹی حس موجود ہے، ایک ذرا سی تحریک سے یہ صلاحیت بیدار ہو جائے گی، عمل تنویم سے آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ غیر معمولی فائدے ہوں گے اور آپ کے تجربات نفسیات کی دنیا میں تحقیقی نقطہ نظر سے انقلاب انگیز ثابت ہوں گے۔ جب وہ صاحب گفتگو کر رہے تھے تو میری والدہ اور شوہر دونوں موجود تھے۔ اپنے بارے میں عرض کر دوں کہ خود نفسیات میں ایم۔ اے کر چکی ہوں اور ریچر اسائیکالوجی (مابعدالنفسیات) کے کمالات پر سو فیصد یقین رکھتی ہوں۔ میرے شوہر معالج کے مشورہ سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے بخوشی اجازت دے دی کہ میں روزانہ شام کو تنویمی عمل کے لئے والدہ یا کسی دوسرے رشتہ دار کے ساتھ ان کے پاس جا سکتی ہوں۔ شوہر کی اجازت لے کر میں وہاں جانے لگی اور تنویمی عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تین مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

چھٹی حس کی بیداری

رفتہ رفتہ میں محسوس کرنے لگی کہ میرے اندر غنی قوت بیدار ہو رہی ہے جب بھی کوئی فضل مجھ سے گفتگو کرتا تو میں جان لیتی کہ یہ اگلا فقرہ کیا کہے گا؟ کئی بار اٹھا ہوتا ہے کہ میں نے مخاطب کو ٹوک دیا کہ تم فلاں بات تو کہنا نہیں چاہتے، لوگ اس پر حیران ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹیلی پتھی کے پہلے درجے میں داخل ہو چکی تھی۔ اب میں اس واقعہ یا حادثے کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جسے مرتے دم تک نہیں بھلا سکتی۔ صبح کا وقت تھا میں غسل خانے میں تھی کہ یکایک ذہن میں خود بخود یہ آواز گونجنے لگی کہ آج خدا نخواستہ میرے بچے جاوید کو حادثہ پیش آنے والا ہے، جاوید کی عمر اس وقت دس سال سے کم نہ تھی۔ نہایت ہونہار اور ذہین بچہ تھا۔ جوں ہی میرے اندر خوفناک پیش گوئی گونجی ہے، روح لرز اٹھی۔ بیان نہیں کر سکتی کہ مجھ پر کتنا خوف طاری ہو گیا۔ تاہم اس تشویش اور اضطراب کا ذکر میں نے گھر میں کسی سے نہ کیا، ناشتے کے وقت گھر کے سب لوگ جمع ہوئے، اس وقت بھی روح میں عظام برپا تھا، اور میری پریشان خاطر چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ یہی دسواں تھا کہ آج جاوید کو کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔ بار بار میری

نظریں جاوید کی طرف اٹھ جاتیں اور آپ ہی آپ جی بھر آتا۔
دل کئی روز سے دھڑکتا ہے
ہے کسی حادثہ کی تیاری

میرے شوہر میری حالت کو تاڑ گئے، پوچھا کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟ میں نے چپکے سے انہیں دل کی بات بتادی وہ ہنس کر ہل گئے، لیکن میرا عالم وہی تھا۔ ناشتے کے بعد وہ تیار ہوئے گیراج سے کار نکالی اور بچوں کو اسکول لے جانے لگے۔ میں نے کہا سب بچے جائیں گے لیکن جاوید گھر پر ہی رہے گا۔ میں اسے اسکول جانے کی اجازت نہیں دے سکتی، شوہر بگڑے مگر میں اپنی جگہ اٹل تھی۔ چنانچہ سب بچے اسکول چلے گئے، جاوید گھر پر رہا اس احتیاط کے باوجود بھی میرا دل قابو میں نہ تھا۔ بُرے بُرے وہم چلنے آتے تھے۔ رونے کو جی چاہتا، جب ممبر نہ ہوا تو والدہ کو فون کیا کہ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ آپ فوراً چلی آئیے۔ وہ بے چاری گھر آگئیں میں نے والدہ کو بھی تشویش سے آگاہ کیا، انہوں نے کافی تسلی بخشی دی۔ مگر بے سود آخر سوچا کہ اپنے معالج کے پاس جاؤں اور ذہن کی اس کیفیت سے انہیں مطلع کروں۔ ممکن ہے ان کے مشورے سے سکون قلب کا باعث ثابت ہوں۔ چنانچہ جاوید کو امی کے پاس چھوڑ کر ان کے مطب میں چلی گئی۔ وہ موجود تھے میں نے کہا کہ آج صبح سے میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جاوید کو خدا نخواستہ کچھ ہونے والا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟ انہوں نے بڑی غور اور توجہ سے میری بات سنی اور کہا کہ حادثے ٹل بھی جایا کرتے ہیں۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں اطمینان سے گھر جائیے اور جاوید کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھئے۔ ہر چند کہ میرے معالج بظاہر اعتماد کے ساتھ میری ڈھارس بندھا رہے تھے۔ تاہم صاف ظاہر تھا کہ وہ خود میری پیش گوئی سے شکر اور پریشان سے ہو گئے ہیں۔

خونین حادثہ

مطب سے گھر پہنچی تو دیکھا کہ جاوید بائی سے ضد کر رہا تھا کہ مجھے ڈور اور

چنگ منگوا دیجئے، میں نے جھڑک دیا۔ اور کہا کہ تمہیں چنگ لڑانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ لیکن جاوید کہاں ماننے والا تھا۔ آخر اس کی ضد اور تانی کی محبت رنگ لائی اور انہوں نے ایک روپے کا نوٹ بچے کے حوالے کیا کہ جاؤ دور اور چنگ منگوالو، جاوید نے خود باہر نکلنا چاہا لیکن میں نے اجازت نہ دی اور نوکر سے کہا کہ اس کے لئے دور اور چنگ لا دو۔ تھوڑی دیر بعد دور اور چنگ لے کر جاوید کو گھر پر چڑھ گیا اور میں امی سے بات چیت میں غرق رہی دفعتاً دھماکے کی سی آواز سنائی دی، میرا دل دھک سے ہو گیا۔ چیخ کر نوکر سے کہا کہ بھاگ کر جاؤ دیکھو یہ کیسی آواز ہے نوکر بھاگا بھاگا آیا اور خبر لایا کہ.....

آہ! کس دل سے اس خبر کو بیان کروں۔ میں نے دیکھا کہ جاوید لبو لبہاں زمین پر پڑا سسک رہا ہے، سر سے خون کی تفلنی جاری ہے۔ دم توڑتے بچے کو اندر اٹھا کر لائے۔ گھر میں کھرام بپا ہو گیا، بد نصیب باپ روتا ہوا دفتر سے آیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بچے کے سر پر زبردست چوٹ آئی ہے فوراً ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی میرا چاند فوب چکا تھا، میرا بچہ مرنے لگا تھا۔

اس حادثے کو دو سال گزر چکے ہیں۔ چوبیس مہینے، مگر روح کا زخم آج بھی تازہ ہے اب آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے مگر دل برابر روتا ہے۔

مرنے والے رہے گی شکل تری
دل سے نزدیک آنکھ سے اوجھل

میرے معالج کو اس حادثہ خونیں کا علم ہوا تو دوڑے آئے۔ میری دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ درحقیقت ان کے حوصلہ مندانہ شفقت آمیز، اطمینان بخش اور تسلی انگیز رویے سے ایسے محسوس ہوا کہ کسی نے میرے روحانی زخموں پر پھار رکھ دیا ہے۔ مجھے پھر احساس ہوا کہ یہ شخص کتنا عظیم اور کتنا شفیق ہے اسے مجھ سے کتنی ہمدردی ہے۔ اس کے دل میں کتنا درد اور اس کی طبیعت میں کیسی نفیس شرافت ہے۔

وہ چلے گئے

ایک روز میں اپنی ناسازی طبیعت کے سلسلے میں ان سے گفتگو کر رہی تھی کہ باتوں باتوں میں انہوں نے یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ عنقریب سیاحت کے سلسلے میں غیر ممالک کو جارہے ہیں، ایسا محسوس ہوا کہ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ جاوید کی جدائی کا غم تازہ ہو گیا، لیکن میں اپنے معالج کی سنجیدہ مزاحمت اور شرافت نفس سے واقف تھی۔ اس لئے دل پر جو کچھ گزر رہی تھی اسے زبان پر نہ لاسکی۔ ایک ہفتہ کے بعد پتا چلا کہ وہ چلے گئے۔ اس خبر نے دل کی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ مگر اپنا دکھ درد کس سے کہتی حالت یہ ہو گئی کہ جوں ہی شام ہوتی کوئی کلیجہ مسلنے لگتا۔ دن ڈھلتے ہی بے چینی اور ہڑکل شروع ہو جاتی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ میں ذہنی طور پر کس قدر مضطرب اور زخمی ہوں۔ بتا نہیں سکتی، پیش گوئی، مستقبل بینی اور ٹیلی پیتھی کی تمام صلاحیتیں بجھ گئی ہیں۔ دماغ بوجھل اور سر بھاری رہتا ہے، نہ بچے اچھے کہتے ہیں نہ گھر، طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا ہے۔ شام ہوتے ہی ان کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے جب تک یہ تصور قائم رہتا ہے۔ پہلے رہتی ہوں، پھر وہی کرب طاری ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے اڑ کر وہیں چلی جاؤں، جہاں وہ ہیں۔ ان کے بغیر زندگی خالی خالی ویران ویران سی لگتی ہے۔ صحت ہے کہ روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔ گھر میں اللہ کے فضل سے ہر طرح کی آسائشیں میسر ہیں لیکن مجھے کسی چیز سے سکون نہیں ملتا، یہ بات اتنی عجیب و غریب ہے کہ اس کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ میں اپنی عصمت و عزت کی محافظ ہوں۔ تاہم اس بیماری دل کا کیا علاج؟ میں نے سانس کی مشقوں کے ذریعے اپنے اعصابی نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی خود نو لسی بھی کی، صفحے کے صفحے بھر دیئے، لیکن اندر کا بخار نہ نکل سکا۔

جناب والا! آپ کے مضامین اکثر پڑھتی ہوں۔ آپ مجھے اپنی مٹی تصور کریں کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ اس اضطراب پر غالب آسکوں۔ وہ صاحب اب ایک غیر ملک میں مقیم ہیں اور کسی جادوگر (ویج ڈاکٹر) سے جادو سیکھ رہے ہیں، میں اپنا نام پتہ تحریر نہیں

رہ رہی۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے، آپ مضمون کے ذریعہ مشورہ دیجئے کہ میں کیا کروں؟ کیوں کہ اس جان لیوا روحانی صدمہ کو بھلا دوں؟ آپ کی بیٹی۔ (اے۔ بی۔ سی)

معالج و مریض

اگرچہ میں نے اپنی نامعلوم روحانی بیٹی کا خط کا بہت بڑا حصہ یہاں نقل کر دیا ہے تاہم اب بھی خط کے بعض حصے چھوڑ دیئے ہیں، مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ اے۔ بی۔ سی کوئی بھی ہوں، کہیں بھی ہوں، میں ان سسے لئے دعا گو ہوں۔ خدا کرے وہ جلد اس ”سیلف ہپ ناسز“ سے نجات پالیں۔ عشق — خریف ہپ ناسز یعنی خود ترغیبی اور خود تنویدی ہی تو ہے۔ مکتوب نگار کو سب سے پہلے معالج اور مریض کے رشتے پر توجہ دینی چاہئے۔ مریض (خواہ وہ جسم کا مریض ہو یا — ہن کا نفسیاتی بیمار ہو یا عاشق) جب مرض سے نکل آ جاتا ہے۔ دکھ سہتے سہتے عاجز ہو جاتا ہے۔ تو ایک ایسی شفیق ہمدرد اور مہربان و معجز نما ہستی کی تلاش کرتا ہے جو اس کے روحانی دکھوں کا ازالہ اور جسمانی تکلیفوں کا مداوا کر سکے۔ یہ تو مزا غالب ہی تھے کہ یہ طنز کر سسے مطب سے چلے آئے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہر شخص غالب نہیں ہوتا، معالج کی قسمت مریض کے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم المرتبت فاضل البشر ہستی ہے اور میری تمام تکالیف کا ازالہ صرف اسی کی نگاہ توجہ سے ہو سکتا ہے۔ اگر اپنے معالج اور طبیب کی نسبت آپ کو حسن ظن اور معجزہ نمائی کا گمان نہ ہو تو آپ — سائل بن کر اس کے مطب کا رخ ہی کیوں کریں، جب مریض معالج کے سامنے پہنچتا ہے تو دوسرا پانچ سوال والتجا بن جاتا ہے، یہ ایک انفعالی کیفیت ہے۔ انفعالی کیفیت یہ کہ معالج کے ہر فعل و عمل کو بہ دل و جان قبول کر لیا جائے۔ اس کے بغیر علاج ممکن نہیں — شفا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، معالج کے ہاتھ میں مریض کے ذہن کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو کبھار کے چاک پر مٹی کی، وہ اسے

جس سانچے میں ڈھال دے۔ اگر مریض غیر معمولی طور پر حساس (جیسے اے۔ بی۔ سی) اور معالج غیر معمولی طور پر خلیق، شفیق اور باشعور ہے تو دونوں میں فعل و انفعال کا رشتہ ایک ہی نشست میں قائم ہو جاتا ہے معالج پیر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، مریض مرید کی، نفسیات میں مریض و معالج کے اس لاشعوری رشتے کو دماغی رابطہ کہتے ہیں۔ اے۔ بی۔ سی نے معالج کی نسبت اپنے خط میں اعتراف کیا ہے کہ:

”وہ غیر معمولی عظیم اور شفقت کرنے والی ہستی تھے“

علاج معالج کی پہلی منزل میں اے۔ بی۔ سی اور ان کے طبیب کے درمیان ذہنی مفاہمت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں انہوں نے معالج کی شخصیت سے غیر معمولی اثرات قبول کئے وہاں خود معالج پر گہرا اثر ڈالا۔

تنویدی عملیات

اے۔ بی۔ سی نے اپنے معالج کے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ آج کل غیر ممالک میں جادو سیکھ رہے ہیں، اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ صرف ماہر تنویم بلکہ نفسیات کے فن اے بھی آشنا تھے۔ علاج کے دوران میں انہوں نے محسوس کر لیا کہ اے۔ بی۔ سی کے اندر چھٹی حس موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے مریضہ کو تنویدی معمول (جس پر تنویدی نیند طاری کی جاتی ہے) بننے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ قبول کر لیا اور تین ماہ تک اے۔ بی۔ سی کسی معمول کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ اس تنویدی عمل کے درمیان عامل (معالج) نے اپنے معمول (اے۔ بی۔ سی) کو کیا کیا ترغیبات دیں، اس کی کوئی تفصیل معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عامل نے تنویدی نیند کے عالم میں معمول کو یہ تلقین بھی کی ہو کہ ”تم مجھے کبھی بھی نہیں بھول سکتیں۔“

معالج نے اگر یہ ترغیب و تلقین کی تھی تو ظاہر ہے کہ اے۔ بی۔ سی اسے یاد نہیں رکھ سکتیں۔ اگر عامل نیند کے دوران معمول کو یہ ترغیب دے کر یہ ہدایت بھی کر دے کہ تم ترغیب کو بھول جاؤ گی تو ظاہر ہے پھر وہ ترغیب و تلقین اس وقت تک

ذہن کی سطح پر نمایاں نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ عامل ایسا کرنے کا حکم نہ دے۔ ہو سکتا ہے کہ تین ماہ کے تنویمی عملیات کے زمانے میں معالج ہیناٹھ نے اپنی یاد کا کوئی بچ ان کی کشت جان میں بودیا ہو، یہ بچ اب برگ و بار لا رہا ہے۔ اور میری نادیدہ شنیدہ بیٹی اسی کے زخموں کی فصل کاٹ رہی ہے، لیکن یہ محض بدگمانی ہے۔ اس پورے معاملے پر ہمیں دوسری طرح غور کرنا پڑے گا۔ مکتوب نگار خاتون غیر معمولی حساس اور اثر پذیر واقع ہوئی ہیں۔ وہ مرض کی امفعالی کیفیت میں ایک معالج کے پاس پہنچیں، جس کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ معالج نے مریضہ کے ساتھ دل موہ لینے والا سلوک کیا اور اس طرح اے۔ بی۔ سی کے دل میں علاج کرنے والے کے لئے گہری ہمدردی کا جذبہ یا گوشہ التفات پیدا ہو گیا اگر مریضہ کو ان کے علاج سے صحت نصیب نہ ہوتی تو معالج کی شخصیت کا طلسم فوراً ٹوٹ جاتا، مگر نہیں علاج کامیاب ثابت ہوا؟ بیمار اچھا ہو گیا۔ اس طرح باہمی تعلق کے رشتہ کو اور تقویت پہنچی۔ معالج کی نفسیاتی بصیرت نے مریضہ کی اندرونی صلاحیتوں کو تازہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے رائے دی کہ تم عمل تنویم کے ذریعے اپنی چھٹی حس کو بیدار کرو۔ تاکہ خارق العادات (غیر معمولی سپرنارل) کارنامے انجام دے سکو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علاج کے دوران میں معالج کا طرز عمل اتنا شریفانہ اور پاکیزہ رہا تھا کہ نہ اس وقت اس کی نیت پر شبہ کیا جاسکتا نہ آج شبہ کی کوئی وجہ موجود ہے۔ اے۔ بی۔ سی نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ وہ ایک خلیق، ہمدرد، نمکسار اور باشعور انسان تھا۔ مجھے ان کی رائے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، میرا خیال یہ ہے کہ معالج نے مریضہ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر محض علم و تحقیق کے شوق میں اسے تنویمی عمل کا مشورہ دیا ہوگا۔ یہ مشورہ صحیح تھا، اگر میں بھی عامل کی جگہ ہوتا تو اس حساس خاتون کو یہی مشورہ دیتا۔ عمل تنویم سے اے۔ بی۔ سی کی مخفی صلاحیتیں بیدار اور ان کی کشف قلوب (دل کی باتیں جاننا) مستقبل بنی اور ٹیلی پتھی کی صلاحیت پوری طرح بروئے کار آگئیں۔ یہ ڈاکٹر کی عظمت کا دوسرا ثبوت تھا، علاج کے زمانے میں معالج و مریض کے درمیان مرید

و مرشد کا جو تعلق پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ عمل تنویم میں عامل و معمول کا رشتہ اور تعلق اس سے کہیں گہرا، قوی اور دور رس ہوتا ہے۔ عمل تنویم میں عامل معمول کے درمیان اثر ڈالنے اور اثر قبول کرنے کی ہم آہنگی پیدا نہ ہو تو ممکن ہی نہیں کہ ہیناٹھ کا جادو کام کر سکے۔ میں کسی شخص کے تجسّس اور ترغیبات اس وقت تک قبول ہی نہیں کر سکتا جب تک اس کی شخصیت مجھ پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ اے۔ بی۔ سی نے معالج کی تنویمی ترغیبات قبول کیں اور وہ اس کی معمول بن کر رہ گئیں۔

نئی عورت کا ظہور

اب ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا، یعنی مرحوم و معصوم جاوید کی حادثاتی موت اور موت بھی کتنی اچانک اور کس قدر دردناک؟ ایسے حادثات کے نتیجے میں روح انسان پھل کر موم کی طرح ہو جایا کرتی ہے۔ آپ اس وقت انسانی شخصیت کو کسی سانچے میں ڈھال سکتے ہیں غیر معمولی جذباتی سانچے (مثلاً یہی واقعہ) آدمی کی مستقل سیرت و کردار کے ٹکڑے اڑا دیتے ہیں اس کا ذہن پارہ پارہ ہو جاتا ہے دل و دماغ کے تمام پچھلے سانچے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان بیک نظر یا چشم زدن میں کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ جاوید کے حادثے نے اے۔ بی۔ سی کی پرانی صابر و ضابطہ اور حقیقت پسند شخصیت کا خاتمہ کر ڈالا اور اس کے طبع سے ایک نئی عورت برآمد ہوئی۔ جاوید کی موت سے قبل اور اس کے بعد معالج نے اس حساس اور باشعور خاتون سے جو شریفانہ، پاکیزانہ، مرشدانہ اور باوقار سلوک کیا تھا۔ ناممکن تھا کہ اس کے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔ یہ تاثر زیادہ مدت تک اے۔ بی۔ سی کی روح میں مدفون نہیں رہ سکتا تھا۔ اتفاق سے اس کے اظہار کی ایک طبعی اور فطری وجہ پیدا ہو گئی۔ یعنی معالج کا ترک وطن، اگر وہ شخص یہیں رہتا اور اپنی مریضہ اور معمول سے اس کی عام ملاقاتیں جاری رہتیں، تو یقیناً خاتون نارمل زندگی بسر کرتی رہتی۔ لیکن جاوید کی موت کے بعد یہ دوسرا حادثہ پیش آیا کہ اس کا عظیم رہنما اسے بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس شدید ضرب نے اے۔ بی۔ سی سے اس کے صبر

وضبط کے آخری مورچے کو بھی مسمار کر دیا اور وہ ایک ایسے بے پناہ روحانی اضطراب اور ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئیں کہ خود ان سطور کا لکھنے والا اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اگرچہ تنویمی عملیات کو تین سال گزر چلے ہیں۔ لیکن اے۔ بی۔ سی اب تک عامل کی شخصیت کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکیں۔ وہ آج بھی ”پنٹا نازڈ“ ہیں اور ہر روز شام ہوتے ہی (جو عمل تنویم کا وقت تھا) ان تنویمی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یعنی وہ اپنے کو معالج کی شخصیت کے سحر میں گم کر دیتی ہیں، عامل کا چہرہ ان کی نگاہ تصور کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور اس طرح معمول کی روح پر عامل کے اثرات کی تہہ روز بروز دبیز ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اے۔ بی۔ سی کے لئے شام کا تصور سخت پریشان کن ہوتا ہے۔

میں اب تک دن کے ہنگاموں میں گم تھا
مگر اب شام ہوتی جا رہی ہے

میری روحانی بیٹی کو اپنی اس ذہنی کیفیت کے لئے کوئی عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ان کا کردار چاندنی کی طرح پاکیزہ، دھوپ کی طرح شفاف اور شبنم کی طرح بے میل اور ہر آئینے سے پاک ہے معالج کی یاد اور اس کا تصور ایک قدرتی عمل کا (جس کی تشریح کر چکا ہوں) نتیجہ ہے اے۔ بی۔ سی کی جگہ اگر کوئی فرشتہ بھی ہوتا تو اسی کرب سے دوچار ہوتا۔ ان کے نفس کی شرافت طبیعت کی طہارت اور روح کی عظمت ناقابل بیان ہے۔ وہ کسی بدنیتی یا اخلاقی کمزوری کا شکار نہیں ہیں۔ اور نہ وفاداری کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ حساس لوگ جتنے ذہین ہوتے ہیں، اتنے ہی اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ اے۔ بی۔ سی حساسیت کا پیکر اور بلاشبہ ذہانت کا مجسمہ ہیں۔ اگر معالج ان کی زندگی میں نہ آتا تو ان کی غیر معمولی شدید الاحساسی اپنے اظہار کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیتی، یہ چشمہ کسی دوسرے شکاف سے بھوٹ نکلتا ایک تو اے۔ بی۔ سی کی حساسیت، اس پر تنویم کا عمل معالج و مریض کا رشتہ، عامل و معمول کا تعلق، جاوید کی موت، معالج کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی بے پناہ کشش، ان تمام اثرات نے مل کر یہ کیفیت پیدا

کر دی ہے۔ اے۔ بی۔ سی کی صحت کی خرابی، چڑچڑاپن، ہر چیز سے بیزاری، ایک تصور میں گم رہنا۔ انشاء اللہ یہ سب عارضی حالتیں ہیں (دل و دماغ کی) آخر کار اے۔ بی۔ سی کا حقیقت پسندانہ نقطہ نظر ابھرے گا۔ شام کا وقت ان پر سخت گزرتا ہے اگر گزرتا ہے، یقیناً گزرتا ہوگا۔ اگر وہ اس وقت خواہ مخواہ کی کوئی مصروفیت (مثلاً بچوں کی تعلیم یا اپنے حالات کے لحاظ سے کوئی اور مشغلہ اختیار کر لیں) تو بہتر ہے۔ صبح جاگنے کے بعد فوراً مغرب کے وقت اور شب میں سونے سے قبل سانس کی مشقیں کر لیں۔ یہ کرب یہ بے چینی یہ الجھن اور یہ اضطراب ایک روز میں ختم نہیں ہوگا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ذہن پر غالب آسکیں گی۔ وہ جس تنویمی کیفیت میں مبتلا تھیں اور اب تک مبتلا ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہوگی میرا بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی جدید تعمیر کے لئے S.C.T کورس کر لیں۔

مرچھائیوں کے پیچھے

مجھے مغربی پاکستان کے کسی شہر سے س۔م۔ کا خط ملا ہے، خط کے حرف حرف سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والی کس قدر زود احساس اور شدید الاحساس واقع ہوئی ہے زود احساس اور شدید الاحساس لوگ مبالغہ پسند ہوا کرتے ہیں اور وہ اپنے دکھ سکھ کی کیفیتوں اور دل و دماغ کی حالتوں کا بیان اس قدر جوش و خروش اور اتنی باریک بینی سے کرتے ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے، مثلاً وہ اپنی محرومی کا ذکر کریں گے۔ تو اس کیفیت کے اظہار و ابلاغ کے لئے بہت سے استعارے اور تشبیہیں استعمال کریں گے۔ صرف یہ کہ دنیا میں محروم و نا آسودہ زندگی گزاری ہے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتا۔ حساس لوگوں کو ہمیشہ یہ شبہ رہتا ہے کہ لوگ ان کے تاثرات کا اس وقت تک صحیح اندازہ اور ادراک نہیں کر سکتے، جب تک وہ اپنے تاثرات کو بار بار نئے انداز سے نہ دہرائیں۔

بات کی باتیں

وہ ایک بات سے اتنی باتیں بنا لیتے ہیں کہ ان کی عام گفتگو افسانوی اور رومانوی بن کر رہ جاتی ہے۔ س۔م کا خط انتہا پسندی کا آئینہ دار ہے اگر ہم کسی شخص کا

نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتے ہیں، تو حقیقتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (1) یہ کہ اس کی ہر بات میں سے شروع ہوگی اور میں پر ختم ہوگی۔ (2) دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے ہر واقعہ کا ذکر صرف اپنی ذات کے حوالے سے کرے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی خارجی واقعہ کا تصور اور تذکرہ خارجی واقعے کے طور پر کر سکے۔ مثلاً اگر اس سے یہ کہا جائے کہ امریکی ہوا باز ویت نام پر بم باری کر رہے ہیں۔ تو وہ فوراً کہے گا کہ اچھا، سب کچھ تباہ ہو جائے۔ آخر میں تو تباہ ہو چکا ہوں، جی ہاں اس کا اصرار یہی ہوگا۔

سیاہ ہے دل گیتی سیاہ تر ہو جائے

خدا کرے کہ ہر ایک شام بے سحر ہو جائے

اس تمہید کو پس منظر میں رکھ کر ہم س-م- کے خط کے بعض مندرجات کا

مطالعہ کرتے ہیں۔

نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں

لکھتی ہیں کہ میری داستان الم بہت طویل ہے جلد مشورہ دیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ گھبرا کر کوئی غلط قدم اٹھاؤں یا دماغی توازن کھودوں۔ رئیس صاحب! رومانے کے ظلم و ستم اور حالات کے جبر نے مجھے مجرم اور گناہ گار بنادیا ہے، دل نادان کی ذرا سی بھول چوک نے مجھے جرم پر آمادہ کیا۔ اور پھر دنیا نے اس جرم کی اتنی کڑی سزائیں دیں کہ..... یوں سمجھئے کہ زندگی جہنم بن کر رہ گئی میں زندگی اور موت کے ہاتھ کھلونا بن کر رہ گئی ہوں، نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں۔ میں نے خدا سے بار بار گڑگڑا کر دعائیں کیں کہ الہی مجھے باعزت موت دے دے تاکہ خودکشی کے ارتکاب جرم سے بچ جاؤں۔ اب تک تو مجھے کجنت پر موت نہیں آئی دیکھیں کب آتی ہے اور کس طرح؟ خدا کے لئے جلد از جلد خط کا جواب دیں، کوئی فیصلہ کریں ورنہ یہ ٹھکانا ہوا دیا بچھ جائے گا نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں گی۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میرا جی چاہتا ہے کہ گھر کو آگ لگا دوں، برتنوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دوں، دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ زمین پر پھیلی کی طرح تڑپوں، ہر انسان کا گلا گھونٹ دوں۔ بار بار اندر سے آواز آتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہے کر گزر۔ کس مشکل سے اس خوفناک مہیب اجنبی آواز پر قابو پاتی ہوں، کہہ نہیں سکتی۔ حیرت ہے اعصاب چیخ کیوں نہیں جاتے، دماغ دھماکے سے اڑ کیوں نہیں جاتا۔ کلیجہ پھٹ کیوں نہیں جاتا، مگر میں بھاگ کر کہاں جاؤں؟ میرا اس دنیا میں کون ہے؟ میں کس سے ہمدردی کی توقع کر سکتی ہوں؟ مجھ سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ تم مجرم ہو؟ تم گناہ گار ہو۔ کسی انسان پر تمہارا سایہ نہیں پڑنا چاہئے۔ تم چڑیل ہو۔ یعنی میں چڑیل ہوں؟ خدا کے لئے سنئے کہ اس چڑیل پر کیا گزری؟

چڑیل پر کیا گزری؟

لوگو! میں تو مجسمہ رحم تھی۔ میں خوش اخلاق اور ہنس کھنسی میں تو تعلیم یافتہ اور ہنرمند تھی۔ میں نے دوسروں کے لئے جینا سیکھا۔ میرا شیوہ تو غریبوں کی خدمت اور انسانوں سے محبت تھا۔ میری روح پیار کی پیاسی تھی، میں پیار بھرتی تھی اور پیار کا شوق تھی۔ کاش کوئی سینہ چیر کر میرا دل نکالے اور دیکھے کہ یہ کتنا شفاف، بے داغ اور بے عیب ہے لیکن اس دل کا تو خون کر دیا گیا ہے اب تو یہ ایک زہریلی چیز بن گیا ہے۔ ہائے میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ کیا بگاڑا ہے؟ میں اندر سلگ رہی ہوں پکھل رہی ہوں۔ سنا ہے خدا گناہ گار انسانوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تو پھر انسان، انسان کو کیوں معاف نہیں کرتا؟ اب رئیس صاحب! اس چڑیل کی داستان حیات سنئے۔ بچپن میں مجھے شفقت بھی ملی، محبت بھی، عیش و عشرت بھی، میں بہت بھولی بھالی تھی۔ رحم دل، حساس، اور ہر بات کا بہت جلد اور بہت گہرا اثر قبول کرنے والی لڑکی! میری پیدائش ایک سرد پہاڑی علاقے میں ہوئی۔ شریف گھرانہ تھا اور ٹوٹ کر محبت کرنے والے لوگ! عبادت گزار، پرہیز گار اور متقی اور خدا ترس میں بچپن ہی سے عبادت کی رسیا اور خدمت کی شوقین تھی۔ بلا تامل اپنی چیزیں ضرورت مندوں کو دے دیتی، ذہن بھی روشن تھا ابتدائی درجوں میں

وظیفہ حاصل کیا۔ میری بد قسمتی کا آغاز عمر کے تیرہویں سال سے ہوتا ہے ایک کرائے دار عورت نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ ایک روز اس نے سینے سے لگا لیا اور پیار کرنے لگی نہ جانے اس نے تسکین جذبات کی یہ صورت کیوں نکالی تھی۔ بہر حال اس کے اس عمل سے اندرونی طور پر جاگ اٹھی۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا بھیج ہے؟ یہ کیسا لطف ہے جو ادھورا رہ جاتا ہے خیر چودہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ازدواجی زندگی کا پہلا سال کس لطف میں گزرا؟ یہ عرض کر دوں کہ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے دو بچے تھے جنہیں میں نے اپنی ماما بھری گود میں چھپا لیا۔ پھر خدا نے مجھے چاند سا بیٹا عطا کیا۔ اب نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ رفتہ رفتہ ہماری ازدواجی زندگی کے شہد میں زہر گھلنے لگا۔ پہلے شوہر کے التفات میں کمی بے توجہی میں تبدیل ہوئی اور آخر کار بے توجہی نفرت بن گئی۔ شوہر کے اس ذہنی انقلاب میں سب سے بڑا ہاتھ ساس کا تھا۔ رئیس صاحب! دس بارہ سال میں نے ایسی جہنمی زندگی بسر کی کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔ شوہر سے بول چال بند، ساس سے کٹا چھنی اور ماحول مخالف! میں نے یہ پورا زمانہ دوڑتے دوڑتے بسر کیا۔ س۔ م نے اپنے محرومی کا اظہار تشریح میں بڑی لمبی عبارت لکھی ہے، جسے میں حذف کرتا ہوں اور اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔

آہ وہ اجنبی

زندگی یوں ہی سلگتے، کڑھتے، گزر رہی تھی کہ تقدیر نے آخری بھر پور وار کیا۔ وہ ایک مظلوم اور غریب انسان تھا۔ میری طرح ستایا ہوا اور ٹھکرایا ہوا، آہ اجنبی! اس کے پاس نہ جائیداد تھی، نہ عزت، نہ شہرت، ہاں ڈھیروں محبت تھی، ڈھیروں پیار تھا۔ ہم قریب آتے چلے گئے (شوہر کی نگاہوں سے چھپ کر) وہ مجھے دردِ دل سناتا۔ اور میں اس سے اپنا دکھڑا بیٹھتی۔ اس طرح ہم دونوں میں ایک عجیب و غریب روحانی رشتہ قائم ہو گیا۔ اور رئیس صاحب! میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ہاں، زندگی اس

قابل ضرور ہے کہ اسے بسر کیا جائے۔ آپ بے شرم کہہ لیں یا منہ پھٹ۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے، اس چاہت کی پہل میں نے کی تھی، یہ گناہ آدم سے پہلے حوا سے سرزد ہوا تھا۔

تو عبث عذر خواہ ہے پیارے

عشق میرا گناہ ہے پیارے

اس کا ہر بیٹھا بول زخمی روح پر مرہم کا کام کرتا، اس کا قرب مجھے مہکا دیتا تھا۔ اس کی نزدیکی مجھے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی تھی۔ وہ جتنا خوش تھا اس سے زیادہ خوش، گفتگو تھا، ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے۔ آہ اس کی محبت کی شغلی شغلی خوشبو آج تک محسوس ہوتی ہے اس محبت کا سب سے پہلا رد عمل یہ ہوا کہ میں ہر چیز سے باغی ہوگئی۔ اور اس بغاوت کے نتیجے میں جرم کا ارتکاب ہوا، جرم سے پہلے ہم تمام رشتوں کے باوجود دو جسم تھے، الگ الگ۔ مگر جرم کے بعد ایک ہی وجود کے دو حصوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ قصہ مختصر جرم کھل گیا، اس اجنبی کو بھگا دیا گیا۔ میں نے معافی مانگ لی، لیکن آج تک مجرم اور معتب ہوں۔ سسرال اور میکے دونوں جگہ بدنام اور رسوا ہوں۔ جب ففتیئیں اور تیسیتیں حد سے گزر گئیں تو میں گڑگڑا کر کہا کہ اب مزید گنجائش نہیں۔ خدا کے لئے مجھے پوری ہستی کے سامنے رنگ نہ کرو ظلم کی انتہا ہوتی ہے، سسک سسک کر نہیں مرنا چاہتی، ایک دم گولی مار دو، رئیس صاحب! میں چند روز کے جرم کا کفارہ سالہا سال ادا کیا۔ اور جب تک زندہ ہوں..... یہ تاوان ادا کرتی رہوں گی۔ عجیب بات ہے چودہ سال تک جس دل کو ایک صاحب حیثیت انسان جیت نہ سکا (یعنی شوہر) اسے ایک اجنبی نے چند ہفتے میں جیت لیا، جو روحانی پیاس چودہ سال تک نہ بجھ سکی تھی۔ وہ ایک روز میں ایک ساعت میں ایک آن میں بجھ گئی، یہ ہے میری داستان غم، مناسب سمجھیں تو اسے کاٹ چھانٹ کر شائع کر دیں۔ براہ کرم جواب جلد دیں، یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اپنی تمام ذلتوں، رسوائیوں اور

مصیبتوں کے باوجود میں اس اجنبی کا کلمہ پڑھتی ہوں۔ (جواب کی طالبہ س۔م)

شدت تاثر

میں نے خطوط کے انبار میں سے س۔م کا انتخاب، خط کے مندرجات کی ندرت اور واقعے کے انوکھے پن کی بناء پر نہیں کیا، بلکہ شدت تاثر کی بناء پر کیا ہے۔ س۔م جن حوادث سے دوچار ہوئیں، ان سے ہزاروں، لاکھوں لڑکیاں اور عورتیں دو چار ہو چکی ہیں۔ دو چار ہوتی ہیں اور دو چار ہوتی رہیں گی، لیکن س۔م جس ڈرامائی طور پر اپنی زندگی کو پیش کیا ہے اور جس فنکارانہ اسلوب تحریر میں کیفیات قلب پیش کی ہیں۔ یہی چیز قابل توجہ ہے۔ بظاہر ان کی زندگی کے اہم واقعات درج ذیل ہیں (1) تیرہ سال کی عمر میں انہیں ایک عورت نے اندر سے جگادیا۔ وہ حیران تھیں کہ یہ کس قسم کی لذت ہے، جو ادھوری رہ جاتی ہے۔ (2) چودہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی، وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھیں۔ (3) بہت جلد ازدواجی زندگی کی مشاس ختم ہو گئی اور وہ شوہر کے التفات خاص سے محروم ہو گئیں۔ (4) غالباً سال تک وہ پیار کے ایک بول اور پریم کی ایک نظر کو ترستی رہیں۔ (5) یکا یک ان کی زندگی کے دروازے پر ایک اجنبی نے دستک دی۔ دروازہ کھول دیا گیا اور اجنبی اندر داخل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ وہ ان کے جسم اور روح تک میں حلول کر گیا۔ س۔م سے لغزش ہوئی لغزش کا پتا چل گیا، اجنبی کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور س۔م کو اس طرح رسوا کیا گیا عزت نیک نامی اور وقار سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اب یہ غمزدہ لڑکی ہے اور دنیا بھر کی لغتیں..... س۔م نے سوال کیا ہے کہ وہ مجرم ہیں یا معصوم! میں اس سوال کا جواب بعد میں عرض کروں گا کہ وہ مجرم یا معصوم! پہلے شدت تاثر کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

ذہنی ڈرامہ سازی

پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ ذہنی صحت مند (نارمل) یا ذہنی بیمار (ایب نارمل) میں کیا فرق ہے؟ دنیا کے تمام انسان جذبات اور تاثرات کے آلہ کار ہیں۔ دنیا کا کوئی

انسانی سینہ جذبے اور کوئی تاثر سے خالی نہیں بھلا آدم کا کوئی بیٹا اور حوا کی کوئی بیٹی ایسی ہو سکتی ہے۔ جس کو یکے بعد دیگرے دکھ، سکھ، تشویش، اطمینان، اضطراب، ہیجان، غصہ، خوف، حسد، کینہ، رشک، افسردگی، اضطلال اور دوسرے جذباتوں سے گزرنا نہ پڑتا ہو۔ ہر شخص کی زندگی ایک جذباتی ڈرامہ ہے جو ذہنی سطح پر مسلسل کھیلا جا رہا ہے۔ نارمل انسان ان کیفیات، حالتوں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ایب نارمل انسان نہیں رکھتے۔ ایب نارمل انسان ہر جذبے کو اس قدر شدت سے محسوس کرتا ہے۔ پوری زندگی اداکاری میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ذہنی ناصحت مندی نفسیاتی بیمار جذبات کی تشریح میں معمولی طرز بیان اور معمولی اظہار پر قابض نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی کمزوری کی بناء پر جذبے کو (مثلاً پیار سے محرومی کا احساس) بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے اور اتنی ہی شدت سے اس کا اظہار چاہتا ہے اور کرتا ہے ”جنون“ ذہنی اختلال کی آخری شکل ہے۔ جنون کے عالم میں جذبات کی شدت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور انسان کا نظام جسمانی اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ مثلاً ہسٹریا کے دورے میں مریض بال لوجہتا ہے کپڑے پھاڑتا ہے، زمین میں ترپتا ہے، کبھی کبھی خودکشی کی بھی کوشش کرتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کی آخری شکل ہے۔ خود ہسٹریا کے دورے ہی ہسٹریا کا علاج ہیں، اس دورے کے نتیجے میں مریض کے نفس کی مقید جذباتی توانائی کا بہت بڑا حصہ خارج ہو جاتا ہے۔ جی کی بجز اس نکل جاتی ہے اور مریض کو عارضی سکون مل جاتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ محسوس کیا کہ مریض نے ایک عام جذبے کے اظہار کے لئے کیسا ڈرامائی اور شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے؟

س۔م کی تحلیل نفسی

س۔م کی زندگی میں اس کے سوا کوئی انوکھا پن نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئی ہیں۔ ان کی تحریر اسی حساسیت اور مبالغہ آرائی کا شاہکار ہے۔ اس لڑکی کو کوئی ایسا تجربہ پیش نہ آیا، جو دوسری لڑکیوں کو کم و بیش نہ آتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ ادھوری لذت کا یہ احساس ایک جذباتی جوالا کھسی کی شکل اختیار کر جاتا ہے، بہت سوں کے اندر یہ

جذباتی جوالا کھی پھٹ جاتا ہے۔ بعض اس طوفان سے خشک دامن گزر جاتی ہیں تاہم اس تجربے سے ہر لڑکی اور لڑکے کا گزرتا یقینی اور لازمی ہے۔

دیار جاں سے سیل غم فقط اک بار گزرا تھا
مگر اس تجربے سے زندگی غم ناک ہے اب تک

س۔ م شروع ہی سے دروں میں رہی ہیں، دروں میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات سے اس طرح چٹے ہوئے رہتے ہیں، جس طرح سانپ سے کینگی اور پرندے سے پر! دروں میں لوگوں کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت ”ہم“ کو حاصل ہوتی ہے۔ یا ”میں“ کو حاصل ہوتی ہے۔ محبت ہے تو ان کی، نفرت ہے تو ان کی، محرومی ہے تو ان کی، خوشی ہے تو ان کی، الغرض۔

میں ہی میں ہوں تری محفل میں کوئی اور نہیں

یہ لوگ ایک آنہ دے کر ایک روپے کا مال خریدنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف ایک نگاہ التفات صرف کر دیں اور دوسرے ان پر اپنی جان بھروسہ کریں اور کاروبار محبت ہی نہیں، عام سماجی تعلقات کے بارے میں دروں میں لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ انہیں ہمیشہ محرومی کی شکایت رہتی ہے جو شخص خود اظہار محبت میں پس و پیش کرے اور دوسروں سے گرجوش محبت کا طالب ہو، اس کا محروم محبت رہ جانا ناگزیر ہے۔ جو خود محبوبیت (اپنی پرستش آپ) کے مرض میں گرفتار ہو دوسروں کی محبت سے انصاف ہی نہیں کر سکتا۔ س۔ م نے صرف یہ لکھا ہے کہ ازدواجی زندگی کے ابتدائی ڈیڑھ سال نہایت خوشگوار گزرے اس کے بعد شوہر سے ان کی جذباتی تعلق ختم ہو گیا کیوں ختم ہو گیا؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی صرف ساس کو مجرم قرار دیا کہ انہوں نے رفیق حیات کے دل کو ان کی طرف سے پھیر دیا۔ مگر نہیں، بات کچھ اور ہے۔ س۔ م اور شوہر کے درمیان کوئی بڑھیا حائل نہیں ہوئی (یعنی خوشدامن) بلکہ خود ان کی ذات حائل ہو گئی میں س۔ م کے غم محرومی اور کرب

نامرادی کو پوری طرح محسوس کرتا ہوں، انہیں ملزم نہیں ٹھہراتا۔ لیکن حقیقت سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنا نہ سکیں اور خود پسندی کی بدولت اپنے کو ہار بیٹھیں۔

اداشناس

اگر ازدواجی زندگی کے ابتدائی پندرہ بیس مہینے پیار اور محبت کے ساتھ گزر سکتے تھے تو باقی چودہ سال کیوں نہ گزر سکے۔ اس لئے نہ گزر سکے کہ س۔ م پھر اپنے خول میں سمٹ گئیں پھر اپنے عالم خیال میں کھو گئیں وہ ایک رومانی شہزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں۔ جس کی ہر لمحہ پوجا کی جائے جیسے دیوی لیکن دیوی نہیں ہوتی بیوی ہوتی ہے کیا س۔ م نے بیوی کا کردار حقیقی معنوں میں ادا کیا؟ دروں میں بنی کی بناء پر وہ بہت جلد کھیلو زندگی کو حسن نور رنگ اور خوشبو سے بھر دے گا۔ کم و بیش دس سال انہوں نے اس انتظار میں گنوا دیئے۔ کاش وہ نامعلوم مستقبل سے لو لگانے کی بجائے معلوم حال اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتیں۔ شوہر کو جیت لینا، قطعاً دشوار نہ تھا۔ کیونکہ اس لڑکی میں حقیقت پسندی کی صلاحیت اور ماحول سے مطابقت پیدا کر لینے کی استعداد موجود ہوتی، یہ استعداد پہلے تھی نہ اب ہے۔

پرچھائیوں کا پیچھا

ممکن ہے کہ س۔ م میری اس صاف گوئی پر برا مان جائیں اور انہیں افسوس ہو کہ ایک غلط شخص کو انہوں نے اپنا مشیر چنا۔ مگر بی بی! میں تمہارا بدخواہ نہیں خیر خواہ ہوں۔ تم نے ٹھوکر کھائی اپنی نادانی کی بناء پر تمہارا شوہر ایک زندہ وجود کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ اجنبی کی حیثیت سائے سے زیادہ نہ تھی۔ تم نے ٹھوس جسم (شوہر) کی بجائے پرچھائیں (اجنبی محبوب) کا پیچھا کیا اور سر کے بل گر پڑیں۔ س۔ م اب تم سایوں کا تعاقب کرنا چھوڑ دو اور حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ حقیقت یہ ہے (1) تم اپنے شوہر کی

دوسری بیوی ہو (2) پہلی بیوی سے بھی دو بچے ہیں اور تم خود بھی ایک چاند سے بیٹے کی ماں ہو۔ (3) شوہر سے تمہارے تعلقات خراب چلے آ رہے ہیں۔ (4) تم اس دوران میں زوجہ کے ساتھ داشتہ بن چکی ہو۔ یہ ہیں تمہاری زندگی کی اصلی چائیاں کو دل و جان سے قبول کر لو اور پھر طے کرو کہ تمہیں اپنے شوہر کے گھر میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے اس مضمون کو ایک بار نہیں بار بار پڑھو۔

میں ایک مسئلہ ہوں

رئیس صاحب! میں کسی الجھن میں مبتلا ہوں۔ بلکہ خود دوسروں کے لئے الجھن بن گیا ہوں۔ شاید آپ چونکیں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، ہاں رئیس صاحب! میں ”ایک مسئلہ“ ہوں۔ بچانوںے فیصدی خاندانوں کے لئے یقین کیجئے کہ وہ ناسور ہوں جو معاشرے کے قلب کو زہر آلود کر رہا ہے اور اگر ”ناسور“ سے ”نا“ کو نکال دیں۔ تو وہ وجود ہوں جسے حرام قرار دیا گیا۔ میں وہ چہرہ ہوں جس کی مسکراہٹ کے پیچھے ہزاروں فتنے چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں رئیس صاحب! آپ حیران تو ضرور ہوں گے کہ میں اپنے کو گالیاں دے رہا ہوں لیکن نہیں۔ ذرا ٹھہریے، میں اپنے کو نہیں اس خول کو گالیاں دے رہا ہوں جو میں نے اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے۔ میں نے اب تک آپ کا رسالہ (عالمی) نہیں پڑھا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کا پتا کیا ہے؟ آپ کا پتہ کس طرح ملا؟ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک لڑکی میرے پاس آئی اور اپنی خاندانی شرافت کے ساتھ عالمی بھی چھوڑ کر چلی گئی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ لڑکی کے بجائے ایک ایسی عورت بن چکی ہے جسے کسی وقت بھی ”میسٹرنی وارڈ“ (زچہ خانے) کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ جناب! میں اپنا تعارف تو کرادوں! ویسے تو میرے کئی نام ہیں کیونکہ میں نے ہر لڑکی کو اپنا مختلف نام بتایا ہے۔ لیکن ہر کردار کا کام وہی رہا جو فیصل سے عامر کا تھا آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ رئیس صاحب! میں تیس سال کا خوش حال اور خوش لباس لڑکا ہوں۔ جس کا اصلی نام ”ز“ ہے۔ اس نام سے میری کوئی شناسا لڑکی واقف نہیں۔ میں اپنے سے نہیں،

اپنے مختلف رویوں اور رنگوں سے اکتا گیا ہوں۔ میں اپنے خاندان کا تعارف ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ جو کچھ کیا ہے میں نے خود کیا ہے، اس سلسلہ میں خاندان کا ذکر فضول ہے۔ ہاں آپ کو میرا نام تو معلوم ہو ہی گیا ہے۔ میں ہائر سینئر کیمرج کرچکا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں، انشاء اللہ اپریل میں وہیں ہوں گا۔ مجھے شوق نہیں کہ میری داستان آپ کے رسالے میں چھپے۔ البتہ میں اپنی بھولی بھالی بہنوں کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہ خدا کے لئے وہ آج کل کے لڑکوں کے چکر میں نہ آئیں ان میں اکثر فراڈ ہوتے ہیں۔ ان کی میٹھی میٹھی باتیں زہر آلود ہوتی ہیں۔ رئیس صاحب! میں 1968ء سے 1973ء تک ایسے فریب آمیز ڈرامے کھیلتا رہا ہوں کہ اگر کرۂ ارض پر صنف نازک کی حکومت قائم ہو جائے تو میرے جرائم کی شایان شان سزا مجوز کرنے سے قاصر رہے۔ بغرض محال لڑکیوں کی حکومت اگر یہ سزا دے کہ اس شخص کے جسم سے ایک ایک رواں اکھاڑا جائے، تب بھی مجھے مناسب سزا نہیں مل سکتی۔ میں نے ان پانچ سال میں 57 لڑکیوں کو تباہ کیا ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر آپ کو یقین آنا چاہیے اور ضرور آنا چاہیے۔

57 لڑکیاں

اس وقت میری میز میں ہر لڑکی کے خطوط کے ساتھ اس کی تصویر بھی خفیہ ہے۔ میں نے فتوحات کس طرح حاصل کیں اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ شاید میرے اندر کوئی ایسی کشش ضرور موجود ہے جو صنف نازک کو متاثر کر دیتی ہے۔ پھر ری سہی کسر میری گفتگو کے آرٹ سے پوری ہو جاتی ہے۔ مجھ میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہے۔ میں P.A.F کی اکیڈمی کے لئے منتخب (سلیکٹ) بھی ہو گیا تھا۔ مگر میرے ماں باپ نے نئی گاڑی خرید کر میری اس خواہش کو خرید لیا اور اپنے پیار کے واسطے دے کر مجھے باز رکھا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی لڑکی صرف آدھے گھنٹے میرے پاس بیٹھ جائے۔ تو وہ آئندہ ملاقات کی تاریخ مقرر کئے بغیر رخصت نہیں ہوگی۔

لڑکیوں کو بیوقوف بنانا بہادری نہیں، بے چاریاں جس قدر چالاک بنتی ہیں اتنی ہی جلدی مار کھا جاتی ہیں۔ میں ہمیشہ ان کی نفسیات کے مطابق گفتگو کرتا رہا ہوں اور اس میں سو فیصد کامیابی ہوتی ہے۔ مجھے آج تک کسی خاندان کی عزت پر دست درازی کرتے ہوئے افسوس نہیں ہوا بلکہ میں ہر فتح پر جشن مناتا تھا اور کہتا تھا کہ ”ر“ آج تیری فہرست میں ایک اور اضافہ ہوا۔ اور پھر فضا ایک بھیا تک قہقہے سے گونج جایا کرتی تھی۔

تبدیلی قلب

لیکن یکا یک ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے اندر فکر کو بدل دیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس حد تک ”غلیظ“ ہو چکا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے ایک لڑکی (شائلہ نامی) سے اپنا تعارف راحیل کہہ کر کرایا۔ اور اسے اپنے کرائے کے فلیٹ میں آنے کی دعوت دی۔ (یہ فلیٹ میری عشرت گاہ تھا) دعوت قبول کر لی گئی۔ اس لڑکی نے خود ہی فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور پھر مدارج یکے بعد دیگرے طے ہونے لگے۔ جب میں نے حد سے تجاوز کرنا چاہا۔ تو اس نے ایک ایسی بات کہی جو میں نے کبھی نہ سنی تھی۔ اس کے فکروں میں غصہ بھی تھا، التجا بھی تھی۔ اس نے کہا کہ:

”راحیل! کبھی تمہاری بہن بھی کسی کے بچے میں پھنس سکتی ہے۔ اگر تم اسے اس حالت میں دیکھو گے تو کیا کرو گے؟ یاد رکھو کہ تمہاری بھی بہنیں ہیں اور میرے بھی بھائی ہیں۔“

رئیس صاحب! یہ الفاظ مجھ پر نیپام بم کی طرح پھٹے اور میرا پورا وجود لرز گیا۔ میں نے فوراً اسے آزاد کر دیا اور حکم دیا کہ بھاگ جاؤ۔ اُس کے جانے کے بعد مجھے ایسا سکون ملا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں کبھی سکون کی کیفیت سے آشنا نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ ”توبہ“ وقتی تھی ایک بار پھر شیطان انسان پر غالب آ گیا۔ اور چند ہی دن میں ایک اور بیچاری میرے ہتھے چڑھ گئی وہی شائلہ۔ جو آپ کا رسالہ عالمی میرے پاس چھوڑ گئی تھی اس رسالہ میں آپ کا مضمون نفسیاتی الجھنیں، نظر سے گزرا اور اس لڑکی کے الفاظ میرے دماغ میں

گوںجے گئے۔ جس نے کہا تھا کہ راحیل.....

اب میں اس صیدا فگنی سے توبہ کر لی ہے اور اسی کے ساتھ سگریٹ نوشی سے بھی تائب ہو گیا ہوں۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ نماز شروع کر دی۔ کیونکہ یہ سب سے بڑی نمازی ”پاکبازی“ ہے آپ رئیس صاحب میرے لئے دعا کریں اور میری بہنوں سے کہہ دیں کہ وہ لڑکوں سے میل جول نہ بڑھائیں، قدم قدم پر اپنی حفاظت کریں۔ اس ہرنی کی طرح چونکا رہیں جو بھیڑیوں کے جنگل سے گزر رہی ہو۔ اس کے بعد کئی لڑکیوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی میں نے سب کو جھڑک دیا۔ کل میں نے فیصلہ کیا کہ سب کی تصویروں اور خطوط کو جلا دوں گا، میں اس دفتر شیطانی کو نذر آتش کر دوں گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ”ر“ خود ہی ”ر“ کا سیما ہے۔ آپ بہنوں سے اپیل کریں، ان سے کہہ دیں کہ انہیں مجاہد پیدا کرنے ہیں ”ر“ جیسے نوجوان کو جہنم نہیں دینا..... اپنی کوکھ کو ناپاک مت کرو۔

داستان عبرت پر راحیل فرما..... آمین

آپ نے لاہور سے ”ر“ کا خط پڑھ لیا۔ اب مجھے کہنے اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ داستان عبرت لڑکیوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ”ر“ کے خط کو میری بچیاں بار بار پڑھیں گی۔ اور آج ہی ان تعلقات پر نظر ثانی کریں گی۔ جو انہوں نے لڑکوں سے قائم کر رکھے ہیں میرے سامنے اتنے خطوط پڑے ہیں کہ ہر خط کے مضمون پر مفصل بحث کرنا مشکل ہے۔ شیم انور لکھتی ہیں کہ ان کی بچی ”سعدیہ“ پر جس کی عمر تین سال ہے۔ عجیب و غریب دورے پڑتے ہیں، جب وہ چھ ماہ کی تھی تو میں نے زیتون کے تیل کی مالش کر کے دھوپ میں لٹا دیا۔ بچی کھیلتے کھیلتے رونے اور عجیب قسم کی آوازیں نکالنے لگی۔ پھر یہ عالم ہوا کہ ہاتھ پاؤں اوپر کر لیتی! اور چاروں طرف دیکھ کر ڈرتی گھبراتی ہر دس منٹ کے بعد اس قسم کا دورہ پڑتا۔ تعویذ بھی کرائے ڈاکٹری علاج بھی کرایا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، مشورہ دیجئے کیا کروں؟

بی بی! میرا مشورہ یہ ہے کہ بچی کا طبی علاج جاری رکھو اور اگر کسی "اثر" یا "آسیب" کا اندیشہ ہو تو سورہ جن ایک مرتبہ نیم گرم پانی کے گلاس پر دم کر کے بچی کو پلا دو۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

امید کی شمع

زیب آفرین۔ محرومیوں اور ناکامیوں کا پیکر بن کر رہ گئی ہیں۔ تاہم "یہ ماننے کو کسی طرح تیار نہیں کہ آنے والے لمحات میرے ناکامیوں اور محرومیوں کے پیامبر ثابت ہوں گے۔ میری پیدائش کے بعد والدہ بیمار پڑ گئیں۔ تو ادھام پرست لوگوں نے کہا کہ یہ لڑکی منحوس ہے۔ لیکن میں نحوست زدہ نہیں ہوں۔ نہیں۔ میں ہرگز منحوس نہیں۔ میرے اندر ایک ایسی اندرونی طاقت موجود ہے، جو مجھ سے کہتی ہے۔ کہ زیب! تیرا مستقبل شاندار ہے..... تاناک ہے..... کیا میں خود فریبی میں مبتلا ہوں۔

نہیں زیب تم خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو، کوئی شخص پیدائشی طور پر منحوس نہیں ہوا کرتا۔ زیب آفرین؟ تم ہرگز منحوس نہیں ہو۔ تم اپنی روح میں "امید کی شمع" کو روشن رکھو۔ شب میں سوتے وقت جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر حسب ذیل تربیتی فقرہ دہرایا کرو۔ (41) مرتبہ۔

"میں اپنی تمام محرومیوں اور ناکامیوں پر غالب آتی چلی جا رہی ہوں۔"

(سلسلہ نفسیات و مابعدالنفیات کی آئندہ کتب کے بعد دیگرے شائع ہوتی رہیں گی)

☆☆☆

بے نام بیٹی کے نام

میری ایک بے نام بیٹی (خط مورخہ 19، نومبر 1973ء) لکھتی ہیں کہ میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ بہت دن سے سوچ رہی تھی، کہ آپ سے مشورہ لوں، مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں؟ میں سوچ رہی تھی کہ اپنی پریشانیوں کے بارے میں آپ سے مشورہ لوں، لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہر کیف، آج حاضر خدمت ہوں۔ میری عمر 24 سال ہے اب تک غیر شادی شدہ ہوں۔ کوئی موزوں رشتہ نہیں آیا۔ ہم لوگ باعزت کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں، میری حالت صرف خدا جانتا ہے۔ کیا بتاؤں کس طرح رات دن گزرتے ہیں۔ مستقبل کی فکر ہے، میں نے قرآن پاک سے فال نکلائی تھی۔ جس سے پتا چلا کہ کسی نے (عمل کے ذریعے) تعلیم اور شادی میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے، یہ معلوم کر کے اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ آپ سے درخواست ہے کہ کوئی عمل کر دیں یا دعا بتا دیں کہ یہ رکاوٹ دور ہو جائے۔ عمر بھر احسان مند رہوں گی۔ صحت کی کیفیت یہ ہے کہ جسم ہر وقت جلتا رہتا ہے، سینے میں درد ہوتا ہے۔ چہرہ اور آنکھیں اس قدر سرخ ہو جاتی ہیں کہ بیان نہیں کر سکتی۔ کسی سے بولنے چاہنے کو جی نہیں چاہتا حد درجہ تنہائی پسند ہو گئی ہوں۔ ہاں! مجھے جیون ساتھی کی تلاش ہے، میں ایک ایسے رفیق کو ڈھونڈتی ہوں۔ جو روح اور جسم دونوں کی تشفی کر سکے۔ آپ کہیں گے کہ یہ لڑکی بہت بے شرم ہے۔ لیکن رئیس صاحب! اگر آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ مجھے آپ کے سامنے بے شرم ہوتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ البتہ دنیا سے شرماتی ہوں۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، کلیجہ پھٹ جائے گا۔ گھر والوں کے ذر سے رو بھی نہیں

سکتی، آپ یقین جانے کہ آج تک میں نے اپنے پاپا اور بھائی کی عزت کو ملحوظ رکھا۔ آج تک کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو خاندانی وقار اور عزت نفس کے خلاف ہو، کوئی ایسا عمل تجویز کیجئے۔ رئیس صاحب کہ میری جلد از جلد شادی ہو جائے۔ کوئی خوبصورت اور صحت مند نوجوان بیوی کی حیثیت سے مجھے اپنالے۔ کسی نے کالے علم کے ذریعہ مجھے تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس عذاب تنہائی سے نجات دلائیے، اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو بھسم کر لوں گی۔ اسپرٹ گھر میں موجود ہے، آگ میں خود ہوں۔ میں ظاہری آگ سے نہیں ڈرتی کیونکہ اندر کی آگ سے جل رہی ہوں۔ (آپ کی بے نام بیٹی)

تم آگ ہو

تم نے لکھا ہے گھر میں اسپرٹ موجود ہے ”آگ میں خود ہوں“ بی بی ان فقروں سے تمہارے ہیجان کا اندازہ ہوتا ہے، تم نے لکھا ہے کہ کسی نے ”کالے علم“ کے ذریعہ تمہاری تعلیم اور شادی میں رکاوٹ ڈال دی ہے۔ بیشک جب مشکلات کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو پچھلے دہائی کے ذہن پریشانی والی دشواریوں اور پے در پے ناکامیوں کا کوئی غیر مرئی اور مخفی سبب تلاش کر لیتا ہے۔ مثلاً پیدائشی نحوست، عذاب الہی، ستاروں کی گردش، کالے علم کے تباہ کن اثرات، جادو، تعویذ، گنڈے وغیرہ! کالے علم کی اصلیت کیا ہے؟ میں اس سے بخوبی واقف ہوں، لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں کہ زندگی میں ہر ناکامی کا سبب کوئی مخفی قوت ہوتی ہے۔ جی بہلانے اور تسکین نفس حاصل کرنے کی حد تک یہ تصور قرین قیاس ہے۔ کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے لیکن عقل سلیم ان وجوہ کو کبھی تسلیم نہیں کرتی بہر حال یہ ایک اور موضوع بحث ہے۔ اب میں بی بی تمہارے مسئلے کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ جہاں تک (بقول تمہارے) جادو وغیرہ کا تعلق ہے تو اس کا توڑ بتادوں گا لیکن تمہارے مسئلے کا یہ حل نہیں ہے سب سے پہلے سوچنا ہے کہ تعلیم میں رکاوٹ کیوں پڑی۔ تم نے تعلیم میں رکاوٹ پڑنے کے اسباب بیان نہیں کئے یہ کیا ضروری ہے

کہ ”کالا علم“ تمہاری تعلیم کے راستے میں حائل ہو گیا ہو اور بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں، بیشتر طلباء و طالبات ایسے ہیں۔ جنہیں عملی مشکلات حصول تعلیم سے باز رکھتی ہیں۔ ممکن ہے (ممکن کیا یقینی) کوئی اسی قسم کی دشواری تمہاری راہ میں حائل ہو گئی ہو۔ اب رہی بات کہ اب تک کوئی موزوں پیام کیوں نہیں آیا۔ یہ اس عہد کی المناک سماجی حقیقت ہے۔ ہزاروں خاندان اسی دشواری سے دوچار ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں اور مناسب ”بزد“ نہیں ملتے۔ تم نے اپنی تمام ناکامیوں کا سبب کالے علم (سفلی عمل یا جادو) کو ٹھہرا دیا ہے۔ مجھے اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے۔ اب بھی میری رائے یہ ہے کہ تعلیم اور شادی میں جو رکاوٹ پڑ رہی ہے۔ اس کے اسباب باطنی نہیں ظاہری ہیں خیالی نہیں حقیقی ہیں۔ ان محرومیوں کا سبب کالا علم نہیں بلکہ ناقص عمل ہے۔ بی بی! تمہیں حقیقت پسند ہو کر اپنی دشواریوں کا جائزہ لینا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں تمہیں ہر ممکن مشورہ دینے کو تیار ہوں۔ اب میں ”ہیجان جذبات“ کی طرف آتا ہوں۔ تم تقاضائے نفس کی آگ میں جل رہی ہو۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کوئی صحیح الدماغ شخص اس بیان پر تمہیں ملامت نہیں کر سکتا لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ میں اپنے کپڑوں پر تیل ڈال کر آگ میں بھسم ہو جاؤں گی، بالکل فطری طور پر تمہارے نفس میں سپردگی کی آگ بجھ کر رہی ہے۔ تمہاری جسمانی جلن، سینے کے درد اور تنہائی پسندی کی وجہ یہی ہے۔ اس کا علاج شادی ہے صرف ایک سرگرم رفیق جسم و جاں ہی تمہیں اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے مگر وہ جیون ساتھی کہاں سے آئے؟

زینہ مقفل ہو گیا

الف۔ س لکھتے ہیں کہ میں پری میڈیکل کے سال اول کا اٹھارہ سالہ طالب علم ہوں ایک زبردست ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو کر ناکارہ ہو گیا ہوں، قبل اس کے وہ میرے ذہن پر پوری طرح سوار ہوتی میں نے آپ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ اس سے کس طرح چھٹکارہ حاصل کروں۔ لیکن اب معاملہ چھٹکارہ پانے کی حدود سے تجاوز کر گیا

ہے اب وہ مکمل طور پر میرے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب وہ میری جان بن گئی ہے، اگر میں اسے ایک دن بھی نہ دیکھوں تو قیامت آجاتی ہے۔ دل بیٹھ جاتا ہے عجیب بے قراری کا عالم ہوتا ہے۔ اب اس کا ایک تحریری پیام مجھے ملا ہے کہ اس کی آپنی (بڑی بہن) اس راز سے واقف ہو گئی ہیں اور اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اب اسے لب بام آنے کی اجازت نہیں کیونکہ زینے کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ رئیس صاحب! ہائے میں تو لٹ گیا بتائیے میں کیا کروں؟ ابھی تو مجھے ڈاکٹر بنا ہے اگر ابھی سے اس عذاب میں مبتلا ہو گیا تو مستقبل تباہ ہو جائے گا، بتائیے میں کیا کروں؟

برخوردار! تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہے! اس عمر میں تم سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ تم عشق سے محفوظ رہ کر زندگی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کر سکو گے۔ عشق تو ایک ناگزیر بیماری ہے، جس کا حملہ عمر کے ہر حصہ میں ہو سکتا ہے، تم اٹھارہ سال کی عمر میں پھنس گئے۔

میں اٹھاون سال کی عمر میں ”اسیر دام محبت“ ہو سکتا ہوں۔ اور پھر میری بھی وہی کیفیت ہوگی جو تمہاری ہے۔ میں بھی اسی طرح تڑپوں گا۔ جس طرح تم تڑپتے ہو، میں بھی اسی طرح آنسو بہاؤں گا۔ بہر حال عزیزم! زندگی کے ساتھ جس طرح بیماری اور موت لگی ہوئی ہے اسی طرح ”عشق“ بھی ایک عارضہ ہے، جس میں مبتلا ہوئے بغیر چارہ نہیں۔

آپ کا واحد علاج یہ ہے کہ ڈاکٹر بننے کے بعد لڑکی کو پیام دیں، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے والدین آپ کے رشتہ کو ٹھکرا دیں۔ یاد رکھئے کہ لڑکیوں کے والدین عشق کو پسند نہیں کرتے عقد کو پسند کرتے ہیں۔ شمیم الدین صدیقی بھی اسی قسم کے چکر میں گرفتار ہیں۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ یاسمین پر تین حرف (ل۔ع۔ن) بھیج کر تسکین کی طرف توجہ کریں کہ وہی ان کی تسکین قلب اور تسکین روح کا ذریعہ بن سکتی ہے، آخر بچپن کی محبت ہے۔

لڑکے میں لڑکی

اپنا تعارف کرا دوں۔ میں ”لڑکے میں لڑکی“ ہوں۔ گھر والے مجھے یاسمین کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں اپنے والدین کا ساتواں لڑکا ہوں، والدہ کو بیٹی کی تمنا تھی۔ دعا یہ

تھی کہ چھ بھائیوں کے بعد بہن پیدا ہو، پیدا میں ہوا میں بے حیا! والدہ نے اپنی محرومی کی تلافی اس طرح کی کہ مجھ سے لڑکی کی طرح برتاؤ کر دیا۔ مجھے ”یاسمین“ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا، میرے ناک اور کان چھدوائے گئے۔ لڑکیوں کے کپڑے پہنائے گئے۔ سب گھر والے مجھے لڑکی سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ چھ بھائی بھی اس حقیر کو لڑکی تصور کرتے ہیں۔ امی کی تاکید یہ تھی کہ میں لڑکوں سے دور رہوں، مجھ پر لونڈوں کا سایہ نہ پڑ جائے۔ آنکھ کھولنے سے اب تک میں لڑکی ہی بنا ہوا ہوں، میری بہت سہیلیاں ہیں۔ میں انہی سے کھیلا کرتا ہوں اسی طرح بارہ سال کی لمبی مدت گزر گئی۔ میرے بھائیوں کی شادی ہو گئی، دو بھائی الگ ہو گئے البتہ ایک بھائی گھر ہی میں رہ گئیں۔ وہ مجھے لڑکی ہی سمجھتی ہیں۔ میرا شمار کلاس کی حسین و ذہین لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں لڑکی نہیں ہوں لڑکا ہوں۔ بتا نہیں سکتا اس انکشاف سے مجھ پر کیسا قہر ٹوٹ پڑا۔ اس صورت میں کہ میں نے کبھی سوئی لباس نہ پہنا ہوں۔ لڑکوں کی کوئی روش نہ اپنائی ہو، لڑکیوں جیسی شرم و حیا ہو۔ یہ انکشاف کہ میں ”مردو“ ہوں، کیسا تباہ کن انکشاف ہوگا۔ میں نے امی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے پیار سے جھڑک دیا اور کہا کہ: ”نہیں تم لڑکے نہیں لڑکی ہو!“

(جب کہ میں لباس اور طرز زندگی سے قطع نظر ہر اعتبار سے لڑکا ہوں) جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے جھڑک دیا اور کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں آپریشن کرا کے لڑکی بنوا دیں گے۔ فطری طور پر لڑکیوں میں بڑی کشش محسوس کرتا ہوں، لڑکوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ حلیہ ملاحظہ ہو، ہاتھوں میں درجنوں چوڑیاں، شانوں تک خوبصورت بال جن میں نہایت قرینہ سے ریشمی اسکارف بندھا ہوا ہے۔ جسم پر ریشمی جہیز اور شلوار، کبھی ریشمی غرارہ اور سوٹ، کبھی بیل باٹم! اس صورت میں کس طرح میں لڑکی سے جوانی کشش کی توقع کر سکتا ہوں۔ لڑکے میرے پیچھے لگے رہتے ہیں، گرلز اسکول کی طالبہ ہوں۔ دسویں جماعت میں پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں میری عمر 16 سال کی ہے۔ میں اب پوری

طرح سمجھ گیا ہوں کہ لڑکے اور لڑکی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کچھ دن پہلے میری آواز میں ”مردانہ گونج“ پیدا ہونے لگی تھی۔ مگر نہ جانے امی نے کیا چیز کھلا دی کہ آواز میں وہی نسوانیت، شیرینی اور رس پیدا ہو گیا۔ امی کے کہنے پر میں سینے پر ابھار پیدا کرنے کے لئے جسم پر جہر کے نیچے بریزر باندھتا ہوں۔ لوگوں کو میرا سینہ لڑکیوں کی طرح نظر آتا ہے۔ میں کس جنس سے تعلق رکھتا ہوں (لڑکا یا لڑکی) یہ راز میں جانتا ہوں۔ یا گھر والے! اب میں مصنوعی خول اتار کر اپنی اصل شکل میں آنا چاہتا ہوں، والدہ مزاحمت کرتی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ اگلے مہینے میرا تبدیلی جنس کا آپریشن ہونے والا ہے سوچتا ہوں۔ کیا میں اتنی بڑی ذہنی تبدیلی برداشت کر سکوں گا؟ پلیز! قبل اس کے کہ میری قسمت پر مہر لگ جائے۔ میری رہنمائی فرمائیں۔ (یاسمین)

عجیب عجیب واقعات سے سابقہ پڑتا ہے، یاسمین کا مسئلہ عجیب و غریب ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ والدین (خصوصاً ماں) بعض اوقات شفقت مادری کے تحت لڑکے یا لڑکی کے کردار کو کس طرح مسخ کر دیتے ہیں؟ یاسمین نہیں تم لڑکی نہیں ہو۔ تمہیں قدرت نے لڑکا بنایا ہے اور تمہیں لڑکا ہی رہنا چاہئے۔ اگر تم جنسی تبدیلی کا آپریشن کرایا تو نہ لڑکے رہو گے نہ لڑکی بن سکو گے، محنت بنے رہو گے۔ (محنت وہ جس ہوتی ہے کہ نہ لڑکا ہوتی ہے نہ لڑکی) اپنی ماں سے صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میں آپریشن نہیں کراؤں گا۔ میں لڑکی بننا نہیں چاہتا۔ میں ہرگز رائے نہ دوں گا کہ والدہ ماجدہ کی مامتا پر اپنے آپ کو قربان کر دو! ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ بیٹے! میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں، ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ لڑکا لڑکی بن جائے، لا حول ولاقوۃ۔

جی کی بھڑاس

السلام علیکم! اس سے قبل بھی کئی خط روانہ کئے اور آپ کے جواب کا منتظر رہا۔ ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ رئیس صاحب! خدا کے واسطے مجھ پر رحم کیجئے۔ فرمائیے کہ میرا مرض قابل علاج ہے یا نہیں؟ میں ذہنی طور پر پاگل ہوتا جا رہا ہوں۔ صحت گرتی چلی

جاری ہے کسی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ کیفیت یہ ہے کہ جذبات انگیز اشتہار دیکھتے ہی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور اپنے کو تباہ کر کے جی کی بھڑاس نکال لیتا ہوں یہ جان جذبات کے ساتھ لیس دار مادہ بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ گھر والے شادی پر زور دے رہے ہیں۔ مگر کیسے سمجھاؤں کہ میں ازدواجی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں۔ (م۔ن۔ز)

برادر م! 90 فیصدی جنسی کمزوری صرف خیالی وہی اور نفسیاتی ہوا کرتی ہے۔ تم جس عادت میں مبتلا ہو، یہ عادت بے شمار لوگوں میں مشترک ہوتی ہے۔ عادت کا نوا تر یقیناً ایک خاص قسم کی کمزوری پیدا کر دیتا ہے لیکن انسان اس طرح ناکارہ و نامراد نہیں ہو جاتا۔ جنسی مریضوں کا (میری رائے یہ ہے کہ) نفسیاتی علاج ضرور کرانا چاہئے۔ البتہ بعض دوائیں بحالی قوت کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں مثلاً لیوب کبیر (طبی دوا) اور دوا لہسک وغیرہ، بعض انجکشن بھی مفید ہوتے ہیں۔ تاہم بنیادی طور پر یہ ذہنی مرض ہے اور اس احساس کمتری، کمزوری پر غالب آنے کے لئے نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کی مشقیں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں۔

کیا کیا جائے

ت۔خ (ملتان) رقم طراز ہیں کہ:

جب میری شادی ہوئی تو عمر پندرہ سال کی تھی اور خاوند کی دو گنی! بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی دو بیویاں ہیں۔ ایک بیوی کو علیحدہ کر دیا ہے، دوسری برقرار ہے اور میرا نمبر تیسرا ہے یہ سن کر میں بہت روئی۔ مگر کیا کر سکتی تھی؟ پھر میں ایک بچے کی ماں بن گئی اور ماں بننے کے بعد شوہر کی پابند! میرا باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ شوہر سے الگ ہو کر کس پر بوجھ بنتی؟ سوکن سے لام بندی الگ! میں اپنے بچوں کی خاطر ہر ظلم سہتی رہی۔ آخر برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ رئیس صاحب کیا کیا جائے۔ (ایک مظلوم عورت) کیا کیا جائے؟ اس سوال کا کیا جواب دوں؟ بعض مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں کہ

نہا ہے بنا چارہ نہیں، تم تیسری بیوی ہو یا دوسری بیوی۔

بہر حال اسے مظلوم عورت! اب تم اپنی بد قسمتی سے معاہدہ کرلو۔ میں یہ لفظ لکھ رہا ہوں کہ ”بد قسمتی سے سمجھو کہ لو اور دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں یہ مشورہ کس طرح دوں کہ تم اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلو۔ نہیں بی بی! اب تمہیں اپنے بچوں کے لئے قربانی دینی ہوگی۔ میں دست بہ دعا ہوں کہ خدا تمہارے شوہر کے دل میں رحم اور آنکھوں میں مروت ڈال دے۔ بہر حال تمہیں اور بے غرض اور شفیق مشیر کی ضرورت ہے۔ سو میں مخلص بھی ہوں، بے غرض بھی اور شفیق بھی۔ برابر اپنے حالات سے مطلع کرتی رہو۔ سچ ہے ابتدائے سفر میں ایک غلط قدم مسافر کو ہمیشہ کے لئے بھٹکا دیتا ہے۔

نادرہ سنو

تم نے لکھا ہے کہ میں بہت کم گفتگو کرتی ہوں۔ اپنے میں ڈوبی رہتی ہوں۔ تمام رشتہ داروں کو شکایت ہے کہ میں بہت کم بولتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے کوئی ایسی ترکیب یا وظیفہ بتا دیجئے کہ میں اس جھجک اور احساس کمتری پر غالب آجاؤں، خود اعتمادی پیدا ہو جائے، میں بے جھجک دوسروں سے گفتگو کر سکوں۔ ایک سے میرا روحانی رشتہ ہے وہ چار سال سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہیں بھی کم خط لکھتی ہوں، وہی شرم اور حیا آڑے آجاتی ہے آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر مشورہ دیں کہ اس احساس کمتری پر کس طرح غالب آؤں۔

بی بی! احساس کمتری کی بہت سی وجوہ ہوتی ہیں۔ ذہن کے اندر دبی ہوئی گہری وجوہ! اس کا علاج تو تحلیل نفسی سے ممکن ہے لیکن تحلیل نفسی کون کرے گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود نوہی شروع کر دو۔ خود نوہی کا طریقہ یہ ہے کہ پنسل اور کاغذ لے کر بیٹھ گئیں، کاغذ پر پنسل چلانا شروع کر دیں۔ ذہن پر زور ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں جو کچھ خود بخود لکھا جائے بس ٹھیک ہے، سوچ سوچ کر لکھنا، خود نوہی کے فوائد کو تباہ کر دیتا ہے۔ تم اندھا دھند کاغذ پر قلم چلانا شروع کر دو، بس جو کچھ خود بخود، خود بخود کی شرط بنیادی ہے۔ لکھا جائے وہی درست ہے، تم روزانہ چند منٹ تک یہ مشق کرو کاغذ پر پنسل چلانا، اور مجھے اس کے نتائج سے مطلع کرو۔

تعریف اس خدا کی

محترم رئیس صاحب! آپ کے مضامین بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج بھی اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو دوسروں کے دکھ درد کو اس طرح بانٹ لیتے ہیں جیسے ان دکھوں میں ان کا بھی حصہ ہے۔ کتنی بار سوچا کہ اپنی داستان غم آپ کو لکھ کر بھیجوں لیکن کچھ لکھتے ہوئے اور مدد طلب کرتے ہوئے ضمیر پر چوٹ لگتی ہے اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ رئیس صاحب! مجھے اس دنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ لا انتہاء روحانی کرب سہتی رہوں۔ میں یو پی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہم کئی بہن بھائی ہیں، والدین اپنے میں مگن رہتے ہیں انہیں اپنی اولاد کے مستقبل کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی بہن نے اپنی پسند سے غلط جگہ شادی کر لی، اس طرح خاندان کی کافی بدنامی ہوئی میں اس وقت نا سمجھ ضرور تھی۔ تاہم بچپن سے حساس اور ذہین واقع ہوئی تھی۔ بہن کی بدنامی نے والدین کی عزت کو بُری طرح مجروح کر دیا اور یکا یک میں پختہ شعور کی مالک ہو گئی جوں جوں میں بالغ ہوتی چلی گئی، یہ بات سمجھ میں آئی چلی گئی کہ بہن نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ لوگ مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرنے لگتے اور سوچتے کہ یہ بھی آگے چل کر بہن کی طرح ہو جائے گی۔ میں نے عہد کیا کہ میں بہن کی گندگی کا ازالہ اپنی پاکیزہ زندگی سے کر دوں گی۔ اس داغ کو دھو ڈالوں گی اور خاندان کی عزت نفس کو از سر نو بحال کر دوں۔ چنانچہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں اور وہ داغ مٹ گیا۔ خاندان والے تو خیر برگشتہ رہے، البتہ باہر والوں کے رشتے آنے شروع ہوئے۔

مگر:

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

امی ہر رشتہ میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے اور یکے بعد دیگرے ہر رشتہ مسترد ہوتا چلا گیا۔ پھر قسمت نے دھوکا دیا تو ہم پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہ سرزمین نئی تھی مگر یہاں بھی رشتوں کی بھرمار ہو گئی البتہ والدہ صاحبہ میری جدائی کو پسند نہ کرتی تھیں۔

پھر ایک ایسا طوفان آیا سب کچھ بہا لے گیا، اچانک میرے والدین کی وفات ہو گئی اور گھر میں دو بھائی اور دو بہنیں رہ گئیں۔ دونوں بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ پہلے مجھے بھگتا دیں۔ (یعنی میری شادی ہو جائے) میری عمر تیس سال کی ہے تعلیم بی اے تک ہے۔ قد پانچ فٹ ہے۔ دو تیز ہوں، رنگ کھلتا ہوا گندمی، عقیدۂ اہل سنت والجماعت، یو پی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ رشتہ دینے والے کی عمر 40، 45 تک ہونی چاہئے۔ رنڈوا ہو یا کنوارا، مضائقہ نہیں، البتہ اولاد نہ ہو۔ عقیدے کے لحاظ سے سنی ہو اس وقت فرضی نام شبانہ ہے۔ کیونکہ میں ایسی رات ہوں جس کی سحر ہی نہیں۔ رئیس صاحب آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ (شبانہ)

شبانہ تمہارا مسئلہ نفسیاتی نہیں ہے ایک معاشرتی اور سماجی مسئلہ ہے جس سے آج بے شمار خاندان دوچار ہیں۔ میں نے ابھی ابھی لکھا تھا کہ بعض والدین (خصوصاً ماں کا لاڈ پیار ان کی اولاد کے لئے مصیبت عظیم بن جاتا ہے۔ شبانہ تم بھی اسی بلا میں گرفتار ہو۔ تمہارے والدین اپنے میں گھن رہتے تھے اور اولاد کے مستقبل کی طرف سے بے پروا نتیجہ یہ کہ تمہاری بڑی بہن گمراہ ہو گئیں۔ (بقول تمہارے) اور تم اب تک شادی سے محروم ہو۔ بہر حال پریشان نہ ہو، میں انشاء اللہ تمہارے لئے موزوں رفیق حیات تلاش کرنے کی کوشش کروں گا، تمہاری شرائط میرے علم میں ہیں۔

بور اور بیزار

میری شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے، مگر میں شادی سے بیزار اور بور ہو گئی ہوں۔ مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی، اس کا اپنا کوئی ذوق نہیں، دنیا کی نظر میں وہ بہت کماؤ ہے۔ میری نظر میں اس کی کوئی نہ حیثیت ہے نہ اہمیت، مجھے اس سے نفرت ہے، شدید نفرت! وہ میرے پاس بیٹھتا ہے تو مجھے گھن آتی ہے۔ اس کی منحوس شکل سے بیزار ہوں، خالص عورتوں والی حرکتیں کرتا ہے۔ بچپن سے میں اپنے کزن کی مانگی ہوئی تھی (یعنی میرا رشتہ میرے کزن سے طے پایا گیا تھا) واقعی میں اس کو چاہتی تھی وہ بھی

بخوبی سمجھتا تھا۔ مجھے نفسیات اور فلسفے سے غیر معمولی دلچسپی ہے، وہ اس کی قدر کرتا تھا۔ والد کا سات سال پہلے انتقال ہو گیا بہت سی محرومیوں سے سابقہ پڑا، مگر میں نے سب کو نظر انداز کر دیا کہ وہ مل جائے گا تو سب کچھ مل جائے گا۔ مگر وائے قسمت کہ جو چاہا تھا نہ ہوا۔ میرے شوہر بے حد شکی مزاج واقع ہوئے ہیں، حد درجہ کنجوس ہیں۔ جسے ہم نے چاہا تھا، وہ کیوں نہ دیا خدا نے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ اور ہم نے مانگا بھی کیا تھا؟ خیر وہ نہ ملا تو سوچا کہ زندگی گزارنی ہے تو کسی کے ساتھ بھی گزار لیں گے، مگر اب پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایک لمحہ بھی اس گھر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اندھیروں میں بھٹک رہی ہوں خدا را مجھے راہ دکھائیے۔ میں تو بندوں سے محبت کرنے والی تھی، بڑی عبادت گزار تھی۔ پھر میں اپنے شوہر کی تکلیف سے کیوں خوش ہوتی ہوں۔ آپ کا ہی تو شعر ہے۔

پہلے دل خندہ گل سے بھی لرز جاتا تھا

اب کوئی خون بھی روئے تو خوشی ہوتی ہے

سچ سچ اسے پریشان دیکھ کر قلب کو سکون ملتا ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے خدا مجھے بیوہ کر دے اور اب تو خیال آنے لگا ہے کہ اگر قسمت کی ستم ظریفی سے اولاد ہوئی تو میں اس کے دل میں باپ کی طرف سے نفرت بھروں گی کہ وہ مجھے اس شخص سے چھٹکارہ دلا کر کہیں دور لے جائے، خدا کے لئے رئیس صاحب! خاموش نہ ہو جائیں۔ مجھے اس تاریکی میں آپ کی ذات روشنی دکھلا رہی ہے کہیں میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں ورنہ میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی، آپ جو مشورہ دیں گے مجھے قبول ہوگا۔ (بیزار بیوی)

اُف تم اتنی بیزار ہو، مگر بیزاری طبعی ہے۔ شوہر کا تعلق جسمانی نہیں، جذباتی ہونا چاہئے۔ مشینی طور پر دو جسموں کا یکجا ہونا بے معنی سی بات ہے۔ اصل چیز ہے روحوں کا ملاپ اگر روحوں میں ملاپ نہیں ہے تو دو جسم ایک دوسرے سے کتنی ہی بار کیوں نہ ٹکرائیں، بیکار ہے سوال یہ ہے کہ اس مرد کے ساتھ کس طرح نبھایا جائے۔ جس سے تم اس قدر نفرت کرتی ہو کہ جسم نفرت بن کر رہ گئی ہو۔ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے

میں یہ مشورہ کس طرح دوں کہ اگر تم اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہو تو اس سے قطع تعلق کر لیا۔ البتہ شریعت یہ ضرور کہتی ہے شرع کی رو سے اگر کوئی بیوی کسی شوہر سے مطمئن نہیں ہے تو اس سے خلع کر لینا چاہیے۔ تم بڑی عبادت گزار ہو، ایک عبادت گزار عورت کو احکام شریعت پر عمل کرنا چاہیے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ کہنا بھی نہ چاہیے۔

ہوائی قلعے

ایک نوجوان (فرسٹ ایئر گورنمنٹ کالج، شاہی بازار، پشاور) لکھتے ہیں کہ: میں ایک دیہاتی لڑکا ہوں۔ میرا مرض یہ ہے کہ میں ہر وقت ہوائی قلعے بناتا رہتا ہوں۔ جب بھی مطالعہ شروع کرتا ہوں، دماغ نہ جانے کہاں گم ہو جاتا ہے۔ حائضہ میں سخت گڑبڑ واقع ہوگئی ہے۔ آپ نے بہن مس!، اعظم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کاغذ پھسل لے کر بیٹھ جائیں اور بے تکلف قلم چلانا شروع کر دیں۔ جو کچھ خود بخود لکھا جائے لکھتی رہیں۔ میں نے اس مشورہ پر عمل شروع کیا، یقین کیجئے کہ میں جب بھی پھسل اور کاغذ لے کر بیٹھتا ہوں، تو پھر سب کچھ ذہن سے اتر جاتا ہے، دماغ بند ہو جاتا ہے۔ (ش۔ک) ہاں! میں نے مس اعظم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ذہنی الجھنوں پر غالب آنے کے لئے خود نویسی کریں، پھر یہی مشورہ دیتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ جب پھسل اور کاغذ لے کر بیٹھتا ہوں۔ تو سب کچھ ذہن سے اتر جاتا ہے، دماغ بند ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ کاغذ پر صرف لکھیں کھینچتے رہیں۔ صرف لکھیں۔ صرف لکھیں! جس قدر تیزی سے آپ لکھیں کھینچیں گے اتنا ہی سکون قلب حاصل ہوگا۔ اس مشق کے فائدے چند روز میں نہیں چند ہفتے بعد محسوس ہوں گے۔

اے مجبور لڑکی

تمہاری عزت کھوگئی، وقار کھوگیا، تم شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرتی تھیں۔ تم جو اتنی حساس تھیں کہ کسی کو دکھ درد میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اب تم مجسم غم اور سراپا

ورد بن کر رہ گئی ہو۔ کیوں؟ وہی عارضہ عشق۔ آہ

مار ڈالا تماش بینوں کو
زہر کھلوا دیا حسینوں کو

گ۔ الف (دادو) تم میری بیٹی ہو۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، کہ میں تمہاری پوری امداد کروں گا۔ بی بی! لکھو کہ میں تمہاری کیا مدد کروں؟

”اے مظلوم لڑکے (ف۔خ۔گ) آخر میں عشق کے موضوع پر کب تک لکھوں؟ جب لڑکا اور لڑکی بالغ ہونے لگتے ہیں۔ تو ان کے جسم میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ لڑکے کی آواز میں مردانہ پن اور لڑکی کے لہجے میں رسیلی کھنک پیدا ہو جاتی ہے۔ مونچھیں اور داڑھی کے بال لڑکے کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں، اور لڑکی کے ہیکل نازک میں جاذب توجہ تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح نفس میں بھی انقلابی آثار ظاہر ہوتے ہیں، اس انقلاب نفس کا بڑا مظہر ”عشق“ ہے۔ یہ بھی ضروری ہے، خیر یہ دور بھی گزر جائے گا۔ تم سورہ یوسف حفظ کر لو اور اس کا ورد کیا کرو۔ انشاء اللہ زلیخا کو یوسف اور یوسف کو زلیخا مل جائے گی۔ ش۔ن۔ (کراچی) کو بھی میرا مشورہ ہے۔ کسی گمنام دوست نے مراقبہ کی ترکیب دریافت کی ہے۔ ازراہ کرم میری حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ کر لیں۔ توجہات، لے سانس بھی آہستہ اور مراقبہ۔ لالپور کے ایک دوست جنسی احساس کتری میں مبتلا ہیں۔ (ان کے اسم گرامی کے ابتدائی حروف ہیں س۔ح) وہ مجھ سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ لاڑکانے کی مس ناز (جناب چوک) تمہارا غم، میرے ذہن پر طاری ہے لیکن اگر میں انہیں براہ راست خط لکھوں گا تو وہ کیا سمجھیں گے؟ بی بی! مجھے کوئی اور طریقہ بتاؤ۔ بہر حال میں مدد کے لئے آمادہ ہوں۔ آخر تم میری بیٹی ہو۔ ایم۔ اے۔ آر (نوشہرہ پوسٹ آفس) کے خط کا مضمون سمجھ میں نہیں آیا۔ ازراہ کرم دوبارہ لکھیں، کاش میرے تمام قارئین میری تصانیف (لے سانس بھی آہستہ، توجہات، مراقبہ، پناہ نرم، حاضرات اور روح جنات) کا مطالعہ کریں۔ تو انہیں اتنی طویل

خط و کتابت کی ضرورت نہ پڑے۔

روشنی طبع

غیر معمولی ذہانت اور جنون میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے جس ذہن میں ذرا سی چمک ہوتی ہے۔ وہ کبھی کبھی خود اپنی روشنی سے چکا چوند ہو جاتا ہے۔ اگر ذہانت و فطانت کے چشمے کے بہاؤ میں ذرا سی رکاوٹ بھی پیدا ہو جائے تو وہ انسانی شخصیت کو اپنی طوفانی لہروں میں بہا کر لے جاتا ہے۔ ذیل میں جس خط کو بہ تمام و کمال نقل کر رہا ہوں۔ وہ ایک ذہن، خیال اور تصور پرست نوجوان کا خط ہے جو دماغی شفا خانے میں بھی رہ چکا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

”مجھے ناقص و ناکارہ بنانے میں جنس، عشق اور نفسیات کا ہاتھ ہے۔“

اب آپ جمیل صاحب کے خط کو پڑھ کر ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں میری رائے سے متاثر ہوئے بغیر خود اپنی رائے قائم کریں، ممنون ہوں گا۔ اگر آپ کی رائے سے مجھے بھی مطلع فرما سکیں، جمل لکھتے ہیں۔

محبت اور عقیدت کے اظہار کے بعد آپ کو دل و دماغ کی دنیا کی سیر کرنا ہوگی۔ تمہید کے طور پر بتا دوں کہ شروع سے آپ کے نفسیاتی مضامین پڑھتا ہوں اور اس دوران آپ سے کئی بار کھلنے اور مشفقانہ ہدایت لینے کو دل چاہا مگر اپنی تن آسانی کی بدولت کامیاب نہ ہو سکا۔

میں پانچ بہنوں کے بعد چھٹی زینہ اولاد ہوں والدین خصوصاً والد محبت میں بے مثال تھے شروع سے ہی میری ذہنی و جسمانی صحت قابل رشک رہی۔ تیسری جماعت سے خط پڑھ اور لکھ سکتا تھا۔ اخبار بنی کی عادت بھی بچپن ہی میں پڑی۔ ادھر ادھر کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں اکثریت ناولوں کی تھی۔ مطالعہ کتب، موسیقی اور سیر و سیاحت بچپن میں میرے خاص مشاغل رہے ہیں۔ دوسری طرف دیہاتی ماحول میں ہونے کے باوجود کھیل کود، پودوں کے علم اور لوگوں سے میل جول میں نکلا رہا۔ نقل

از بلوغت جنسی اعتبار سے بیدار ہو چکا تھا اور بلوغت کے بعد تو یہ چراغ اتنا بھڑکا کہ جل کر راکھ ہو گیا، مگر یہ راکھ بھی نارمل آدمی سے زیادہ آنچ والی ہے، جنسی ہیجان کی وجہ سے خطرہ پسند ہو گیا ہوں۔ ہر چند کہ بزدل بھی ہوں، سخت لذت پرست اور تنہائی پسند واقع ہوا ہوں کچھ کچھ ادھر ادھر کی باتیں سن کر افلاطونی قسم کے عشق بھی ہوئے یعنی جنسی آمیزش سے پاک محبت قبل از بلوغت بھی اس قسم کی بے لوث چاہت کے تجربے گاہے گاہے رہتے، مگر زندگی پر بہت ہی خاص اثر ڈالنے والا عشق بلوغت شروع ہونے سے کچھ پہلے اور بلوغت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، یہ عشق میں نے کسی حد سے زبردستی کیا تھا۔ اس وقت سے ایک نظریہ پر قائم ہوں کہ ہر انسان میں ایک لطیف احساس کارفرما ہوتا ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ کسی ہستی کو اپنے ذہن کے عرش پر بٹھا کر اس کی پوجا کی جائے یا معصوم عشق کرے، میرے نزدیک، محبت اور عقیدت تقریباً ایک چیز تھی۔ اب میں اپنی محبوبہ کے نقش پا تو چوم سکتا تھا۔ لیکن اس کے پاؤں تک چھونا میرے لئے لطافت میں غلاظت کی آلودگی کا سبب تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے عشق تباہ ہو جاتا ہے، عشق صرف وصل کی تمنا ہے، وصل نہیں ہے۔ ان قیاسات کے سبب میں اس کا دیدار تو چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ شادی کو مذہب عشق میں باطل سمجھتا تھا۔ اس طرح سے پہلے میں نے اسے دیوی اور پھر آخر کار نعوذ باللہ خدا کا درجہ دے رکھا تھا۔

میری یہ بھی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے۔ تو اس کے فراق میں آنسو بہاؤں، الم انگیز گیت سنوں اور سناؤں اور اپنے ناکام عشق کی بدولت ایک کامیاب شاعر اور لکھک بن جاؤں۔ والد صاحب کی تبدیلی ہوئی اور میں اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔ بچپن سے والد صاحب نے بہت پابندیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ ہر سمت نئی راہیں تلاش کرنے کے سبب مذہب سے بھی باغی ہو چلا تھا۔ جب کہ ابھی صرف 13 سال کی عمر تھی۔ معاشی نظریات کے اعتبار سے سوشلسٹ رہا ہوں۔ مذہب میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد آخر کار مسلمان ہو گیا۔ اگرچہ اب بھی کبھی شکک کا دورہ پڑتا ہے اور

سب کچھ بے مصرف نظر آنے لگتا ہے منشیات سے بھی لڑکپن سے والہانہ لگاؤ ہے۔ شراب، چرس، افیون، پتھڑین اور مارفیا وغیرہ! کوئی چودہ سال کی عمر سے اب تک (اب میری عمر تقریباً 25 سال ہے) حالات اور جیب کے موافق استعمال کرتا ہوں۔ یاد نہیں رہا کس نے کہا تھا؟

ٹھنڈی سانسو، دلکش آنکھو
میرا کیا ہے، دنیا دیکھو
جھکتی شاخو، اٹھتی لہرو
جھومو گاؤ، ناچو ٹھہرو
ان آنکھوں میں حسرت کیوں؟
ان ہونٹوں میں رنگت کیوں؟
جاؤ دل کا بوجھ اتارو.....
کھیلو..... ہارو..... دنیا کیا ہے؟

اگر ہماری دنیا میں ایک آدمی بھی روکی ہے، بھوکا ہے، تنگ ہے تو ساری ترقی بیکار ہے اگر ایک نفس بھی دکھی ہے تو ساری خوشی دکھاوا ہے ذرا سی ٹیڑھ سے خط مستقیم نہیں رہتا۔ یہ ساری کائنات ایک وحدت ہے اگر اس میں کہیں جھول ہے، کمی ہے کائنات ادھوری ہے۔

مختصر یہ کہ متضاد نظریات اور بے یقینی کے دور کا پیدا کردہ ایک ناقص انسان ہوں ناقص و ناکارہ بنانے میں زیادہ تر تین عوامل کا ہاتھ ہے۔ جنس، عشق اور منشیات۔ جنس نے مجھے یہ سکھایا کہ زندگی سے مراد "اب" NOW ہے۔ کل کا کسی کو پتا نہیں گزرے وقت کی کوئی حقیقت نہیں، حال کا وقفہ انتہائی قلیل ہے۔ اس سے جتنی لذت اٹھا سکتے ہو، پس و پیش کو بھول کر۔ ممکنہ حد تک آج سے لطف اٹھا سکتے ہو ہرگز کل کا تصور نہ کرو۔

عشق نے فرمایا۔ ایک سچائی ہے۔ "حیات جاودانی" ابداً ابداً روح کو تابندہ رکھو، تمہاری بلا سے بھوک سے مراد جسمانی لذت کے بغیر جیو۔

منشیات نے فیصلہ کیا۔ سراب ہی زندگی ہے، تلاش ہی مطلوب ہے۔ راستہ ہی منزل ہے، جھوٹ ہی سچ ہے، اور سچ ہی جھوٹ ہے۔ غم و الم ہی مسرت ہے، جہل ہی عرفان ہے اور میں خود سوچتا ہوں کہ کیا پستی اور بلندی درحقیقت الگ الگ نہیں ہیں۔ کیا بے غرضی اور خود غرضی فی نفسہ ایک چیز نہیں۔ کیا ہندو برہمن اور مسلمان زاہد کا ایک ذات سے روحانی تعلق نہیں؟ کیا قاتل اور خودکشی کرنے والے دونوں کو زندگی سے پیار نہیں ہوتا؟ کیا عشق اور ہوس کے چشمے ایک ہی سوتے سے نہیں پھوٹتے؟..... نہیں بالکل نہیں۔ نہیں۔ دراصل وحدت الوجود کا قائل ہو کر بھی خیر و شر کے متضاد ہونے کا شدت سے معتقد ہوں۔ ظالم اور مظلوم، گناہگار اور نیکوکار، فرشتے اور شیطان، پاکی اور گندگی میں درحقیقت عام آدمی سے زیادہ امتیاز کرتا ہوں۔ خاص طور پر میں انتہا پسند ہو کر اس سے نیک بننا چاہتا ہوں۔ اور کون ہے جو فرشتے کے مقابلے میں شیطان بننا پسند کرے گا، بجز مجبوری کے!

خیر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انسان، انسان جیسی تک ہے کہ متضاد صفات کا حامل ہو۔ رئیس صاحب! آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں (معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے) آمد برسر مطلب۔ اصغر گونڈوی نے فرمایا تھا۔

راز کی جستجو میں مرتا ہوں

اور میں خود ہوں ایک پراز راز

ان ہی رستوں پر بھٹکتے بھٹکتے میں پاگل بھی ہو گیا ہوں اور ایک ماہ دماغی امراض کے ہسپتال میں زیر علاج رہا، اس کی مختصر سی روداد لکھ کر ختم کرتا ہوں۔

آپ کو آج کل کی پنجابی فلموں میں جنسی براہیختی پیدا کرنے والے ناچ گانوں کا پتا ہی ہوگا۔ ایسی ہی ایک فلم دیکھتے ہی جذبات ابل پڑے۔ غیر فطری طریقے

سے جذباتی جہان رفع کر کے میں رقص دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اچانک غیر ارادی طور پر میں نے قہقہہ لگایا۔

ذہن میں خیال آیا کہ میرے جذبات اس لئے ابھرے کہ قدرت نے مرد کے دل میں جذباتی حلاطم پیدا کرنے کے لئے عورت کے جسم کو گولائیاں ابھار اور خاص قسم کا گداز پن دیا ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ حیات نسل انسانی کا تسلسل قائم رہے اور زندگی نئے سانچوں میں منتقل ہوتی رہے، مجھے یہ دھوکے کا جال نظر آیا۔ ایک انسان کی شکست و ریخت سے نیا انسان پیدا کرنے کے لئے جنسی کشش کے گونا گوں رنگ بھرے گئے ہیں، ایک دم مجھے ان سب باتوں سے نفرت ہو گئی۔ یہ ساری جنسی تشنگی اور سیرابی مجھے بیکار کھیل معلوم ہونے لگی۔ اس سے ہیوستہ ایک خیال پیدا ہوا۔ اور محبت نیچے اترتی ہے کیوں نہ اسے اوپر چڑھا دیا جائے.....

نفسہ خودی کا چڑھا آپ میں نہ رہا

یہیں سے شعوری طور پر میرے جنسی جذبات یکا یک ختم ہو گئے۔

میں وحدت خیال سے مغلوب ہوا چار ماہوں۔

ایک اللہ

جو سب سے بڑا ہے۔

جو سب سے الگ ہے اور سب میں شامل ہے

جو عشق کا پیدا کرنے والا ہے، اس لئے عشق سے بھی آگے ہے۔ جو رحمت

اللہ العالمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس لئے رحمت سے بھی آگے ہے۔

خدا

جو حد سے آگے ہے جو زمان و مکان سے آگے (ماوراء) ہے جو خود سے آگے ہے۔

اللہ ہی اللہ یہی خیال میرے ذہن میں سماتا گیا۔

میں خود کو اس کا اظہار سمجھنے لگا۔

ہر گیت اور غزل میں، ہر تان اور ہر ساز میں، ہر منظر اور ہر نظارے میں مجھے وہی نظر آنے لگا، کبھی میں خود کو اس کا عاشق اور کبھی معشوق سمجھنے لگا۔

میں ننگے پاؤں پھرنے لگا کہ خاک میں عرفان ہے، میں نیند کم کرنے لگا کہ اسے اونگھ نہیں آتی۔ (جب وہ ہر وقت میرے ساتھ ہے تو میں ہر وقت اس کے ساتھ کیوں نہ رہوں اور اس کی قربت کے کیف کو شعوری طور پر محسوس نہ کروں) میں ایک ہی چیز کھانے لگا۔ ایک کیک کا ٹکڑا، ایک کپ چائے، ایک روٹی، حتیٰ کہ ایک نوالہ! میں بے قراری سے پھرنے لگا کہ ہر بار نیا جلوہ دیکھوں، میرا دل ہر چیز سے اکتا گیا۔ سوائے تصورات ذات مطلق کے..... پھر لوگوں نے کہا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے دماغی ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ میں پھر وہ سب کچھ ہوش کو قائم رکھتے ہوئے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم اس سلسلہ میں میری مدد کیجئے۔ (دعاؤں کے ساتھ آپ کا نیاز مند جمیل)

جمیل صاحب! ابھی بچپن کی منزلوں سے ہی گزر رہے تھے کہ ان کے نفس میں جنس کی چنگاری بھڑک اٹھی اور اس طرح "یہ چراغ اس قدر بھڑک اٹھا کہ جل کر راکھ ہو گیا۔ چراغ خود بخود بھڑک اٹھا کہیں سے ہوائے تند و تیز کا جھونکا آیا اور جڑ بہ جنس کی لمعات ہوئی شمع کو مشعل کر گیا، یہ بنیادی نکتہ ہے۔ جمیل صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی آئیے۔ میں اس کی وضاحت کروں۔ بالعموم انسان میں جنسی شعور، عہد بلوغ میں نمودار ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بعض لاشعوری محرکات قبل از وقت سادہ اور معصوم بچے کو جنس سے آشنا کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی صورتیں اور شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ بھی ہے کہ کمسن بچہ خود اپنے گھر میں کسی ایسی صورتحال سے دوچار ہو جائے۔ کہ یکا یک اس کی جنسی جبلت ایک دھماکہ کے ساتھ جاگ اٹھے۔ مثلاً وہ اپنے بزرگوں میں سے کسی کو جنسی اختلاط میں مصروف دیکھ پائے یا ہمسوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اس کے بعض اعضاء میں تحریک پیدا ہو جائے۔ ہر بچے کے ساتھ اس قسم کی کوئی نہ کوئی صورتحال ضرور پیش آتی ہے اور وہ "صورتحال" لاشعور یعنی نفس کے اندر بیٹھ جائے تو قبل از بلوغ (یعنی جنسی غدد

کی بھرپور نشوونما سے قبل) آدمی (عورت بھی) جنسی ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ جمیل صاحب کسی گہرے جذباتی طوفان سے گزر رہے ضرور ہیں، لکھتے ہیں کہ سخت لذت پرست اور انتہا پسند واقع ہوا ہوں۔ یہ لذت پرستی اور انتہا پسندی غیر معمولی حساسیت اور اثر پذیری کا پھل ہے۔ اس نوجوان نے جی بھر کے جنسی جبلت کی تسکین کے سامان فراہم کئے۔ لیکن جب اس طرح بھی سکون نہ مل سکا۔ تو شراب، چرس، افیون، پیٹھدرین اور مافیا کا سہارا لیا۔ جنسی ہیجان (یعنی جسمانی ملاپ کی بے انتہا خواہش) کا علاج عام طور پر یا تو نشہ آور اشیاء کے ذریعے کیا جاتا ہے اور یا اس طرح کہ ہیجان جنس کو شدت عشق کے درجے تک پہنچا دیا جائے، یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے، اور اس جنسی ہیجان و تشویش کو لفظ چند جسمانی حرکات کے ذریعے فرو نہیں کیا جاسکتا۔ خاص خاص نفسیاتی حالات میں بعض اوقات جنسی تقاضا اس قدر شدید اور مسلسل ہو جاتا ہے کہ جسم اس کی تکمیل و بجا آوری سے قاصر رہتا ہے۔ جمیل صاحب پر یہی کیفیت گزری۔ جب جسم اس قسم کے ہنگاموں سے ٹھک گیا۔ اعصاب و عضلات جواب دینے لگے۔ تو جنسی جذبہ اعضائے جسمانی سے ذہن کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور اس نے ”افلاطونی عشق“ کو اپنی تسکین کا ذریعہ بنایا، افلاطونی عشق یہ ہے کہ جنس کو جسم یعنی خوشبو کو پھول کی پتیوں سے الگ کر دیا جائے۔ افلاطونی عشق بے لوث، پاک باز اور پارسا محبت کو کہتے ہیں۔ مکتوب نگار کے الفاظ میں..... ”میں اپنے محبوب کے نقش پا تو چوم سکتا تھا لیکن اس کے پاؤں تک چھونا میرے لئے لطافت میں غلاظت کی آلودگی کا سبب تھا۔“

انہیں جنس نے سکھایا کہ زندگی سے مراد اب اور آج (NOW) ہے کل کا کسی کو پتا نہیں۔ عشق نے تعلیم دی کہ حیات جاودانی صداقت ہے۔ ہمیشہ روح کو تابندہ (جسم کو نظر انداز کر کے) رکھو۔ نفسیات نے فیصلہ کیا کہ زندگی دھوکہ ہے۔ راستہ ہی منزل جھوٹ ہی سچ غم ہی مسرت اور جہل ہی عرفان ہے۔ ان سطور سے اندازہ ہو سکتا ہے رفتہ رفتہ جمیل کے جنسی ہیجانات (جو بچپن میں پوری شدت کے ساتھ بیدار ہو گئے) نے ان

کے ذہن کو کتنے تضادات میں پھنسا دیا۔ جنس کا تقاضا تھا۔ ”لذت امروز“ عشق کا مطالعہ تھا، حیات جاودانی اور نفسیات کا فیصلہ تھا کہ سب کچھ دھوکہ ہے!

انسان جب اس قسم کے تضادات (بیک وقت سپیدہ و سیاہ کے ٹکراؤ) میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ لامحالہ تضاد کی کثرت میں وحدت کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی ایک ضد (سیاہ) کا دوسری ضد (سفید) سے سمجھوتا کر دے۔ جمیل صاحب کے شعور حیات نے انہیں یہی راستہ دکھلایا اور رفتہ رفتہ..... ”وحدت الوجود“ کی منزل پر فائز ہو گئے۔ وحدت الوجود کی منزل میں تضادات یعنی مختلف وجود (یہ اچھائی ہے وہ برائی، یہ دن ہے وہ رات، یہ میں ہوں وہ تو ہے، ختم ہو جاتے ہیں)..... اور صرف ایک وجود باقی رہ جاتا ہے چاند، ستارے صرف اندھیری رات میں نظر آتے ہیں۔ جوں ہی اندھیری رات روز روشن میں تبدیل ہوئی سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ وحدت تک جمیل کا ذہن بڑی چپچیدہ اور دشوار گزار منزلوں کو طے کر کے پہنچا مگر وہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور جیسا کہ مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ انہیں دماغی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ دیکھا آپ نے بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہوئی؟ جنسی ہیجان کی تباہی کی بسم اللہ ہوئی تھی اور جنون پر خاتمہ ہوا۔ جنس کا جذبہ رفتہ رفتہ بے قید ہو کر جنون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو انسانی شخصیت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، کیا ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے خط سے ہوگا، ایک تعلیم یافتہ خاتون لکھتی ہیں کہ:

بہت دن ہوئے میں اپنے ایک عزیز لڑکے کے بارے میں آپ کو لکھا تھا کہ آپ نے جواباً تحریر کیا تھا کہ یہ مانگو لیا کا کیس ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ بیک وقت کئی کئی معاشقے چلتے ہیں۔ انہیں چاہنے اور چاہے جانے کا خط ہے، کبھی کہتے ہیں کہ فلاں لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی ہے۔ ضرور مجھ پر مروتی ہے کچھ دن ادھر توجہ رہتی ہے پھر اکتا جاتے ہیں، تو عالم خیال میں اس کی سزا کی تجویزیں سوچتے ہیں۔ آج کل ایک پرانے معاشقے کو اُجاگر کیا ہے اور (خیالی طور پر) 1972ء میں اس سے شادی کرنے کا منصوبہ

بنایا ہے شادی سے قبل تجویز یہ ہے کہ میں دو قتل کروں گا۔ (نہ جانے خیالی مقتولین بے چارہ کون ہیں) اور جب انتقام لے لوں گا تو بیاہ رچاؤں گا۔

تعویذ گنڈے کے بے حد قائل ہیں اور ہم سے یہ کہتے ہیں کہ عورتیں سفلی علم کے ذریعہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ کوئی ہندو عورت ہے، ”شانتی“ جس کا خوف ہر وقت ذہن پر مسلط رہتا ہے۔ اس عورت کے خوف نے قوت ارادی کو بالکل مآؤف کر دیا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ جس سے ان کا دیرینہ معاشقہ ہے۔ اس کے والدین کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے ان کا رشتہ کرا دوں۔ پھر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس لڑکی کی زندگی برباد نہ ہو جائے۔ لڑکا عجیب و غریب وحشیانہ مزاج کا ہے۔ عورتوں کو اس طرح سگریٹ سے جلانا کہ ان کی چربی نکل آئے، پاگل کو بڑا مزہ ملتا ہے۔ پتھر مار کر لڑکیوں کے سر پھاڑ دینا، اس طرح کا ثنا کہ خون چھلک جائے یہ سب ذہنی سکون حاصل کرنے کے مجنونانہ طریقے ہیں۔ قیمتی کی زندگی بسر کی ہے، لاوارث ہیں کبھی بچوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں کوئی رابطہ و تسلسل نہیں ہوتا۔ اس مانگو لیا زدہ نوجوان مریض کی تحویل میں لڑکیوں کی بہت سی عریاں تصویریں ہیں، کچھ خود کار کیمیرے سے لی گئی ہیں۔

میرے سامنے جنسی ہیجان کے دو کیس ہیں۔ جمیل کا اور اس لڑکے کا، جمیل کا بگڑا ہوا جذبہ انہیں غشیات اور پھر تصوف کی طرف لے گیا اور اب وہ خیال کی اس منزل میں ہیں:

اللہ ایک ہے

جو سب سے بڑا ہے

جو سب سے الگ ہے اور سب میں شامل ہے۔

جو عشق کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے عشق سے بھی آگے ہے۔

جو رحمۃ اللعالمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس لئے رحمت سے بھی آگے ہے۔“

وغیرہ وغیرہ..... وحدت خیال پیدا کرنے کا دوسرا بڑا ذریعہ غشیات کا استعمال ہے شراب یا چرس پی کر شعور کی رفتار کسی قدر سست پڑ جاتی ہے اور شعور کی سست رفتاری سے خیال میں ٹھہراؤ سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ جنسی ہیجان کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں جمیل ہیجان کے زمانے میں غیر طبعی (ان نیچرل) زندگی بسر کرتے تھے اور آج بھی ان کا..... انداز زیست اور طرز فکر قانون فطرت کے خلاف ہے۔ وہ خاک پر ننگے پاؤں چلتے ہیں، کم سوتے ہیں، اتنی قلیل غذا کھاتے ہیں۔ مثلاً! (کیک کا ایک ٹکڑا) کہ جسم و جان کا رشتہ مشکل سے باقی رہ سکے، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ قوانین فطرت کی کھلی خلاف ورزیاں ہیں۔ معشوق حقیقی کی تلاش ننگے پاؤں پھر کر بھوکے رہ کر اور شعور کو زائل کر کے نہیں ہو سکتی۔ جمیل اپنے ہی تصورات کے تانے بانے میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ جب تک وہ اپنے انداز زندگی کو بالکل نہیں تبدیل کریں گے، عام انسانوں کی طرح نہ رہنے سہنے لگیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں ہوش کو قائم رکھتے ہوئے انہیں وہ تجربات کرا دوں۔ جن سے وہ عالم مدہوشی سے دوچار ہوئے تھے۔ کیا جمیل کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ شادی کر لیں اور معقول ازدواجی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک دوسرے نوجوان کا (مانگو لیا زدہ) کا تعلق ہے تو اس کا ذہن بچپن ہی میں ہمیں انک کر رہ گیا ہے۔ وہ آج بھی کبھی کبھی بچوں کی طرح تنہا تنہا اپنے حالات زندگی بیان کرتا ہے۔ بچے میں جنسی جذبہ نیم شعوری حالت میں ہوتا ہے اور توڑ پھوڑ کا جذبہ نمایاں اور ابھرا ہوا۔ اس مانگو لیا کے مریض میں تشدد کا جذبہ کارفرما ہے۔ قتل کرنے کی خواہش، لڑکیوں کے جسم کو اس طرح سگریٹ سے جلانا کہ جسم کی چربی نکل آئے۔ بے دردی سے کا ثنا، پتھر مارنا، یہ سب اس بات کی علامتیں ہیں کہ صحت مند جنسی جذبہ دب گیا اور مجنونانہ جذبہ تشدد ابھر آیا۔ جنس اور جارحیت (تشدد) دونوں جذبے ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ اگر انسان کی مناسب ذہن نشوونما نہ ہو سکے اور مناسب ذہنی نشوونما نہ ہونے کے سبب، اس کا جنسی جذبہ، صحیح روپ میں بروئے کار نہ آ سکے۔ تو وہ قاتل مجرم

اور نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ یہ نوجوان اسی عذاب سے گزر رہا ہے۔ جمیل ہو یا یہ حضرت۔ میں ان دونوں کو تجزیہ ذہن کا مشورہ دوں گا۔ تجزیہ ذہن کہتے ہیں: ذاتی تحلیل نفسی کو..... یعنی اپنی چھان بین خود کی جائے۔ اس کا طریقہ میں نے اپنی کتاب ”نفسیات و مابعدالنفیات“ میں لکھا ہے۔

السلام علیکم!

صاحب! السلام علیکم۔ برابر سوچتا رہا کہ آپ کو اپنی ذہنی الجھن سے آگاہ کروں۔ لیکن کوئی اندرونی طاقت مجھے خط لکھنے سے روکتی رہی۔ آخر اب ہمت کر کے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ قبل اس کے میں آپ کو حقیقی صورتحال سے آگاہ کروں۔ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ اپنے بارے میں لکھوں گا، وہ سو فیصدی صحیح ہوگا۔ شروع میں یہ خادم ایسا نہ تھا، میری فطرت ہمیشہ خیر کی طرف مائل رہی ہے۔ میری تباہی میں آپ کا معاشرے کا سب سے بڑا ہاتھ ہے، میری تباہی کا سبب میرا حسن ہے۔ بچپن سے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی میں ہوسناکوں کا شکار اور ہوسناکیوں کا آلہ کار بن گیا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ: خود عاشق اور خود معشوق۔

بچپن میں خود اپنا عاشق اپنا معشوق تھا۔

عاشق ہوں مگر عاشق معشوق نما ہوں۔

اس کے بعد خط لکھنے والے م۔ج (پشاور) نے ہم جنس پرستی کی ایسی داستانیں بیان کی ہیں جنہیں میں ان صفحات پر نقل نہیں کر سکتا۔ ان کے نفس (ذہن) میں یہ تقاضا بیدار ہو گیا ہے کہ مرد کے بجائے عورت بن جاؤں، وغیرہ وغیرہ۔ م۔ج سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اتنے پیچیدہ ذہنی اور جنسیاتی عقدوں کو صرف ایک سوال ایک جواب سے نہیں سلجھایا جاسکتا۔ اپنے کردار کو بدلنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور لاشعور یعنی الجھاؤ ہمیشہ ان کوششوں کی مزاحمت کرتا رہتا ہے۔ مثلاً م۔ج کو اس تصور سے بے حد

سکون ملتا ہے کہ وہ لڑکی ہوتے اور ازدواجی طور پر لڑکی کے فرائض انجام دیتے۔ یہ تقاضا ان کے لئے لذت بخش ہے کیوں لذت بخش ہے، اس لئے کہ ان کے نفس میں لذت یابی کا جذبہ اسی راستے سے پیدا ہوا ہے۔ م۔ج (تمام نفسیاتی مریضوں کی طرح) غیر معمولی حساس واقع ہوئے ہیں اور غیر معمولی حساس آدمی بہت حد تک غیر حقیقت پسند بھی ہوتا ہے۔ م۔ج کی اس سے زیادہ حقیقت پسندی کیا ہوگی، کہ قدرت نے ان کو لڑکا (مرد) بنایا ہے اور وہ لڑکی (عورت) بننا چاہتے ہیں۔ م۔ج نے مجھ سے اصرار کیا ہے کہ میں ان کیلئے کوئی دوا تجویز کروں۔ لکھا ہے کہ ان کے ذہن، کردار اور انداز فکر کو بدلنے کے لئے ایک ڈاکٹر نے ان کے انجکشن بھی لگائے (پشت پر) پھر دست درازی کی بھی کوشش کی، یہ خیال ہی غلط ہے کہ دوا اور انجکشن کی مدد سے کسی کے کردار اور انداز فکر کو مستقل طور پر بدلا جاسکتا ہے۔ بیشک کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں ہوئی، جو انسان کے سوچنے کے ڈھنگ کو مستقل طور پر بدل دے۔ بیشک جسمانی حالت اور انسان کے جسم کے بعض غدود کی ناکردگی انسان کے ذہن کو وقتی طور پر بدل دیتی ہے۔ مثلاً گلے کے غدود (پیرا تھائی رائیڈ گلینڈ) کی ناقص کارکردگی کے سبب آدمی کند ذہن اور غبی ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کے کردار کی بنیادی خصوصیات اپنے مقام پر باقی رہتی ہیں۔ م۔ج کسی دوا کے چکر میں نہ پڑیں کوئی دوا انہیں اس جنسی گمراہی سے نجات نہیں دلا سکتی۔ وہ مجھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہیں، میں جو مشورہ دوں۔ ان پر عمل کریں، تب کہیں ممکن ہے کہ وہ رفتہ رفتہ (رفتہ رفتہ کو یاد رکھیں) اعتدال اور حقیقت پسندی کی راہ اختیار کر سکیں۔

لکنت

میں تقریباً اٹھارہ سال سے ہکلا کر بولتی ہوں۔ کلاس میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی، ایک اندرونی خوف اور گھبراہٹ ہے۔ جو گفتگو کے وقت زبان پکڑ لیتی ہے، اس خوف کی وجہ سے صحت نہیں بنتی مگر بعض اوقات جب میں بہت خوش ہوتی ہوں تو فر فر بول لیتی ہوں، زبان کسی لفظ اور فقرے پر نہیں آتی، اس حالت میں باور کیجئے کہ

نکل جاؤں۔ آپ ہدایت کریں کہ میں کیا جواب دوں۔ (ر۔ الف)

یہ جواب دو کہ

مجھے آپ کے کردار کی فلاں اور فلاں خامیاں معلوم ہو گئی ہیں۔ اس صورت میں اپنی قسمت آپ سے وابستہ نہیں کر سکتی۔ آپ یقیناً قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کریں گے، کہ آئندہ ان حرکات سے باز آ جاؤں گا۔ مگر تم کہنا ممکن ہے کہ آپ اپنے آپ کو بدل سکیں لیکن بہر حال آپ کی طرف سے میرے ذہن میں شبہات پیدا ہو گئے ہیں اور ان شبہات کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال، ر۔ الف تمہیں اس سلسلے میں مضبوط، مثبت اور معقول قدم اٹھانا پڑے گا، یہ تو مسئلے کا ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہوا کہ جب وہ تم سے کنارہ کشی اور گریز کا سبب پوچھتے ہیں۔ (یعنی وہ تمہارے کزن) تو پھر تم صاف گوئی سے کام کیوں نہیں لیتیں، کیا تم ان سے ڈرتی ہو یا ابھی تک تمہاری روح میں پرانی محبت کی کوئی چنگاری چمک رہی ہے جب تم ان کے کردار کی طرف سے مشتبہ ہو گئی ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ:

شکوہ ترک و وفا کیوں، یہ بہت سے اے دوست
کہ کرے نام سے بیزار نہیں ہوں اب تک

ماموں زاد بہنیں

میں ابھی صرف تیس سال کا ہوں اور خلیج العرب کی ایک ریاست میں کام کرتا ہوں۔ ماشاء اللہ تنخواہ اچھی خاصی ہے اور پیشہ بھی آبرو مندانه ہے۔ گھر کے حالات بھی نا اطمینان بخش نہیں، بات یہ ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا تو مجھے ماموں صاحب نے سایہ شفقت میں لے لیا اور اس ناز و نعم سے پرورش کی کہ میں اپنے والدین کو بھول گیا۔ اس وقت ماموں صاحب کے یہاں صرف لڑکیاں تھیں، کوئی لڑکا نہ تھا۔ مجھے ماموں صاحب کے یہاں ایسی آسائش نصیب ہوئی کہ والدین کے گھر ممکن نہ تھی۔ ماموں اپنے سکے لڑکے سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ میں ماموں زاد بہنوں کو اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتا

دو دو گھنٹے بولتی ہوں اور زبان میں لکنت نہیں آتی۔ گفتگو ایک قدرتی آبشار کی طرح میرے ہونٹوں سے بہتی ہے، لکنت کا سبب گھبراہٹ ہے۔ گھبراہٹ کا سبب بوکھلاہٹ، کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ میں فر فر بولنے لگوں۔ (ن۔ ح)

تم نے لکھا ہے کہ لکنت کا سبب گھبراہٹ اور گھبراہٹ کا سبب بوکھلاہٹ۔ سوال یہ ہے کہ بوکھلاہٹ کا سبب کیا ہے؟ آخر آپ کیوں بوکھلائی ہوئی رہتی ہیں۔ اس کا جواب آپ بچپن میں اپنے والدین کے برتاؤ میں اپنے ماحول اور زندگی کے ابتدائی تجربات میں تلاش کریں۔ جن بچوں کی پرورش، سختی اور سخت گیری کے ساتھ ہوئی ہے۔ جن کی شخصیت کے سینے پر والدین کا قابو سوار ہو جاتا ہے، جو ڈانٹ ڈپٹ کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں ان بچوں کے نفس میں ایک عجیب خوف جاگزیں ہو جاتا ہے وہ ماحول کی سختیوں کی تاب نہ لا کر اپنے خول میں چھپ جاتے ہیں۔ لکنت اس امر کا اظہار ہے کہ وہ اپنے خول سے باہر نکلا نہیں چاہتے، نہیں چاہتے کہ گفتگو (ابلاغ) کے ذریعہ دوسروں سے رابطہ پیدا کریں۔ کیونکہ انہیں خارجی دنیا سے براہ راست تعلق پیدا کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ن۔ ح تم بچپن کے حالات لکھو کہ میں سمجھ سکوں کہ برائی کا سرچشمہ کہاں واقع ہے؟

کیا جواب دوں؟

میں بہت پریشان ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اس مسئلہ کو حل کیا جائے؟ معاملہ یہ ہے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے رشتہ کے ایک "کزن" سے محبت کرنے لگی ہوں، جب یہ معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے اور میں پوری طرح اس جال میں پھنس گئی تو مجھے ان کے کردار کے بارے میں چند ایسی باتیں معلوم ہوئیں کہ خوفزدہ ہو گئی اور میں نے ان سے کنارہ کشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب ایک مدت ہوئی میں ان سے نہیں ملتی وہ مجھ سے ملنے کی بہت کوشش کرتے ہیں اور اس کنارہ کشی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ جی ہاں! میں بہت حساس واقع ہوئی ہوں، چاہتی ہوں کہ بخیر خوبی اس "بھنور" سے

تھا، چاہتا ہی چاہیے تھا۔ وقت حسب معمول گزرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں انیس بیس سال کا نو جوان بن گیا۔ ماموں کی بڑی لڑکی بھی جوان ہو گئی، اب میرے والدین نے مجھ سے پوچھے بغیر، میری ماموں زاد بہن سے رشتے کی بات طے کر دی۔ ماموں تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، انہوں نے فوراً ہاں کر لی جب مجھے رشتے کا پتا چلا تو میں نے سختی کے ساتھ اُسے مسترد کر دیا اور کہا کہ میں ابھی کسی طرح شادی کے لئے تیار نہیں۔ وہ میری اس گستاخی پر اتنے چراغ پا ہوئے جیسے کسی خوبصورت باغچے میں آگ لگ جائے۔ ماموں کو جب میرے انکار کا پتا چلا تو وہ بھی آزرده ہو گئے۔ تاہم انہوں نے اپنی آزر دگی کا تذکرہ مجھ سے کیا نہ والد صاحب سے! البتہ میری والدہ یعنی اپنی بہن سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر وہ شادی پر تیار نہیں تو ہمیں بھی اصرار نہیں۔ ہم اس لڑکی کا رشتہ کہیں اور کر دیں گے۔ دوسری دو لڑکیاں ابھی چھوٹی ہیں، پھر دیکھیں گے کہ کیا کیا جائے۔ ماموں صاحب اور ان کی بیوی وطن میں ہیں اور میں دیار غیر میں پڑا ہوں۔ صرف اس لئے وطن نہیں جاتا کہ کہیں ماموں کسی لڑکی کو میرے گلے نہ منڈھ دیں، بخدا میں ان لڑکیوں کو سگی بہنوں کی طرح چاہتا ہوں۔ بہنوں سے شادی کس طرح ممکن ہے؟ خیال یہ تھا کہ ماموں جان بچ کر آکر یعنی مجھ سے مایوس ہو کر اپنی لڑکیوں کی شادی کہیں کر دیں گے۔ اُف میرے خدا، ماموں نے اپنی لڑکیوں کو میرے انتظار میں بٹھا رکھا ہے۔ کہ جب میں دیار غیر سے وطن واپس آؤں تو کسی ایک لڑکی کو میرے عقد میں دے دیں۔ نہ تو میں اپنے شفیق ترین ماموں کا دل توڑنا چاہتا ہوں نہ اپنے والدین کو مایوس کر سکتا ہوں۔ ان سب لوگوں کی تمام تر تمنائیں اور آرزوئیں مجھ سے وابستہ ہیں۔ آہ! میں ان کی خوشیوں پر کس طرح پانی پھیر دوں؟ بلاشبہ لڑکیاں کافی خوبصورت ہیں، بظاہر یہ ایک بہترین رشتہ ہے، لیکن کیا کروں۔ میرا ضمیر اس رشتے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، میرے اندر ہرگز اتنی ذہنی صلاحیت اور اخلاقی طاقت موجود نہیں کہ اس رشتے کے بوجھ کو برداشت کر سکوں۔ آپ مشورہ دیجئے کہ کیا کروں؟ (ایم۔ آر۔ این۔ الفجر، خلیج العرب)

بنات اعمام

برادر ماموں زاد بہن سے میری بھی شادی ہوئی ہے اور میں الحمد للہ ایک لمحے کے لئے محسوس نہیں کیا کہ میری بیوی میری بہن ہے۔ بھائی! آپ کی یہ سوچ طفلانہ ہے، ماموں زاد بہن کی نسبت آپ کی ذہن میں جو کام پلکس کا فرما ہے، وہ غلط اخلاقی تربیت کا نتیجہ ہے۔ بنات اعمام (چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد بہنوں) سے شادی نہ اسلام کی رو سے حرام ہے نہ معاشرے کے اخلاقی تصورات کے لحاظ سے! میاں ایم۔ آر۔ این تم جس تصور میں الجھ گئے ہو، یہ سراسر ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ تمہارا خط پڑھ رہا تھا، ایک نو جوان ملاقات کے لئے آیا اور اس نے عجیب داستان سنائی۔ کہنے لگا کہ رئیس صاحب! مجھے بچائیے۔ ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اس حساس نو جوان کی کہانی یہ ہے کہ جب اس نے پہلی مرتبہ جملہ عر دی میں قدم رکھا۔ اور دلہن کا گھونگٹ اٹھایا تو اسے بیوی کے روپ میں ایک ایسی عزیزہ کا چہرہ نظر آیا۔ جو رشتے کے لحاظ سے نہایت مقدس اور محترم حیثیت رکھتی ہیں۔ اب وہ نو جوان حیران ہے کیا کرے؟ اپنی بیوی کو دلہن سمجھے یا.....؟ تو اسے عزیز! اس قسم کے تمام حادثات نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی الجھنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا علاج صرف سوال و جواب کے کالموں کے ذریعے ممکن نہیں، میرے پاس کوئی جادو کا ڈنڈا نہیں کہ ڈنڈا گھماؤں اور مریضوں کے قلوب اور ان کے انداز فکر کو بدل دوں۔ آپ ایک غلط اندازہ نظر کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک غلط، غیر حقیقی اور گمراہ کن وسوسے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ایک طرف آپ کو میں نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (S.C.T) کا مشورہ دوں گا اور دوسری طرف یہ کہ آپ خودداری اور شعوری کوششوں سے اپنے انداز فکر کو بدلنے کی کوشش کریں۔ یہ کام آسان نہیں، تاہم ناممکن بھی نہیں۔ آپ کو خارجی حقیقتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا گر سیکھنا چاہئے۔ یہ طریقہ سیکھ سکتے ہیں۔

بھابی یا؟

میں اپنے دوست کے مشورے پر آپ کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ آج سے تقریباً ایک سال قبل محترمہ ”ن“ میری زندگی میں داخل ہوئیں، میں انہیں بھابی کہہ کر پکارتا تھا۔ ان کا شوہر میرا سگا بھائی تو نہیں۔ البتہ تعلقات کی بناء پر ان کے شوہر کو بھائی اور ان محترمہ کو بھابی کہہ کر پکارتا تھا۔ ایک روز عجیب اتفاق ہوا، سان نہ گمان ان محترمہ نے اقرار کیا کہ وہ مجھے چاہتی ہیں، مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ ان کے اس اقرار و اظہار نے میری سوچ کی راہیں بدل دیں، بد نصیبی سے وہ بے اولاد واقع ہوئی ہیں۔ ان کی شادی کو دس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ شوہر نے ان کی بے ثمری سے مایوس ہو کر دوسری عورتوں میں دلچسپی یعنی شروع کر دی۔ سابقہ بھابی کہتی ہیں کہ وہ میرے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ ہم نے باہم شادی کے بھی عہد و بیان کئے ہوئے ہیں، عمر میں مجھ سے تین سال بڑی ہیں۔ میں ان کا احترام بھی کرتا ہوں۔ کیونکہ ابتداء ہی سے ان کا احترام میرے اندر جاگزیں ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کسی..... (خصوصاً منہ بولے بھائی) کا حق مارنا اور اس کی امانت میں خیانت کرنا زیادتی ہے، ایک طرف تو ان کے شوہر سے میرے تعلقات برادرانہ ہیں اور دوسری طرف بیوی کا رویہ عاشقانہ ہے، یہ بہت بڑا امتحان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ والدہ بھی اس رشتے سے مطمئن نہیں۔ البتہ بھابی بلائے جان بنی ہوئی ہیں، نہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ سکتا ہوں نہ والدہ کو ٹھکرا سکتا ہوں، ویسے مجھ میں خود اعتمادی کا مادہ بہت ہے۔ البتہ ”ن“ کو بھولنا میرے امکان سے باہر ہے۔ (ش۔م۔ پنڈی کینٹ)

عشق اور اعتدال

عورت بے اولاد بھی ہو اور اس کا شوہر دوسری عورتوں میں دلچسپی بھی لیتا ہو تو اس کا ”ایب نارمل“ یا گمراہ ہو جانا ممکن ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض لوگ زندگی کی سخت

درشت اور بے رحم حقیقتوں سے اکتا کر عاجز آ کر راہ فرار کی تلاش میں محبت کے کوپے کی طرف جاتے ہیں، حقیقت میں لاشعوری طور پر ان کا عشق ”حقائق حیات“ شدائد حیات اور مظالم حیات“ سے فرار و گریز کا آسان راستہ ہوتا ہے۔ آپ کی بھابی محروم بھی ہیں اور اولاد نہ ہونے کے سبب محروم (یعنی مردہ دل) بھی وہ آپ کی ذات سے عشق نہیں کرتیں۔ اپنی ذات سے پناہ مانگتی ہیں، وہ خود اپنے سے عاجز ہیں، نہ ان عشق میں استواری ہے نہ آپ کی ذات میں دلداری، جو کچھ ہو رہا ہے، محض فریب نفس ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آج بھی ان کا (یعنی بھابی کا) احترام میرے نفس کے اندر پیوست ہے، اور جب انہوں نے اظہار محبت کیا۔ تو میری سوچ کی راہیں بدل گئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے نفس کی اندرونی تہوں میں شروع ہی سے ایک میلان شوق اور رجحان خاص مخفی تھا وہ اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ عشق کے ہزار باروپ ہیں، کبھی کبھی عشق کا جذبہ احترام کے روپ میں بھی نمودار ہوا کرتا ہے، پہلے آپ بھابی کا احترام کرتے تھے۔ اب ان سے عشق کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے جو چیز مخفی تھی وہ اب کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اگر بھابی نے آپ کی آنکھوں میں چھپی داستان نہ چرچائی ہوتی تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ آپ سے سان نہ گمان، اظہار عشق کر بیٹھیں برادر! انسان بے چارہ بعض اوقات منافق بننے پر مجبور ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہم دوسروں سے نفاق برتتے ہیں، بلکہ اپنے سے بھی اپنے کو چھپاتے ہیں۔

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں

اپنی ہی طلب سے ڈر رہا ہوں

میرا دوستانہ، عزیزانہ اور بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ ان محترمہ سے کسی حال میں شادی نہ کریں۔ البتہ چند روز کے لئے عشق کی اجازت ہے، اس کے ساتھ کہ:

عشق کو اعتدال لازم ہے

زندگی انتہا پسند نہیں

خواب ہائے بیداری

میں آپ کے کالم پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ پہلے تو آپ کی باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ لیکن اب آہستہ آہستہ آپ کی باتوں پر یقین آنے لگا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس ہزاروں خطوط آتے ہیں اور آپ حد درجہ مصروف آدمی ہیں۔ لیکن خدا کے واسطے میرے خط کو بغور پڑھیں۔ میں بے حد پریشان ہوں۔ عمر 19 سال ہے، اس سال انٹر میڈیکل گروپ 65% کے ساتھ پاس کیا ہے۔ امتحانات جولائی میں ختم ہو گئے تھے۔ اب بیکار ہوں۔ مجھ سے بڑا صرف ایک بھائی ہے، فوج میں لفٹیننٹ ہے۔ والد بزرگوار آفیسر ہیں تنخواہیں معقول ہیں، سرکاری بنگلہ ملا ہوا ہے۔ رئیس صاحب! ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوں ”یعنی خواب ہائے بیداری“ (DAY DREAMING) کے چکر میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ خود اپنے سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔ دل ہی دل میں عجیب روحانی قصے گھڑتی رہتی ہوں۔ ان میں میرا کردار میرا اپنا بھی ہوتا ہے۔ دراصل پڑھائی کے معاملے میں بے حد ذہین ہوں۔ ہمیشہ اپنی کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرتی ہوں۔ کمزوری یہ ہے کہ اپنی اہمیت جتنی نہیں آتی بلکہ ہوں کہ ”منہ چور“ ہوں طبیعت پر مذہبی میلان غالب ہے۔ سنجیدگی اور بردباری کو پسند کرتی ہوں، اسکول اور کالج میں سہیلیاں تو ہیں مگر یہ نہیں کہ گھر آنا جانا بھی ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ چشموں میں نہ تو کوئی لڑکی میرے گھر آتی ہے، نہ میں کسی لڑکی کے گھر جاتی ہوں، عمر بھر میں ایک بھی کچی سہیلی نہ بن سکی۔ نتیجہ احساس کمتری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، سخت تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ عادتیں بھی ایسی ہیں یعنی سادہ مذہبی اور سخت حساس، رمضان کے مہینے میں ایک روزہ افطار کے بعد میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ جلدی جلدی پانی پیا، دھنیا چبایا۔ جس سے کچھ سکون ہوا اور والدہ پہلے ہی سے ریاچ (گیس) کی مریضہ ہیں۔ مجھ پر دورہ پڑا تو ایسا لگا کہ آخر وقت آگیا ہے، خیر فح گئی، اللہ کا شکر ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ ہر افطار کے بعد تیزی سے دل دھڑکتا اور ہر بار یہ خیال آتا تھا کہ لیجئے ملک الموت

آتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی پریشانی سب سے چھپالی۔ والدہ اعصابی مریضہ بھلا یہ بات انہیں کس طرح بتاتی کہ میں امراض قلب میں مبتلا ہو کر مرنے والی ہوں۔ رمضان سے اب تک موت کا خوف بری طرح ذہن پر مسلط ہے۔ کئی بار سچ سچ حالت مرگ طاری ہو گئی گھبراہٹ کہ خدا کی پناہ، دل دھڑکنا ہاتھ پاؤں کا ٹھنڈا پڑ جانا، نیند غائب ہو جانا، کیا یہ معمولی شکایتیں اور تکلیفیں ہیں، جی ہاں۔ موت کا خوف ایک وحشت ناک بھوت کی طرح سر پر مسلط ہے! رئیس صاحب! خدا کے لئے بتائیے کہ میں کیا کروں؟ (ج۔ ب۔ انصاری)

ابتدا اور انتہا

بی بی! تم نے اپنے خط کی ابتداء خواب ہائے بیداری سے کی تھی اور انتہا خوف مرگ پر ہوئی۔ ظاہر ہے خوف مرگ کا واحد علاج مراقبہ مرگ ہے، یعنی یہ تصور کہ میں مری رہی ہوں۔ ج۔ ب۔ انصاری! یاد رکھو کہ ریاچ کا مرض (یعنی گیس) ہمیشہ شدید الحساسی کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ آدمی جس قدر حساس ہوگا اس کا معالجہ انتہائی ضعیف اور کمزور ہوگا۔ دماغ اور معدے کے درمیان اثر اندازی اور اثر اندوزی کا ایک لاسٹک سلسلہ قائم ہے، دماغ میں تاثرات اور جذبات کے کتنے اتار چڑھاؤ ہوں گے، معدہ اسی تواتر کے ساتھ متاثر ہوگا۔ ج۔ ب۔ انصاری! تمہاری والدہ کی مرضی کیفیت کا واحد سبب یہ ہے کہ تم دونوں ہر چیز کو غیر معمولی طور پر محسوس کرتی ہو۔ تمہارے خواب ہائے بیداری، تمہاری تنہائی پسندی تمہارا احساس کمتری تمہارا خوف مرگ، یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ تم چاہتی ہو کہ میں صرف مشوروں سے تمہیں صحت مند کر دوں، یہ ممکن نہیں۔ اگر تم باضابطہ مجھ سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم رکھو۔ میری تجویز کردہ مشقیں شروع کر دو۔ (صرف مراقبہ مرگ نہ سہی، تنفس نور، خود ترغیبی سہی) صرف اسی وقت کامیابی کی امید ہے، ورنہ خدا نخواستہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم سچ سچ مریض قلب بن کر رہ جاؤ گی۔ دل دھڑکنا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جانا، نیند نہ آنا، یہ ساری علامتیں

ہیں، گہری جذباتی کشش کی۔ بی بی۔ اس عمر میں حساس لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر ان ہی کیفیت سے دوچار ہوا کرتی ہیں خصوصیت کے ساتھ لڑکیاں کہ وہ اپنے اندر ڈوب کر رہ جاتی ہیں۔ اپنے اندر ڈوب کر رہ جانے کے نتیجے میں ”خواب ہائے بیداری“ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً آنکھیں بند کر کے بحالت بیداری سو جتی ہوں گی، کہ میں ایک شہزادی کی طرح لوگوں کے دلوں پر حکمران ہوں۔ میں ایک ملکہ موسیقی ہوں اور دنیا بھر میں میرے کمال فن کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ میں ایک بے مثال اداکارہ ہوں، اور ایک عالم میری بے مثال اداکاری پر سر دھن رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ خواب ہائے بیداری کے سبب عام آدمی عالم خیال کی فضا میں وہ لذت حاصل کر لیتا ہے۔ جو اسے حقیقی دنیا میں نصیب نہیں ہوتی۔ وہ عالم خیال کی فضا میں پرواز کرتے کرتے اتنی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ پھر اس سنگ و خشت کی دنیا میں اس کی واپسی کا امکان نہیں رہتا بہر حال میں نہیں مشورہ دوں گا کہ تم بذریعہ خط مجھ سے رابطہ قائم کرو۔ نفسیاتی علاج جھاڑ پھونک نہیں ہے کہ میں نے پھونک ماری اور تم صحت یاب ہو گئیں، میں نے دم کیا ہوا پانی پلایا اور تم ٹھیک ٹھاک ہو گئیں نہیں یہ ممکن نہیں، ہاں یہ ناممکن ہے۔

دل و دماغ میں جنگ

آج بہت دن کے بعد پھر آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ہر وقت دل و دماغ میں لڑائی چھڑی رہتی ہے، نجانے اس جنگ کا فیصلہ کیا ہوگا، یہ تو اس وقت معلوم ہوگا، جب والد بزرگوار ڈھاکے سے آجائیں گے، وہ اب تک وہیں نظر بند ہیں۔ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ لیکن آپ نے اس پر شدید ملامت کی تھی اور لکھا تھا کہ ہرگز گھر سے باہر قدم نہ نکالنا۔ اب لوگ آپ کے توسط سے مظلومین بنگلہ دیش کے لئے امدادی پیش کشیں کر رہے ہیں، جی چاہتا ہے، میں کسی پیش کش کرنے والے کے پاس چلی جاؤں۔ لیکن دماغ تنبیہ کرتا ہے۔ رئیس امر وہوی کے مشورے پر عمل کر، سو پھر آپ سے مخاطب ہوں۔ اچھا اگر میں بھاگ جاؤں تو کیا ہوگا؟

جو کچھ ہوگا اسے میں خود سنبھال لوں گی۔ آج میں آپ سے دو سوال کرنا چاہتی ہوں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لوگ آدم و حوا کے زمانے سے عشق کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ دنیا میں کوئی سبز اس آگ سے خالی ہو، پھر یہ عجیب سی بات ہے کہ آج تک انسانی معاشرے نے عشق کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ کیا عجیب بات نہیں؟ دوسری چیز یہ کہ جو لڑکے اور لڑکیاں عشق کے میعاد بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انہیں آپ بڑی پیاری پیاری نصیحتیں کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے بچے اور بچیاں خود اس عارضہ میں مبتلا ہو جائیں تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟ اوہ معاف کیجئے میں نے آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھا ہے۔ یہ جرأت اس لئے ہوئی کہ آپ ہمارے رہنما ہیں اور ہم آپ کے کردار پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں نے اس عشق و عاشقی کے چکر میں دوسرے دھوکا کھایا ہے۔ اب مجھے لڑکوں سے شدید نفرت پیدا ہو گئی ہے، میں ان سے سخت متنفر ہوں۔ یہ بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر انہیں عمر بھر کے لئے تباہ کر دیتے ہیں تو یہ ایک کیفیت ہوئی۔ دوسری کیفیت یہ ہے کہ آج تک اس کی گہری خوب صورت آنکھیں مجھے یاد آتی ہیں۔ وہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر میں گھبرا جاتی ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ آنکھیں کہاں گئیں؟ اب وہ ملنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟ دل کے رشتے ہوتے ہیں، مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ والدین اس رشتے کو منظور نہیں کریں گے۔ لیجئے ایک اہم بات رہ گئی۔ سوچا یہ ہے کہ جب والدین ڈھاکہ سے آجائیں تو میں اپنی ساری سرگزشت رقم کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دوں کیا رائے ہے؟ اور ہاں آپ نے میرے ارادہ خود کشی کے بارے میں کیا رائے قائم کی؟ (بد نصیب لڑکی ن۔ ف)

عشق کے بعد عقد

ن۔ ف پھر وہی خود کشی، جس سے مجھے نفرت ہے، پھانسی پا جانا خود کشی سے ایک لاکھ درجہ بہتر ہے۔ آئندہ بی بی کبھی خود کشی کا لفظ زبان پر اور تصور ذہن میں نہ لانا ورنہ.....؟ خیر انشاء اللہ تمہارے والد عنقریب ڈھاکہ سے واپس آنے والے ہیں۔ تم ان

کو کچھ نہیں بتاؤ گی، اگر تمہیں میری رائے پر اعتماد ہے تو پھر بذات خود کوئی رائے قائم نہ کرو۔ ن۔ ف۔ جو کچھ ہو چکا، ہو چکا گناہوں کی پردہ پوشی کرنی چاہئے اپنے گناہوں یا دوسرے کے مجھے تو معلوم نہیں کہ اس کرۂ ارض پر کوئی انسان کبھی ایسا بھی پیدا ہوا ہو جس کے ذہن میں کبھی گناہ کا تصور نہ آیا ہو۔ تم سے ایک نہیں، دو لغزشیں ہوئیں۔ بخدا یہ سب لاعلمی، انجام ناشناسی اور تمہاری سادہ لوحی کی بناء پر، تم کسی کی چکنی چڑی باتوں میں آگئیں۔ تم کسی کی گہری خوبصورت آنکھوں میں ڈوب گئیں (اور وہ آنکھیں تمہیں اب تک یاد آتی ہیں) ہائے حسرت موبائی:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

تم نے مجھ سے دو سوال کئے ہیں (1) یہ کہ اگرچہ ابتدائے ظہور انسان سے شروع تک کاروبار عشق جاری ہے۔ تاہم معاشرے نے اب تک عشق کو بطور ایک سماجی حقیقت تسلیم نہیں کیا۔ (2) دوسرا سوال یہ اگر ایسی صورت حال سے دوچار ہوں۔ تو میرا رد عمل کیا ہوگا؟ تو بی بی اپیلے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ سن لو کہ جب بھی میں ذاتی طور پر کسی ایسے مسئلے سے دوچار ہوا ہوں۔ میرا رد عمل وہی ہوا ہے، جس کا اظہار میں اپنی تحریروں میں کرتا رہتا ہوں م۔ ف میں جو کچھ دوسروں کے لئے لکھتا ہوں۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش خود بھی کرتا ہوں۔ اب رہا یہ کہ معاشرے نے اب تک عشق کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا۔ نہیں اس حد تک معاشرہ، عشق کو ایک جذباتی رشتے کے طور پر قبول کرتا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کا عشق ”عقد“ پر ختم ہو۔ اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کی طرف مائل ہے یا کوئی لڑکی (تم جیسی) کسی کی گہری خوبصورت آنکھوں میں ڈوب گئی ہے۔ تو میں یہی مشورہ دوں گا کہ دونوں کا نکاح کر دیا جائے۔

عاشقی قید شریعت میں جو آجاتی ہے

جلوہ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

متفرقات

واہ کینٹ کے ج۔ الف قسمت کی خرابی سے ف کے دام محبت میں اسیر ہو گئے ہیں۔ عمر میں سال کی ہے، لکھتے ہیں کہ میں ف کو جنون کی حد تک چاہتا ہوں، میرے دل کی ہر دھڑکن میں سمائی ہوئی ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اس کا نام زبان پر آتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ف بھی مجھے چاہتی ہے یا نہیں؟ کبھی تو اس کے انداز سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے (یا مجھ میں) دلچسپی لے رہی ہے یا نہیں؟ اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے کشیدہ خاطر ہے۔ اس شکستہ دلی کے عالم میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میں نے اسے چاہ کر بے حد غلطی کی۔ میں اس کو بھلانے کی جتنی کوشش کرتا ہوں، وہ مجھے اتنی ہی شدت سے یاد آتی ہے۔ مشورہ دیجئے کیا کروں؟ صرف اتنا کیجئے کہ اور شدت سے یاد کیجئے اور شدت اور شدت سے بلکہ اس سے زیادہ شدت سے یاد کیجئے۔ چالیس روز اس ترکیب پر عمل کیجئے۔ پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

(ب) شاہد علی غزل پرست قد ہیں۔ تاہم وہ کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ ادب سیاست یا سائنس یا کسی دوسرے شعبے میں کوئی ایسا کارنامہ انجام دیں، کہ دنیا انگشت بدنداں ہو جائے، مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے کہ کیا کروں؟ شاہد علی غزل، ہر انسان میں ایک مخفی صلاحیت ہوتی ہے جو ہمیشہ بروئے کار آنے کے لئے بیقرار رہتی ہے اس شخص کو ان ہی کاموں اور کارناموں سے دلچسپی ہوتی ہے، جو اس کی مخفی صلاحیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہد علی غزل تحریر کرتے ہیں کہ انہیں فنون لطیفہ میں کس شعبے سے دلچسپی ہے ”غزل“ کا لاحقہ تو یہ بتاتا ہے کہ وہ نام بدور شاعر واقع ہوئے ہیں۔

م۔ ج مرزا کو مارچ 1972ء میں بمقام لاہور ایک لڑکی سے دور کی شناسائی ہوئی۔ انہوں نے ایک لڑکے کے توسط سے تین خطوط اس کے نام بھیجے جو اس نے بخوشی قبول کئے، اس کے بعد لڑکی کو کچھ غلط فہمی ہو گئی اور اس نے کنارہ کشی اختیار کر لی بعد میں

م۔ج۔ مرزا کو معلوم ہوا کہ وہ خود اپنے طرز عمل پر پشیمان ہے۔ جولائی 1972ء میں اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ مرزا صاحب نے اس سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی بے حد کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئے اور اب آتشِ بھراں میں جل رہے ہیں، مجھ سے مشورہ طلب ہیں کیا مشورہ دوں۔ آپ ہی بتلائیں:

غم فراق لرزتا ہے جس سے قلب حیات
مجھے قبول بشرطیکہ اس کا اجر تو ہو

بھیا! جس طرح انسان قدرتی حادثوں پر آخر کار صبر کر لیتا ہے، اسی طرح آپ کو اس حادثے پر صبر ہی کرنا پڑے گا۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سرحد کے کسی شہر سے بی ایس سی کے ایک طالب علم نے اپنے غیر فطری جنسی تعلق کی کہانی لکھ کر بھیجی ہے، بیشک معاملہ سنگین ہے اور مزید سنگین ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بہتر ہے کہ وہ گھر میں دلچسپی لینے کے بجائے باہر دلچسپی لینے کی کوشش کریں۔ آج ہی یہ کوشش شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں جس عورت کے شوہر دوسری عورتوں میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ اصرار کرتے ہیں کہ اپنی سہیلیوں سے میری ملاقات کرادو ورنہ گھر بیٹھو، انہیں میں کیا مشورہ دوں۔ سوائے دعا کے کیا کر سکتا ہوں، کاش میرے امکان میں کچھ ہوتا۔

پتیل تلے

آج سے پانچ سال پہلے میں ”ی“ کے دام زلف میں اسیر ہو گیا۔ میری محبت کا شاہد پتیل کا وہ پیڑ تھا۔ جس کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر میں ”ی“ کی راہ نکالتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر صرف مسکرا دیا کرتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں نہ محبت کا پیام تھا نہ شوخی نہ شرارت۔ بس ایک مسکراہٹ تھی، خالی مسکراہٹ، پراسرار مسکراہٹ۔ ہم نے ایک

دوسرے سے بات نہیں کی اظہار خیال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ خاموش تھی۔ وہ میں محبت کی دھیمی دھیمی آنچ کو اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔ جس طرح مسافر کسی برف آلود رات میں خانہ بدوشوں کی چھوڑی ہوئی راکھ کے پاس بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگے۔ میں بھی سرد مہری کی اس بخ بستہ دنیا میں اس کی محبت کی خاکستر گرم سے اپنی روح کو حرارت بخشنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبت کی دنیا کا رائج الوقت سکہ خاموشی ہے۔ لب کشائی کی ہمت کی اور اس کی خدمت میں ”محبت نامہ“ ارسال کیا۔ اس طرح ”ی“ تک رسائی کی ہمت کی اور اس طرح ”ی“ تک رسائی ہو گئی۔ ایک روز وہ اچانک مجھ سے کہنے لگی، تم محبت نہیں ”فلرٹ“ کرتے ہو آہ یہ تھا ہماری محبت کا انجام۔ ”ی“ سے بچھڑنے کے بعد پتیل کا درخت (جس کی ہندوستان میں پرستش کی جاتی ہے) میرا محبوب بن گیا تھا، میں اس کی پوجا کرتا تھا۔ کیونکہ یہی وہ پیڑ تھا جو ہماری محبتوں کا راز دار تھا۔ ہزار حیف پائپ لائن نکالنے کے بہانے کاٹ کر پھینک دیا گیا اب نہ ”ی“ ہے نہ وہ پتیل کا درخت۔ بتائیے میں کیا کروں۔ میں نے ”پتیل تلے“ عہد محبت کیا تھا۔ اب ”آسمان تلے“ شکست عہد کا ماتم کر رہا ہوں۔ (م۔ن۔ا)

بے قراری کی حشر سامانیاں

(م۔ن۔ا) صاحب اگر آپ کا خط سامنے نہ ہوتا تو خیال کرتا کہ آپ نے کسی روحانی افسانے کا ایک ایک ٹکڑا نقل کر کے بھیج دیا ہے۔ پتیل کا پیڑ ”ی“ کی عہد شکنی! بے شک یہ سارے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔ دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے اس قسم کے حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ عشق کی آمدھی چلتی ہے تو کچھ دیر کے لئے فضا گرد آلود ہو جاتی ہے پھر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ انسانوں کی زندگی میں آغازِ جوانی کا عہد بڑا..... پرخطر اور ہیجان انگیز عہد ہوتا ہے۔ جسم کے تمام حدود..... سرگرمی سے کام کرنے لگتے ہیں، خون میں بجلیاں سی حل ہو جاتی ہیں۔ سیزن بقول غالب ”محشرستان بیقراری“ ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں آپ کسی کو کتنا ہی کیوں نہ

سمجھائیں۔ پند و نصیحت کے کتنے ہی دفتر کیوں نہ کھول لیں۔ نہ وہ ہینٹل کے پیڑ کی پوجا ترک کرے گا، نہ ”سی“ کو فراموش کرے گا۔ م۔ن! صاحب کے اضطرابِ قلب اور سوز و گداز کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں پوری طرح جانتا ہوں کہ وہ کس طرح عذابِ روحانی سے دوچار ہیں۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ یہ کیفیت عارضی ہوا کرتی ہے۔ آج م۔ن! جس چیز کو پہاڑ سمجھ رہے ہیں۔ کل وہ پرکاش بن کر رہ جائے گی۔ اب تک کوئی انجکشن ایسا ایجاد نہیں ہوا جو سوزِ عشق کو سرد کر سکے۔ صرف وقت ہی اس زخم کو مندمل کر سکتا ہے۔ صرف وقت! آج م۔ن! اپنے پروردگار سے ہیں، کل انہیں خود پر ہنسی آئے گی۔

ہم اپنے حال پریشاں پہ بارہا روئے
اور اس کے بعد ہنسی ہم کو بارہا آئی

عزیزم! محبت کا طوفان چڑھتا بہت تیزی سے ہے، اترتا دیر میں ہے، تاہم اترتا ہے۔ ہم بھی جب کسی کے عاشقِ زار تھے، تو سمجھتے تھے کہ عمر بھر اسی آگ میں جلنے رہیں گے۔ بڑے کرب کا دور گزارا ہم نے! راتوں کو آخر شہ ریاں اور دن کو گریہ و زاریاں کیں۔ قوتِ قلب کیلئے حکیموں سے معجونیں، ڈاکٹروں کی تجویز سے تشویش شکن (انٹی ڈپریشن) گولیاں استعمال کیں۔ پیروں کے پاس تعویذ کے لئے گئے بزرگوں کے مزار پر چلے باندھے۔ فقیروں کا دم کیا ہوا پانی پیا، زلیخا کو رام کرنے کے لئے سورہ یوسف کا چلہ کھینچا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا عشق کا میعاد بخارا اپنی مدت پوری کر کے ملا، تو برادر م۔ آپ بھی عنقریب ”ہینٹل کے پیڑ“ اور ”سی“ کو بھول جائیں گے۔ مطمئن رہیے۔

نفاذِ شریعت

السلام علیکم! ہو سکتا ہے کہ آپ میرے خط کو اہمیت نہ دیں۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو یقین سا ہے۔ کہ آپ کو خط لکھ کر میرے غم زدہ دل کو سکون ملے گا۔ میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتی۔ صرف التجا کر سکتی ہوں کہ خدا را میری رہنمائی کریں، میں بات کہاں سے

شروع کروں؟ نہیں سمجھ پاتی۔ میں بے حد دکھی ہوں۔ (اپنے خیال میں) ہو سکتا ہے کسی کی نظر میں میرا دکھ بے وقار اور بے اعتبار ہو۔ حالات یہ ہیں کہ رئیس صاحب ایک سال ہوا۔ خاوند کچھ خاندانی رنجشوں کی بناء پر مجھے چھوڑ بیٹھا، میں باپ کی چوکھٹ پر آ بیٹھی۔ اللہ رے نصیب یہاں بھی اس نے پہچان نہ چھوڑا، شفیق باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ والد صاحب بے حد مذہبی انسان تھے۔ یہ رجحان مجھے بھی ورثے میں ملا ہے۔ رئیس صاحب! میں چاہتی ہوں کہ آپ کی کتابیں پڑھ سکوں، حاصل کروں۔ مگر مالی مجبوریوں کی بناء پر آپ کی تصانیف نہیں خرید سکتی۔ میری دعا یہ ہے کہ مجھے نماز سے سکون ملے۔ آپ مجھے مراقبہ کرنے کا طریقہ بتائیے، مجھے بتائیے کہ نور کا تصور کس طرح قائم کیا جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ والد مرحوم کی طرح ”دین“ میں ڈوب جاؤں۔ جو وقت گزرے خدا کی یاد میں گزرے۔ روحانیت میں صرف ہو، کیا آپ میری روحانی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ (ممتاز قریشی، لاہور)

ممتاز! تمہارا پتا کہیں گم ہو گیا ہے، معاف کر دینا، مہربانی کر کے پتے سے مطلع کرو۔ تاکہ اپنی تصانیف بھیج سکوں۔ میری کتاب ”مراقبہ“ پڑھ کر تمہیں اندازہ ہوگا کہ مراقبہ کس طرح کرتے ہیں اور تصور نور کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔ ممتاز! تمہیں مذہبی رجحان ورثے میں ملا ہے۔ تو بی بی! تم اس رجحان کا اظہار عملی زندگی میں کیوں نہیں کرتیں، شوہر کی جدائی ہو گئی ہے یا تو پھر اس کی طرف رجوع کیا جائے اور خاندانی رنجشوں پر لعنت بھیجی جائے۔ یا شریعت کو اپنے اوپر عقد ثانی کر کے نافذ کرو، مذہبی رجحان ہوا میں معلق نہیں ہوا کرتا۔ اس کو ٹھوس شکل دینی چاہئے۔ ممتاز! سچی روحانیت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک انسان (مرد ہو یا عورت) جذباتی طور پر آسودہ نہ ہو۔ مجھے تمہارے خط سے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ تم ”روحانیت“ کے ذریعہ جذباتی آسودگی حاصل کرنا چاہتی ہو، یہ ممکن نہیں روحانی سکون کی بنیادی شرط ہے جذباتی سکون، اور جذباتی سکون ازدواجی زندگی کے دائرے ہی میں مل سکتا ہے۔ روحانیت، کسی تصور یا

فلسفے یا خواب میں نہیں۔ زندگی کو قوانین فطرت کے مطابق بسر کرنا یہ ہے جی روحانیت۔ ممتاز! تم مجھ سے خط و کتابت کرو، میں تمہیں اس طرح بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اپنی بہنوں کو میری دعا کہہ دینا میں تمہارے خط کا منتظر رہوں گا۔ بی بی! مجھے مولوی ملا ذکر واعظ مت سمجھ لینا۔ ماشاء اللہ تم مذہبی رجحان کی مالک ہو۔ میں یہ دوئی نہیں کرتا البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر معاشرے میں شریعت کے ازدواجی قوانین رائج کر دیئے جائیں۔ تو بہت سے مذہبی رجحان رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو جذباتی تشفی ہو سکتی ہے۔ مذہبی رجحان رکھنے والوں کی نفسیاتی الجھنوں کا واحد علاج ”نفاذ شریعت“ ہے۔

نشان عصمت

ہاں! تو میں ایک مقامی کالج میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں۔ اس وقت میری عمر اکیس سال ہے۔ اب سے کچھ دن پہلے میں ایسی لڑکی تھی جس کو پڑھنے لکھنے کے علاوہ کوئی غم نہ تھا۔ کچھ دن قبل کسی رسالے میں یہ بات نظر سے گزری کہ ہر لڑکی میں باعصمت ہونے کی ایک نشانی ہوتی ہے (مگر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ نشان عصمت کیسا ہوتا ہے) رئیس صاحب! اس روز سے میرا سکون غائب ہو گیا ہے۔ جب میری عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ تو میں ”ایک سنگین“ حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ ایک مقدس رشتے نے مجھ پر یہ ظلم ڈھایا تھا۔ پانچ چھ سال کی بچی کیا احتجاج کر سکتی ہے۔ اب سوچتی ہوں تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ میں انتہائی فکر مند ہوں، اگر مجھ میں وہ نشانی (نشان عصمت) نہ ہوئی تو بے موت مرجاؤں گی۔ آج نہیں تو کل میری شادی ہو جائے گی۔ مستقبل کے تصور سے لرزہ بر اندام ہوں! میں ایک مخلوط کالج میں زیر تعلیم ہوں کے میری بے گناہی اور پاکیزہ دامن پر یقین آئے گا۔ رئیس صاحب! خدا کیلئے رسول ﷺ کے لئے بتائیے کہ مجھ میں یہ نشانی موجود ہوگی یا نہیں؟ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ ایک مجبور لڑکی کی درخواست ہے۔ آپ مجھے ع۔ ع کے نام سے جواب دیں۔ میں نے آپ سے بڑی آس لگا رکھی ہے۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال!

ع۔ ع خوش ہو جاؤ کہ تم میں وہ نشانی موجود ہے۔ جو ایک مکمل اور مجرد (غیر شادی شدہ) عورت کی نمایاں خصوصیت ہوا کرتی ہے اگر الیکٹرانک ایکسرے بھی کیا جائے تب بھی کوئی شخص تمہارے جسم میں پندرہ سالہ قبل گزرے ہوئے حادثہ کا پتا نہیں چلا سکتا۔ عام طور پر لوگوں میں اعضائے نسل آفرینی کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ آج کل میں ”جنس اور جنسیات“ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس کتاب کا ایک مفصل باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ ع۔ ع تم جس چیز کو نشان عصمت کہتی ہو اسے ”حجاب نسائیت“ (یا پردہ پوشیزگی) بھی کہا جاتا ہے۔ جسم کے دوسرے شگافوں کی طرح یہ شگاف بھی چند مہینے میں بھر جاتا ہے، بعض مستورات میں پیدائشی طور پر اس ”پردے کا وجود“ نہیں ہوتا، تو یہ ان کی بدکاری کی علامت نہیں۔ مجھ سے بہت سے مرد اپنی بیویوں کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ میری ڈاک کا دس فیصدی حصہ اسی قسم کے خطوط پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب میں کسی شوہر سے دریافت کرتا ہوں کہ بیوی پر شک کی کیا وجہ ہے تو وہ کوئی مستند ثبوت یا چشم دید شہادت پیش کرنے کی بجائے علامات و پوشیزگی کی داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ پوشیزگی کی علامات کیا ہیں، اور کیا نہیں ہیں۔ ع۔ ع تم ہرگز مستقبل کی طرف سے فکر مند نہ ہو۔ تم آج بھی اتنی ہی پاک و پاکیزہ اور مقدس و معصوم ہو۔ جتنی اپنی پیدائش کے لمحہ اول میں تھیں۔ یہ کہنا محض شاعرانہ مبالغہ آفرینی ہے، کہ گوہر عصمت کی آب ایک بار اتر جائے تو پھر دوبارہ تابدار نہیں ہو سکتا، یقیناً ہو سکتا ہے۔ ہمارے جسم کے اندر خود ایسا میکا نزم اور نظام کار فرما ہے۔ جو ہر زخم کو رفو کرتا رہتا ہے۔ ع۔ ع تم میں نشان عصمت موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

شراب اور عیاشی

ق۔ ل لکھتے ہیں کہ

ہمارا خاندان ملتان کے ایک مضافاتی گاؤں میں آباد ہے۔ خدا کے فضل سے

اچھی خاصی زمینداری ہے۔ ہمارا شمار علاقے کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ دادا جان نے ابا جان کی شادی ان کی ناپسندیدہ جگہ کر دی۔ یہ سب کچھ برادری کے دباؤ میں کیا گیا۔ ابا جان کبھی میری امی سے مانوس نہیں ہو سکے۔ کیونکہ وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے، یہ رشتہ انہیں منظور نہ تھا۔ (مگر اس سلسلہ میں امی کا کیا قصور تھا؟) ابا جان نے اپنی بیوی (میری بد نصیب ماں) پر اتنی زیادتیاں کیں کہ وہ پاگل ہو گئیں۔ اسی زمانے میں راقم الحروف کی ولادت بے سعادت واقع ہوئی، میں نے جب ہوش سنبھالا۔ تو امی نے ان تمام مظالم کا تفصیلی ذکر کیا۔ جو اس گھر میں ان پر روا رکھے گئے تھے۔ وہ اس داستان غم کو سنا کر خود بھی روتیں اور مجھے بھی رلاتیں۔ ماں بیٹے ساون بھادوں بن جاتے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مجھے ملتان بھیج دیا گیا۔ جب میں نے گھر کے محدود ماحول سے نکل کر باہر کی دنیا میں سانس لیا، میری نگاہیں اس کے جلوؤں سے خیرہ ہو گئیں۔ گھر سے میرا ذہنی رشتہ بالکل کٹ گیا۔ والد صاحب سے بھی کھنچا کھنچا رہنے لگا ایک بوجھ سینے پر دھرا ہوا ہے۔ (من بھر کی سل) جب مجھے ملتان میں خبر ملتی کہ ابا جان گاؤں سے آرہے ہیں، تو بے چین ہو جاتا، کبھی کبھی اندر سے خواہش ابھرتی کہ کاش ان کی کار کا ایکسٹینٹ ہو جائے۔ وہ مرجائیں، ہلاک ہو جائیں۔ (لاحول ولا قوۃ) کبھی جی چاہتا کہ ان کو زہر دے دوں۔ البتہ بعض اوقات باپ کی طرف بے اختیار کھنچ جاتا ہوں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے (اس ذہنی پس منظر) کی تفصیل بیان کرنے کے بعد (ق۔ ل لکھتے ہیں کہ) چند روز قبل ابا جان نے میری منگنی ایسی جگہ کر دی ہے۔ جو میرے لئے قطعاً قابل قبول نہیں، میں اس رشتے سے نفرت کرتا ہوں۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کے فیصلے اٹل ہوا کرتے ہیں۔ خیر یونہی سہی ابا جان وہاں میری شادی کر دیں، میں کیا کروں گا، شادی کے بعد ڈٹ کر عیاشی کروں گا۔ شراب پی کر غم غلط کیا جائے گا۔ آخر مجھے ناپسندیدہ شادی کا انتقام تو لینا ہی ہے جی ہاں! میرا جی نہ چاہے گا۔ کہ میرا ایک خوبصورت گھر ہو، دلنواز بیوی ہو، پرسکون خاندانی ماحول ہو، میں

قوت ارادی سے لبریز ہوں۔ ہرگز میرا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو ڈر کر خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ میں خودکشی کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ (اور بہت کہنے کے بعد لکھتے ہیں کہ) مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے مگر میں نے کبھی اس سے اظہار عشق نہیں کیا، وہ بھی چاہتی ہے کہ میں چاہوں۔ لیکن میں اسے بھول بھی سکتا ہوں۔ ہاں ایک بات تو بتانی رہ گئی ہے، میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ مجھے ہاتھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ جی نہیں میری عمر انیس سال کی ہے۔ گزارش یہ ہے کہ آپ مجھے بالکل صحیح مشورہ دیں، میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں گا۔

کاش صرف ایک بار

عزیز القدر (ق۔ ل) تم نے (تمہاری اپنی تحریر کے مطابق) بڑے ناسازگار ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں، باپ کی ناپسند شادی، ماں پر ان کے مظالم، تمہاری باپ سے نفرت اور پھر یہ اُن مل بے جوڑ منگنی ق۔ ل تمہارے مصائب کا ذمہ دار کون ہے تمہارے دادا جان (والد نہیں) حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ خاندانی رسم و رواج اور برادری کے دباؤ سے مجبور ہو کر انہوں نے تمہارے والد کی شادی ان کی پسند کے برخلاف کر دی۔ یہ بڑا جذباتی سانحہ تھا، اس سانحہ نے تمہارے والدین کی زندگی کو زہر آلود کر دیا۔ والدہ عمر بھر روتی رہیں، اور تم جس عذاب میں مبتلا ہو، وہ ظاہر ہے۔ تمہارے والد بزرگوار نے (بقول تمہارے) اپنی محرومیوں کا انتقام تمہاری امی سے لیا۔ کاش تمہارے والد حقیقت پسندی سے کام لے کر والد (تمہارے دادا جان) سے کہہ دیتے کہ میں خاندانی رسم و رواج پر عمل کرنے کے بجائے احکام شریعت پر چلوں گا۔ اور ہرگز ایک ایسی عورت کو اپنے پہلو میں جگہ نہ دوں گا۔ جس کی سینے میں جگہ نہیں، ناپسند رشتے دیمک کی طرح رگوں کو چاٹ جاتے ہیں۔ کاش اے کاش۔ تمہارے والد ایک مرتبہ اپنے والد ماجد کی ضد کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے کاش وہ ایک مرتبہ اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر دیتے۔ مگر تمہارے والد نے ایسا نہیں کیا اور عمر بھر کی

تباہی مول لے لی۔ خود بیزار، بیوی انگبار، اور بیٹا بغاوت پر تیار! ق۔ ل تمہارا دعویٰ ہے کہ میں قوت ارادی سے لبریز ہوں۔ اگر یہ سچ ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ تم اپنے حق کے لئے آواز نہیں بلند کرتے؟ یہ تمہارا حق ہے کہ تمہاری شادی وہیں کی جائے جہاں تم چاہتے ہو۔ اس حق کو شریعت نے تسلیم کیا ہے، معاشرے اور قانون نے تسلیم کیا ہے۔ عقل سلیم نے کیا ہے؟ جو حق اس قدر مسلم و مصدقہ ہوا۔ اس سے دستبردار ہو جانے کی کیا ٹنگ ہے۔ ق۔ ل۔ ماشاء اللہ تم حقیقت پسند ہو، مگر تم نے جو علاج سوچا ہے۔ وہ سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہے۔ تم نے یہ علاج سوچا ہے، کہ میں ناپسندیدہ شادی کی تکنیوں کا ازالہ شراب اور عیاشی سے کر دوں گا۔ یہ کیا علاج ہوا؟ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی تپ دق کے جراثیم کو تباہ کرنے کے لئے سرطان (کینسر) کے جرثومے بذریعہ انجکشن اپنے جسم میں داخل کر لے۔ بیشک سرطان کے جراثیم تپ دق (T.B) کے جراثیم کو فٹل لیں گے۔ لیکن تمہارے پیچھے دوں کو خود چاٹ جائیں گے۔ نہ شراب پسندیدہ بیوی کا نعم البدل ہو سکتی ہے، نہ عیاشی سے ازدواجی زندگی کی سرتمیں نصیب ہو سکتی ہیں۔ ق۔ ل۔ ایک بار صرف ایک بار کلمہ حق بلند کر دو۔ (یعنی میں وہیں شادی کر دوں گا جہاں چاہتا ہوں) اس عمر بھر کی نختیوں اور تکنیوں سے نجات پا جاؤ گے۔ میں یہ مشورہ نہیں دوں گا میں ہرگز یہ مشورہ نہیں دوں گا تم والد بزرگوار سے بغاوت کر دو، ہرگز نہیں۔ اس سے زیادہ بدبختی کیا ہوگی۔ کہ تم ”پسرنوح“ بن جاؤ۔ لاحول ولاقوۃ۔ صرف اتنا کرو کہ بذریعہ تحریر اپنے والد کو مطلع کر دو، کہ بابا آپ نے اپنے والد کی ضد پر عمل کر کے عمر بھر کی تباہی مول لی۔ خدا را مجھے اس ہلاکت میں مت ڈالیں۔ ق۔ ل۔ تم میرے مشورے پر عمل کرو گے نا؟

بے رنگ مادہ

اس مضمون کے مطالعہ نے مجھے اپنے نفس پر قابو پانے میں بڑی مدد کی ہے۔ میں زندگی کے اٹھارہویں منزل سے گزر رہا ہوں۔ ایف ایس سی کا طالب علم ہوں۔ چند روز سے عجب مشکل میں پھنسا ہوا ہوں، پڑھتے پڑھتے اچانک سر بھاری ہونے لگتا ہے

جو کچھ پڑھتا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کتاب پڑھ کر بستر پر لیٹ جاتا ہوں، نیند آ جاتی ہے تو بہت گندے خواب نظر آتے ہیں۔ جب آنکھ کھلتی ہے تو اپنے کپڑے ناپاک پاتا ہوں۔ یہ مادہ شفاف اور بے رنگ ہوتا ہے، اور اس میں کچھ بے رنگ گچھے سے ہوتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جب یہ مادہ خارج ہوتا ہے تو طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ (آپ کا روحانی بیٹا۔ ن۔ الف لاہور)

برخوردار!

برخوردار! اٹھارہ برس کی عمر میں جسم سے اگر بے رنگ اور شفاف مادہ خارج نہ ہوگا تو کیا خون ٹپکے گا۔ سوتے میں تمہیں احتلام ہو جاتا ہے، یہ بلوغت کی علامت اور مرد بن جانے کی نشانی ہے۔ اس شفاف اور بے رنگ مادے کے اخراج کے بعد تمہاری طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ ن۔ الف تم سمجھ بھی کیا بات ہے۔ اب تمہارے جسم کے غدود پوری طرح کام کرنے لگے ہیں، یہ مادہ انہیں مردانہ غدود کی پیداوار ہے۔ تم جذباتی بیجان میں مبتلا ہو اور جوانی میں جذباتی بیجان اتنا ہی فطری اور قدرتی ہے۔ جتنا موسم گرما میں لو چلنا! اگر تم غلغلہ نور اور خود نوہی کی مشقیں کر لو۔ تو اس جذباتی بیجان پر (جس کے سبب سر بھاری ہونے لگتا ہے۔ حافظہ معطل ہو جاتا ہے، کتاب پڑھنے کو جی نہیں چاہتا) رفتہ رفتہ غالب آ جاؤ گے۔

خودکشی یا قتل

م۔ الف کا بیان ہے کہ

میری عمر تقریباً سولہ سال کی ہے، میں احساس کتری کا مریض ہوں۔ میری والدہ بچپن ہی میں مجھے چھوڑ کر چلی گئیں، دوسری شادی رچالی۔ والدہ کی علیحدگی کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب مستقل بیمار رہتے تھے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہوں، میرے علاوہ تین بہنیں ہیں۔ مجھے بچپن سے ماں کا پیار نہیں ملا دوسرے بچوں کے لاڈ پیار اور ان کی ماؤں کی مامتا دیکھ کر اندر ہی اندر جلتا کڑھتا رہا، اس جلتن اور کڑھنے نے صحت کو گھن

لگا دیا۔ بہنوں کو میری پروا نہیں، وہ مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتیں۔ والد صاحب نے مشکل سے میٹرک تک تعلیم دلائی ہے، پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ لیکن گھریلو حالات کے سبب تعلیم جاری رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ غربت کے سبب اچھے کپڑے پہن نہیں سکتا، بازار میں نکلتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص کی نگاہیں میرے گھٹیا کپڑوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ میں اندر ہی اندر شرم سے پانی ہو جاتا ہوں، اور احساس کمتری سے تنگ آ کر میں نے کسی سے دوستی کرنی چاہی تو دنیا بھر میں کوئی شخص ایسا نہ ملا جو مجھ سے دوستی کرنے کو تیار ہو، دوستوں سے مایوس ہو کر میں نے کوئی سہارا ڈھونڈنا چاہا۔ ہمارے مکان کے نچلے حصے میں کرائے دار رہتے ہیں۔ ایک خوبصورت عورت جو تین بچوں کی ماں ہے میں نے اس سے متا (مادرانہ محبت) کی بھیک مانگی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھی، مجھ سے دور بھاگنے لگی۔ اب وہ مجھ سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں اس کا یہ طرز عمل دیکھ کر میں نے انتقام بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔ وہ اسی کی مستحق ہے میں لوگوں سے تنگ آ گیا۔ جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں، یا سب کو قتل کر دوں۔ میرا نام شائع نہ کریں۔ صرف م۔ الف لکھیں۔

(آپ کا فرزند)

اے فرزند

تم نے ”آپ کا فرزند“ لکھا ہے تو اے فرزند خودکشی مینڈک کیا کرتے ہیں۔ (شاید وہ بھی نہیں کرتے) اور قتل بچھو (وہ بھی دانستہ یا نادانستہ) لہذا یہ دونوں باتیں خارج از بحث ہیں۔ تم نے بد نصیبی کی چھاؤں میں پرورش پائی ہے۔ والد مستقل بیمار رہتے تھے یا رہتے ہیں اور والدہ نے تمہیں بے سہارا چھوڑ کر دوسری شادی رچائی۔ کیا یہ قیامت خیز سانحہ نہیں ہے، حساس بچے پر ان باتوں کا کیا اثر پڑے گا۔ اے فرزند! تمہاری احساس کمتری بے سبب نہیں۔ تم اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، تمہیں زندگی کی کوئی مسرت نصیب نہیں ہوئی۔ حد یہ ہے کہ تمہارے خیال میں تمہاری بہنوں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا، جس کا تم اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔ تھیک ہے میں تمہیں احساس کمتری

پر ملامت نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات سوچو، تم اس کا خود فیصلہ کرو، میں اپنی رائے بعد میں دوں گا۔ تم اس وقت دو راستے اختیار کر سکتے ہو۔ یا تو احساس کمتری سے سمجھوتہ کر کے ہمیشہ کے لئے معذور و مجبور بنے رہو۔ یا احساس کمتری پر غالب آ کر برتر بننے کی کوشش کرو۔ اے فرزند میں نے مشاہیر عالم کی اکثر سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان مشاہیر کا تعلق مذہب سے ہو یا سیاست سے، سائنس سے ہو یا تجارت سے! سب کی زندگی میں ایک بات مشترک پائی۔ یہ سب بچپن میں کسی نہ کسی وجہ سے ”احساس کمتری“ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اے فرزند! اگر یہ تمہاری طرح خودکشی کر لیتے یا قتل کر ڈالنے کی فکر تک محدود رہتے تو ہم انسانی تاریخ کے کتنے عظیم کارناموں سے محروم رہ جاتے۔ م۔ الف اب وہ لمحہ آن پہنچا ہے کہ تمہاری شخصیت کی تشکیل نو کی جائے تم نے احساس کمتری کے جو اسباب بیان کئے ہیں ان کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ تم محسوس کرتے ہو کہ میں ہمیشہ محبت سے محروم رہا ہوں۔ اور یہ کہ نہ ماں نے میری پروا کی، نہ باپ نے، نہ بہنوں نے! بے شک محبت سے محرومی انسانی نفس کے اندر کمتری کا احساس پیدا کر دیتی ہے آدمی سمجھتا ہے کہ ضرور اس میں کوئی کمی ہے کہ لوگ اس کے قریب نہیں آتے تاہم تم اس شدید احساس پر غالب آ سکتے ہو۔ طرز فکر اور سوچ کے ڈھنگ کو بدلنا۔ بے شک آسان کام نہیں ہے۔ ہم فرشتہ بھی بن سکتے ہیں، شیطان بھی البتہ انسان بننا دشوار ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

سچا انسان وہ ہے جو اپنی خامیوں اور خوبیوں پر نظر رکھتا ہو۔ بیک وقت خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھنے سے حقیقت پسندی پیدا ہوتی ہے، اور یہی حقیقت پسندی زندگی کی تاریک گھاٹیوں میں مشعل لے کر آگے چلتی ہے۔ م۔ الف تم نے اپنے کو میری فرزندگی میں دے دیا۔ میں اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں، اب تم مجھ سے براہ راست خط و کتابت کرو میں تمہارے لئے ایک ہدایت نامہ مرتب کر سکوں۔

بات کا بتنگڑ

س۔ ط پ (ٹنڈو آدم) آر۔ ایچ۔ خان (کراچی) ع (کوئٹہ) ر۔ ر۔ ر۔
(بد نصیب لڑکا) اور نہ جانے کتنے بد نصیب لڑکے (بقول خود) اور بد نصیب لڑکیاں ایک ایسے وہم میں مبتلا ہیں۔ جس میں ننانوے فیصدی افراد مبتلا ہوتے ہیں۔ یعنی جسم کے ذریعہ لذت اندوزی کا خوف! سب سے پہلے تو یہ نصیحت گرہ باندھ لیجئے کہ یہ کوئی بیماری نہیں، کثرت چائے نوشی کی طرح محض ایک عادت یا ایک کھیل ہے۔ ہر مشغلے کی کثرت نقصان دہ ہوتی ہے۔ مگر نہ اس حد تک کہ عمر بھر کے لئے آدمی کو ناکارہ کر دے، ہمارے ہاں زندگی کے اس پہلو (SEX) کی نسبت سائنسی معلومات کی اتنی کمی ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ (بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں) اور بڑی بڑی غلط فہمیوں کو جہالت کے سبب نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مثلاً ناپسندیدہ شادی انسانی زندگی کی سب سے زیادہ ہلاک کردینے والی غلطی ہے، جس کی تلافی عمر بھر ممکن نہیں کر سکتے لیکن ہم اولاد کے رشتے طے کرتے وقت ان کی پسند و ناپسند کا خیال نہیں کرتے ان پر اپنی مرضی چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ (اس مضمون میں ق۔ ل کا خط پڑھ لیں) لڑکے اور لڑکیوں کی کج روی کا ایک دور ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی اکثریت بہت جلد اس تجربے سے اکتا جاتی ہے۔ البتہ دس پندرہ فیصدی افراد پر مستقل طور پر اس عادت بد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جسمانی لحاظ سے کہیں زیادہ ان کے ذہنی علاج کی ضرورت ہے۔ میں خود ہزاروں جنسی مریضوں کو مشورہ دے چکا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ میرا ہر مشورہ مؤثر ثابت ہوتا ہو، اگر سو نوجوانوں کو مشورہ دیا جائے تو ان میں ستر فیصدی ضرور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نوجوانوں کے دلوں پر جو دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اسے دور کیا جائے، اور انہیں بتایا جائے اور سمجھایا جائے کہ جنسی کج روی اسی طرح نفسیاتی معمولات میں داخل ہے۔ جس طرح غذائی بے احتیاطی۔ فاقے سے غذائی بے احتیاطی کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ اور جنسی کج

روی ترک کر دینے سے اس عادت کے نقصانات کو دور کرنا ممکن ہے۔ اگر کوئی پیدائشی خرابی نہ ہو تو ہر شخص بھرپور جنسی زندگی بسر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، میں خود لذتی کے مریضوں کو S.C.T کی مشقیں کرایا کرتا ہوں، تجربہ یہ ہے کہ انجام کار ان مشقوں کی بدولت آدمی میں (لڑکی ہو یا لڑکا) اتنی خود اعتمادی اور خودداری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس پریشان کن عادت کو ترک کر سکے۔

متفرقات

ش۔ ن! بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ تمہیں گھر میں لوگ تنگ کرتے ہیں پاگل اور دیوانی کہتے ہیں۔ تمہیں مغرور اور چڑچڑی کے خطابات دیئے گئے ہیں۔ سب کے سامنے تمہیں جاہل کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ بی بی! واقعی یہ تمام باتیں سخت پریشان کن ہیں، لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر گھر والے (یہاں تک کہ امی بھی) تمہارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ س۔ م آخر اس کا کوئی سبب ضرور ہوگا۔ بہر حال بی بی! مجھے پوچھنا یہ ہے کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ س۔ رخ (جامعہ پنجاب، لاہور) عضو میں کبھی اگر پیدائشی ہو تو قطعاً پریشان کن نہیں اور نہ کبھی سے ازدواجی مشاغل میں کوئی فرق پڑ سکتا ہے آپ ہرگز پریشان نہ ہوں اور مجھ سے رابطہ قائم رکھیں۔ م۔ احمد راولپنڈی اپنے بعض حالات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب میں بدی سے نیکی کی طرف آتا ہوں تو خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دیتا ہوں، نماز میں خدا کو حاضر و ناظر محسوس کرتا ہوں اور نماز میں پڑھی جانے والی آیات قرآنی کے ایک ایک لفظ کا مفہوم اور اس کے معنی میرے سامنے ہوتے ہیں۔ (حالانکہ میں عربی نہیں جانتا)۔ اس زمانہ پاک بازی میں صاف طور پر محسوس کرتا ہوں کہ خدائی رنگ میں رنگ گیا ہوں۔ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق روز بروز میرے شوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے بیان نہیں کر سکتا، کہ ذوق و شوق سے ادا کی جانے والی نمازوں میں کتنا سرور ملتا ہے! نماز تہجد میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں صرف روح ہوں، میرا جسم پھول کی طرح ہلکا، معطر اور نرم

ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لہر ذہن میں اٹھتی ہے کہ یہ ساری دنیا میرے لئے ہی پیدا کی گئی ہے چند بار کشف کی حالت بھی طاری ہوئی۔ نماز عصر پڑھ رہا تھا، دیکھا کہ رسول اکرم ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ اس طرح کے بہت سے واقعات میرے ساتھ پیش آتے ہیں م۔ احمد نے اس طرح کے بہت سے واقعات لکھے ہیں اور سوال کیا ہے کہ میں اپنے نفس کی شرارتوں پر کس طرح غالب آؤں؟ م۔ احمد دعا کی اہمیت سے بے خبر نہیں (انہوں نے خود اپنے خط میں اس کا ذکر کیا ہے) وہ دعا کیوں نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ ان کے نفس کو اس قدر پاک و پاکیزہ کر دے کہ بدی کی طرف رجحان ہی نہ ہو۔ وہ ہی اپنے لئے دعا کریں۔ میں بھی ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔ محمد اقبال ذکر کیا (فلیٹ نمبر 28، حور مارکیٹ، ناظم آباد نمبر 2 کراچی 18) S.C.T کی مشقیں تجویز کر کے بھیج دی جائیں گی، اور ان کی بذریعہ خط و کتاب رہنمائی کی جاتی رہے گی۔ مسعود صادق جس قدر جلد اپنے دوست کے دام محبت سے آزاد ہو جائیں، اتنا ہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید

جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

سہیل جبار کراچی، مسئلہ عجیب ہے، ایک مرتبہ انہوں نے ایک وارشل (رنگ)

کو اس پوزیشن میں دھکا دیا کہ وہ پیسے کی طرح گھومتا ہوا کافی دور تک چلا گیا، اور اس کی مخصوص آواز دیر تک سنائی دیتی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی دماغی کام میں مصروف ہوتے ہیں رنگ کے چلنے کی وہی آواز سنائی دینے لگی ہے، دو بہترین ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں۔ اب میری طرف رجوع ہوئے ہیں۔ سہیل جبار کو مشورہ دوں گا کہ وہ 70556 پر فون کر کے مجھ سے ملاقات کا وقت لے لیں۔ خان محمد نجیب خان، کراچی جب سے مشرقی پاکستان سے کراچی آئے ہیں۔ پیٹ کی شکایت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور منہ سے عجیب سے بو آتی ہے۔ حالانکہ مشرقی پاکستان میں معدہ بھی درست تھا اور منہ سے بدبو نہ آتی تھی۔ بہت علاج کرائے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نجیب صاحب کو

مشورہ دوں گا کہ مایوس نہ ہوں۔ کسی حاذق طبیب سے علاج کرائیں۔ مجھے صحت کی امید ہے۔ نجیب صاحب کا زکام بگڑ گیا، یہ امر بھی قابل توجہ ہے۔ فریدہ (کوئٹہ) نے لکھا ہے کہ وہ محبت سے محرومی کے سبب احساس کمتری کی مریضہ بن گئی ہیں۔ میں نے اس مضمون میں احساس کمتری کی وجوہ پر بحث کی ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھیں بے شک میری کتابوں کا مطالعہ ان کے لئے مفید ہوگا۔ فی الحال وہ اتنا کریں کہ شب میں سوتے وقت جتنی مرتبہ دہرائیں یہ فقرہ دہرائیں ”میرے اندر بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ میں ہر مشکل پر غالب آتی جا رہی ہوں“ یہ فقرہ اوقات فرصت میں بھی بار بار دہرایا کریں۔ یہاں تک کہ ان کی روح سے یہ فقرہ چپک کر رہ جائے، مجھے حالات سے برابر مطلع کرتی رہیں، ایک اور بیٹی (وہی بہنوئی اور کزن والا معاملہ) سے مجھے کہنا ہے کہ آج بھی تم میں وہی آب و تاب ہے۔ جتنی ان حادثات سے پہلے تھی وہ ڈاکٹر سے ضرور شادی کر لیں۔ وہ جس اندیشے میں مبتلا ہیں وہ بے بنیاد، بے اصل ہے۔ وہ ڈاکٹر بہترین رفیق حیات ثابت ہوگا، یا سیمین اعظم میری کتاب تو جہات اور مراقبہ کا مطالعہ کریں۔ اس کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات سے مطلع کریں، یہاں وہ مجھے دوست کے والدین تعلیم مکمل کرنے سے قبل ان کی شادی پر مصر ہیں ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ہرگز تعلیمی کیریئر کو تباہ نہ کریں، شادی ہوتی رہے گی۔ اصل شے تعلیم اور صرف تعلیم اور تعلیم ہے۔ شیر افضل پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ میرے نام ارسال کریں، تاکہ براہ راست جواب دے سکوں۔ افسوسناک سلوک کیا گیا ہے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی گئی اور تمہیں آٹھ سال بعد ٹھکرا دیا گیا۔ بی بی! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ سی۔ ایف۔ ایس (اسلام آباد) جس عادت میں مبتلا ہیں۔ انشاء اللہ شادی کے بعد اس کا بھولے سے بھی خیال نہ آئے گا۔ مطمئن رہیں میرے سندھی دوست (کشور، جیکب آباد) کوئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص بھائی کی طرح ان کی خدمات اور سرپرستی کرتا ہے۔ تو اس پر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ رخ۔ الف جذبات انگیز

اور سخت فحش لٹریچر پڑھ کر جس عادت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسی مسئلہ پر اس مضمون میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان الجھنوں کی عقدہ کشائی صرف S.C.T کی مشقوں سے طلب کرنے والوں کی تعداد اتنی ہوتی ہے۔ کہ ایک شمارے (یعنی ایک مضمون) میں سب کو جواب دینا ممکن نہیں۔ لامحالہ آپ حضرات کو جواب کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں اس سلسلہ میں معذور ہوں۔ آپ براہ راست خط و کتابت کیوں نہیں کرتے؟

روح کا جنازہ

میں بار خاطر نہیں بنوں گی۔ مگر تھوڑی سی تمہید کے بغیر اظہار ممکن نہیں ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی بہن، پھر دو بھائی، پھر چھوٹا بھائی، بڑی بہن مجھ سے عمر میں اٹھارہ سال زائد ہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو میری عمر صرف چھ سال کی تھی، مجھے باجی کی شادی بھی اچھی طرح یاد نہیں۔ لگتا ہے جیسے خواب دیکھا تھا۔ 1958ء میں بڑی بہن ہمیں داغ ملا وقت دے۔ ہمیں ان کے جنازے کے ساتھ گویا میری روح کا جنازہ بھی لگ گیا۔ میرا چہرہ پھرنا لاشہ میرے جذبات کا دفن بن کر رہ گیا۔ ان کی موت کا ماتم تو سب نے کیا لیکن میں اپنی موت کا ماتم خود بھی نہ کر سکی۔ مرحوم بہن کے یادگار دو بچے تھے، ایک کی عمر سولہ سال کی ہوگی۔ دوسرے کی یہی چودہ سال! اگر ان کے والد صاحب عجلت سے کام نہ لیتے تو ان کا لڑکا دو سال بعد شادی کے قابل ہو جاتا اور گھر سنبھل جاتا۔ ایسا نہیں ہوا اور انہیں رٹ لگ گئی، بیاہ، بیاہ پھر کیا ہوا رئیس صاحب! کچھ نہ پوچھے اگر کہیں دوسری جگہ عقد کیا جاتا تو سوتیلی ماں کا ہوا کھڑا ہو جاتا۔ لہذا سگی خالہ ہونے کے ناطے نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ میں نے اس ناپسند تجویز کے خلاف بہت احتجاج کیا۔ بھوک ہڑتال کی، خودکشی کرنے تک کی دھمکی دی۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔ خیال کیجئے۔ میری اور ان (بہنوں) کی عمر میں کتنا فرق ہوگا۔ میں نے ہوش سنبھال کر جس شخص کو بہنوں کے روپ میں دیکھا۔ اس کو شوہر کی حیثیت سے ذہن

کس طرح قبول کر لیتا؟ آہ میری کسی نے ایک نہ سنی خاندان کی عزت کے واسطے دیئے گئے۔ اس المیے کا سب سے زیادہ دل خراش پہلو یہ ہے کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے من کے مندر کے سنگھاسن پر..... کو دیوتا بنا کر سجایا تھا آخر وہ منحوس دن آ ہی گیا۔ وہ سب کچھ ہو گیا جو میں نہ چاہتی تھی دو بھانجوں کے لئے خالہ کی قربانی پیش کر دی گئی۔ آخر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ مگر چپ ہونے سے دل کی آگ تو نہیں بجھتی۔ میں مسلسل سلگ رہی ہوں، اب میں بہن (مرحومہ) کے گھر میں سوکن کی حیثیت سے موجود ہوں۔ یہ تصور کس قدر دردناک، نہ خود خوش رہ سکی نہ دوسروں کو خوشیاں دے سکی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شر و فساد برپا نہیں ہے۔ بس سناٹا چھایا ہوا ہے گھر میں! مجھے چپ سی لگ گئی۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے بچوں کو کبھی تکلیف نہیں ہونے دی۔ ان کی خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم رکھا، اپنی کسی ضرورت کو ان کی ضرورت پر ترجیح نہیں دی۔ اس کا اعتراف خود بھانجے بھی کرتے ہیں، کمی تو صرف مامتا بھرے الفاظ کی۔ یہ الفاظ بھی میری زبان سے نہیں نکلتے۔ یقین کیجئے کہ ان بچوں کے لئے میرے سینے میں مامتا بھرے جذبات ہیں لیکن انہیں لفظوں میں کس طرح ادا کروں۔ کیونکہ میں نے اپنے بھانجوں سے سات اور نو سال بڑی ہوں یہی کم عمری مامتا بھرے اظہار میں حائل ہے۔ لیکن یہ کوئی اتنا بڑا قصور نہیں تھا، کہ اس کی اتنی بڑی سزا دی جاتی کہ میرے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا جاتا۔ بڑے لڑکے کی شادی ہو چکی ہے، میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ وہ اور ان کی دہن خوش و خرم رہیں۔ دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں دونوں جہاں کے سکھ دے۔ لیکن نہ جانے میری بہو کو مجھ سے کیا عداوت ہو گئی ہے (اس کے بعد ان خاتون نے تفصیل کے ساتھ اپنی بہو کی بدسلوکی کی کہانی لکھی ہے) اور سوال کیا رئیس صاحب! کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ مجھے صبر آجائے!

ٹیرھی اینٹ

اے خاتون! دیوار کی پہلی اینٹ ٹیرھی رکھ دی جائے تو کبھی چھت تک چلی

جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی روح کا جنازہ۔ آپ کے ڈولے کے ساتھ نکل گیا تھا۔ ہمارا معاشرہ اب تک قرون وسطیٰ کی ازدواجی رسوں سے آزاد نہیں ہوا لڑکا اور لڑکی ابھی جوان نہیں ہو پاتے کہ لوگوں کو رٹ لگ جاتی ہے۔ بیاہ، بیاہ، بیاہ ہمارے یہاں شادی کی عمر کا تعین لڑکیوں کے سلسلے میں سولہ سال اور لڑکوں کے سلسلے میں 20 سال کیا گیا ہے۔ حالانکہ بیس اور تیس سال کی نسبت ہونی چاہئے۔ لہن کی عمر 20 سے 22 تک کی ہو اور دولہا کی 27 سے 30 تک! اے خاتون! مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی بہو (انجینئر کی بیوی) کی بدسلوکی کا سبب کیا ہے۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ کی قربانی رائیگاں گئی، رہا آپ کا یہ بیان کہ وہ تعویذ گنڈوں اور جادو کے زور سے آپ پر حملہ آور ہے۔ تو میں اسے بد قسمتی ہی کہوں گا۔ دراصل انسان جب پریشانیوں اور مشکلات کا حل شعوری کوششوں سے نہیں کر سکتے تو انہیں جادو یا کسی غیبی محسوس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس طرح جی تو ضرور ہلکا ہو جاتا ہے لیکن کوئی گتھی سلجھتی نہیں۔ آپ کے والدین نے ظلم کیا آپ کے شدید احتجاج کے باوجود بھڑکی سے بیاہ دیا۔ شادی کوئی مشینی رشتہ نہیں۔ جذباتی رشتہ ہے، اگر وہ ہستیوں کے درمیان تعلق خاطر نہیں تو ہرگز ہرگز انہیں عقد کے عقدے میں نہیں پھنسانا چاہئے مسئلہ فقط بہو کی بدسلوکی کا نہیں ہے۔ بات اس سے زیادہ گہری ہے، آپ عقد کے پہلے دن (یا پہلی رات) سے جراثیم رسیدہ ہیں اور ذرا ٹھیس لگ جائے تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے برچھا مار دیا۔ اے خاتون! صبر کی تلقین کرنے سے کسی کو صبر نہیں آتا صرف حقیقت پسندی سے صبر کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ آپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیجئے۔ کہ آپ ایک ناگہانی حادثہ (یہ عقد ثانی ناگہانی حادثہ ہی تو تھا) کی زد میں آگئی ہیں اگر میرے اختیار میں ہوتا۔ تو میں آپ کے ذہن کو بدل دیتا، ماحول کو تبدیل کر دیتا، بہو کو سمجھاتا، آپ کے بڑے بھانجے کو آپ کی روحانی شکستوں سے آگاہ کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اس مظلوم عورت کے مصائب میں اضافے کا سبب نہ بنے۔ مگر آہ۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی میرے امکان میں نہیں۔

بہر حال آپ مجھ سے رابطہ رکھیں۔ کم سے کم ایک ٹمگلر تو ہونا چاہئے! میں یقیناً آپ کے غم میں شریک ہوں۔
رفع غم ممکن نہیں ہے شرکت غم کیجیے
اور ہر ماتم زدہ کے ساتھ ماتم کیجیے

خون میں لت پت

آپ شاید اسے پاگل پن پر محمول کریں، مگر یقین کیجئے۔ یہ کیفیت بناوٹی نہیں ہے، کسی حادثے کے بارے میں سنتی ہوں تو گھنٹوں اس کا خیال رہتا ہے گو اس حادثے کا مجھ سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی کی معمولی تکلیف پر بھی دل تڑپ اٹھتا ہے۔ قیمتی کپڑے پہنتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جن کے تن پوشی کے لئے چھتھرے بھی میسر نہیں۔ سردیوں میں خیال رہتا ہے کہ نہ جانے اس وقت کتنے لوگ ٹھٹھرے بھی ہوں گے۔ اس وقت سویٹر اتار کر لحاف تک پھینک دیجی ہوں اور اکڑنے لگتی ہوں کہ روحانی اور جسمانی طور پر سردی زدوں کا ساتھ دے سکوں، کسی بچے کو پیار کروں، تو یتیم بچوں کا تصور ستانے لگتا ہے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں، ہر بات کے متعلق گھنٹوں سوچتی ہوں۔ اکثر یہ کیفیت بے حد شدید ہو جاتی ہے، کبھی بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ کتنی ہی دردناک بات کیوں نہ ہو۔ قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے اور کسی کی پریشانی کا مجھے قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ رئیس صاحب! آپ مجھ کو بتائیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے اکثر خواب میں کسی پیش آنے والے واقعے کا پتا لگ جاتا ہے۔ مثلاً لیاقت پور ریلوے اسٹیشن پر ریلوے کا جو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس سے دو تین مہینے پہلے یہ خواب دیکھا تھا کہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر خون میں لت پت ایک ٹرین کھڑی ہے۔ پلیٹ فارم پر ادھر سے ادھر تک چار پائیاں نکھی ہیں۔ ان پر سفید چادروں سے ڈھکی لاشیں رکھی ہیں۔ پھر منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ کوئی اور آگیا ہے۔ ہم لوگ گورکن کی کوٹھری کے پاس کھڑے ہیں، ایک کھوپڑی دروازے پر لٹکی

ہوئی ہے اندر کارنس پر بے حد خوبصورت اور ماڈرن دولہا دولہن کی تصویر رکھی ہے۔ پھر میں بوڑھے گورکن سے پوچھتی ہوں کہ یہ کون ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میری شادی کی تصویر ہے۔ (ح۔خ کوئٹہ)

روحیت پسند

ح۔خ! تم سچے خواب دیکھتی ہو۔ تم نے لیاقت پور ریلوے اسٹیشن کے حادثہ خونیں سے دو تین مہینے قبل اسے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ اس قسم کو (جیسی تم ہو ح۔خ) روحیت پسند کہتے ہیں۔ روحیت یہ کہ ان لوگوں میں پیدائشی طور پر چھٹی حس بیدار و کارفرما ہوتی ہے۔ یہ لوگ (عورتیں ہوں یا مرد) بے حد حساس اور غیر معمولی طور پر غم پسند دکھ سہنے اور دکھ دے کر خوش ہونے والے ہوتے ہیں۔ ان کے نفس کی گہرائی میں (جس کو اگر کسی آلے سے ناپا جاسکتا ہے) ہمیشہ ایک طوفان برپا رہتا ہے، تم نے اپنی دردمندی اور سوز و گداز قلب کی جو کیفیت لکھی ہے۔ اس سے تمہاری روحیت پسندی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تم کہتی ہو کہ بعض اوقات بالکل برعکس ہوتا ہے یعنی حد سے زیادہ دردناک خبر سن کر تمہارا جی چاہتا ہے کہ تمہارے ماروں۔ تو بی بی یہ بھی غم پسندی ہی کی علامت ہے۔ غم کا اظہار فقط آنسوؤں سے ہی نہیں ہوا کرتا، بسا اوقات قہقہوں سے بھی ہوتا ہے۔ جذبہ غم بے حد رنگا رنگ اور نوبہ نور ہوا کرتا ہے، ہر روز اس کی نئی شان ہوتی ہے۔ اور ہر لمحہ نئی آن بان! ح۔خ! تم بہترین ”روحی معمولہ“ بن سکتی ہو اگر S.C.T کی مشقیں جن کا تعلق نصاب تعمیر و تنظیم شخصیت (سیلف کلچر ٹریننگ کورس) سے ہے۔ صبح و شام دس دس منٹ کرنی پڑتی ہیں اور بذریعہ کھٹ و کتابت رہنمائی اور نگرانی کرتا رہتا ہوں۔ ان مشقوں سے تمہاری شخصیت کے وہ جوہر کھلیں گے، کہ تم خود حیران رہ جاؤ گی۔

ماں یا داشتہ

میرا قیام کسی شہر ایک دور کے رشتہ دار کے یہاں تھا، ان کی بیوی ادھیڑ عمر

نہایت خوبصورت، شیریں بیان اور نہایت جاذب شخصیت کی حامل ہیں۔ لیکن بے اولاد ہیں۔ دونوں میاں بیوی اپنے لاولد ہونے سے بہت رنجیدہ رہتے ہیں۔ ایک رات کا ذکر ہے میں اور وہ خاتون گھر میں تنہا تھے۔ ریڈیو سے نہایت دردناک لوری نشر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی خالی کونکہ کا تصور کر کے رونے لگیں اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ میں نے دلاسا اور تسلی دی اور کہا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھئے۔ میں عمر بھر ماں سمجھ کر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھ سے پہلے سے بے حد مانوس تھیں۔ اب تو کوئی انتہائی نہ رہی، بعد کو پتا چلا کہ یہ خاتون جنہوں نے مجھے بیٹا بنایا ہے، نہایت پست کردار کی مالک ہیں۔ کم سے کم پانچ آدمی ایسے گتوائے گئے، جن کی وہ داشتہ رہ چکی تھیں۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے سب کچھ ان سے کہہ دیا، انہوں نے اقرار کیا اور ہوتے ہوتے وہ میری بھی ”داشتہ“ بن گئیں۔ اس فاحشہ عورت نے مجھے طرح طرح سے استعمال کیا۔ تا آں کہ اسقاط حمل کی نوبت آچینی اب وہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ (ت۔ن۔ صادق آباد)

پر پیچ راستہ

ت۔ن صاحب! اس فاحشہ عورت کے ساتھ آپ کے جذباتی تعلق نے جو پر پیچ راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ اس کا اقتضا تھا کہ وہ آپ کے دل و دماغ پر حادی ہو جائے۔ ابتداء منہ بولی ماں کے رشتہ سے ہوئی۔ اور انتہا محبوبہ پر! کہاں سے چلے کہاں آگئے۔

سمجھے تھے ہم راہ طلب بہت طویل

پہنچے مگر کہاں سے کہاں دو قدم میں ہم

اس عورت کے لئے تو یہ رشتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ بقول آپ کے پانچ کی داشتہ رہ چکی ہے۔ لیکن چونکہ آپ نے کھلاڑی ہیں، لہذا اس کھیل میں الجھ کر رہ گئے۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا ہو؟ تو برادر ممشق کا علاج ہو میوہ پستی کے اصول پر ”بالٹل“ ہونا چاہئے یعنی جذباتی تعلق کا نعم البدل جذباتی تعلق ہو سکتا ہے آپ اسے بھلانے کی کوشش نہ کریں۔ بھلانے سے کوئی بھول نہیں جایا کرتا، مزید یاد آیا کرتا ہے۔ بھلانے کا

واحد طریقہ یہ ہے کہ جس کی یاد کو آپ فراموش کرنا چاہتے ہیں، اسے یاد کیجئے۔ اس کے تصور سے نجات پانے کے لئے زبردستی اس کا تصور قائم کیجئے۔ چند ہفتوں میں آپ نمایاں افادہ محسوس کریں گے۔ اب چند الفاظ اس فاحشہ عورت (بقول خود) کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ آدم کا کوئی بیٹا اور حوا کی کوئی بیٹی ایسی نہیں، جس سے کوئی نہ کوئی لغزش نہ ہوئی ہو، برادر! ذرا سی تحریک پر سو میں سے ننانوے نہیں تو نوے فیصدی عورتیں فاحشہ بن سکتی ہیں۔ نجانے اس دکھیا پر کیا افتاد پڑی کہ بچاری کو بیوی کے ساتھ داشتہ کی زندگی گزارنی پڑی۔ آہ انسان کتنا مظلوم ہوتا ہے اور کتنا معصوم!

مت جھانکیے

میری یہ عادت ہے کہ اپنے اندر جھانکتا اور اپنی خامیوں کو ٹٹولتا رہتا ہوں اپنی بہت خامیوں کو دور کر چکا ہوں۔ (اندر جھانکنے اور خود کو ٹٹولنے کے سبب) البتہ دو خامیاں ایسی ہیں جنہیں کوشش کے باوجود دور نہ کر سکا پہلی کمزوری یہ ہے کہ وقت بے وقت ہنسی آجاتی ہے دوسری نفسیاتی الجھن یہ کہ دوسروں کو گھورنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اللہ ان کمزوریوں سے نجات دلائیے۔ (ن۔ ب۔ لاہور)

بھائی میرے! آپ نے لکھا ہے کہ میں اپنے اندر برابر جھانکتا ہوں اور خود کو ٹٹولتا رہتا ہوں، اس جھانکنے اور ٹٹولنے کے سبب آپ کو اپنی دو خامیاں نظر آئیں۔ (1) وقت بے وقت ہنسا (2) بے سبب گھورنا، آپ نے اس کا علاج دریافت کیا ہے۔ علاج یہ ہے کہ مت جھانکئے، اپنے کو ٹٹولنا چھوڑ دیجئے۔ آپ جس قدر اپنے اندر جھانکیں گے، خود کو ٹٹولیں گے۔ یہ دونوں خامیاں پختہ تر ہوتی چلی جائیں گی اور سنئے! ہمارے ایک انجان بیٹے کے پندرہ سال کی عمر میں مونچھیں نکل آئی ہیں اور قد چھوٹا رہ گیا ہے۔ سوال کیا ہے کیا کروں؟ مونچھیں نکل آئی ہیں تو نکل آنے دو۔ اس چیز کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ اگر قد چھوٹا رہ گیا تو پرواہ نہیں اپنی شخصیت کو بڑا بنانے کی کوشش کرو۔ محمد جمیل کا حافظہ بہت کمزور ہے، لکھتے ہیں دو سال پہلے انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔

خواب دیکھنے کے بعد آنکھ کھل گئی، خواب یاد تھا صبح اٹھا تو ہر چند یاد کیا، خواب یاد نہ آیا۔ اس وقت سے حالت یہ ہے کہ ہر چیز کو بھول جاتا ہوں، کوئی بات ذہن میں نہیں رہتی۔ خدا را میری مدد کریں۔ جمیل صاحب! یادداشت کی کمزوری کا خواب کے بھول جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ خواب تو عموماً بھول ہی جایا کرتے ہیں، حافظے کی خرابی کے سبب کچھ اور ہی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً گہرا جذباتی ہیجان، جو شعور کو زنگ آلود کر دے۔ اس کا علاج S.C.T کی مشقیں ہیں آپ مجھے براہ راست خط لکھیں۔ میں کوئی مناسب مشق تجویز کر دوں گا۔ انشاء اللہ حافظہ بحال ہو جائے گا۔

خلاء میں پرواز

عبدالرشید (ڈملوٹی روڈ، کراچی) لکھتے ہیں کہ بابا سائیں رئیس صاحب! میں آپ کو اپنی عجیب و غریب کیفیت سے مختصراً آگاہ کر رہا ہوں، میری عمر تقریباً سترہ سال ہے اور دسویں جماعت (میڈیکل سائنس) میں سندھی میڈیم کا طالب علم ہوں۔ کیفیت یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہوائی لہروں کے ساتھ آسمان پر اڑ رہا ہوں اور نہ جانے کتنی شدت کے ساتھ باہم فلک سے ٹکرا جاتا ہوں۔ اسی کے ساتھ دماغ میں ایک ایسی زوردار بھیاں آوازیں ابھرتی ہیں کہ کئی گھنٹے کے لئے دماغی توازن کھو بیٹھتا ہوں۔ اس دماغی حالت کے سبب سخت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ یا پھر کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی دماغ کو فولادی ہتھوڑوں سے پیٹ رہا ہے، مہربانی فرما کر اطلاع دیں کہ یہ کون سا مرض ہے۔ عبدالرشید صاحب نے جو اپنی دماغی کیفیت بیان کی ہے، اس کا ظاہری سبب اعصابی کمزوری ہے۔ بے شک نروس بریک ڈاؤن میں یہ کیفیت محسوس ہو سکتی ہے، جس طرح دماغ کو فولادی ہتھوڑوں سے کوئی پیٹ رہا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اس حالت میں اور اس کے بعد مجھے زبردست اعصابی کمزوری محسوس ہوتی ہے، یقیناً ہوتی ہوگی۔ لیکن مابعدالنفیات کے نقطہ نظر سے اس دماغی کیفیت کی ایک اور تشریح بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ پرواز خلائی (جیسے خلاء میں اڑ رہے ہیں) کی کیفیت ان کے مثالی جسم پر

گزرتی ہے اور اسے گوشت پوست کا جسم محسوس کرتا ہے۔ مثالی جسم کے کہتے ہیں، یہ بحث بہت نازک اور باریک ہے۔ روسی سائنسدانوں نے الیکٹرانک آلات سے ثابت کر دیا ہے، کہ مادی چیز کے ارد گرد ایک ہلکے نور ہوتا ہے (اسے وہ حیاتیاتی دائرہ یا بیالوجیکل فیلڈ کہتے ہیں) یہ ہلکے نور ایک طرح کا نورانی جسم مثالی یا جسم لطیف بھی کہا جاتا ہے مثالی جسم ایک روپہلی ڈوری کے ذریعہ گوشت کے جسم یا پیکر خاکی کے ساتھ نختی ہوتا ہے خواب کے عالم یا لاشعوری کی کیفیت میں جسم مثالی پرواز کرتا ہے۔ لیکن بحالت پرواز (پہلی ڈوری کے ذریعہ اس کا تعلق پیکر خاکی سے قائم رہتا ہے جو نئی آدمی جاگنے والا ہوتا ہے، روپہلی ڈوری میں حرکت ہوتی ہے اور جسم مثالی کہیں بھی ہو سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں اپنے مرکز پر واپس آ جاتا ہے۔ البتہ جب موت کی قینچی روپہلی ڈوری کو (جو پیکر نور کو جسم خاکی ملائی ہے) منقطع کر دیتی ہے۔ تو عملاً جسم خاکی سے آزاد ہو جاتا ہے، اسی قطع ہو جانے کو رشتہ حیات کا منقطع ہو جانا کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرشید کا جسم مثالی حالت بیداری میں بھی ان کے خاکی وجود سے آزاد ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں ”جیسے میں لہروں کے ساتھ آسمان کی طرف اڑا چلا جا رہا ہوں۔ اور میرا سر بام فلک سے ٹکرا گیا ہے“ بہر حال کوئی صورت ہو یعنی اس کیفیت کا سبب اعصابی کمزوری ہو یا جسم مثالی کی سعی پرواز۔ عبدالرشید صاحب فکر مند نہ ہوں۔ کسی ڈاکٹر سے اپنے لئے سکون بخش گولیاں تجویز کرائیں۔ ان کے استعمال سے انشاء اللہ رفتہ رفتہ دماغی تشویش پر غالب آ جائیں گے۔

جنس کی تبدیلی

منظر گڑھ کی ایک درو مند لڑکی نے۔ پیارے والد بزرگوار کے خطاب سے میرے نام ایک خط بھیجا ہے۔ جملہ کہانی یہ ہے کہ ان کی پرورش خالہ نے کی۔ ماں کی توجہ بھائی کی طرف مبذول تھی۔ اس لئے انہیں خالہ کا پیار بسانیمت نظر آیا۔ جب ان کی خالہ کی شادی ان کے چچا کے ساتھ ہو گئی تو وہ بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چلی گئیں۔

لیکن اب انہوں نے دیکھا کہ خالہ کے رویے میں سرد مہری آئی ہے۔ لکھتی ہیں کہ جب تین سال بعد۔ ”گڑیا رانی“ (خالہ زاد بہن) پیدا ہوئی تو خالہ نے اپنی تمام محبتیں اس کے نام لکھ دیں اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ ہم جس کالونی میں رہتے تھے وہاں کا طرز زندگی بے حد ماڈرن ہے خالہ مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہا کرتی تھیں جن کو سن سن کر بچپن ہی میں میرا دماغ ”بہت بڑا بن گیا۔ آگے چل کر یہ بچی لکھتی ہے کہ کچھ دن کے بعد چھوٹی خالہ کی آوارہ مزاجیوں کا چرچا ہوا تو میں بھی ناکردہ گناہ کی لپیٹ میں آ گئی اور مجھ پر بھی طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ چچا اور خالہ نے کہا کہ تم اس (چھوٹی خالہ) کی محرم راز تھیں، تم بھی اس کی حرکتوں میں شریک رہی ہو۔ کچھ مدت بعد چھوٹی خالہ چلی گئیں اور شادی رچا کر بیٹھ گئیں، میں ہدف ملامت بنی ہوئی ہوں۔ انہوں نے سوال کیا ہے کہ کیا میں خالہ اور چچا سے قطع تعلق کر لوں (2) اگر اصرار کیا جائے کہ میں ”بوا“ کے لڑکے سے شادی کر لوں۔ تو کیا طرز عمل اختیار کیا جائے۔

اے بی بی! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم فی الحال خالہ اور چچا سے قطع تعلق نہ کرو، اور مزید انتظار کرو۔ تم اپنی تعلیم جاری رکھو اور ساڑھے تین سال انتظار میں گزار دو۔ اب آؤ اس لڑکی کی طرف جس کو تم بے حد چاہتی ہو اور جس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ جب باہر ڈاکٹر کی ڈگری لے کر آئے گی، تو اپنی جنس تبدیل کرا کر یعنی لڑکی سے لڑکا بن کر تم سے شادی کر لے گی۔ تو بی بی! یہ تصور مضحکہ خیز ہے۔ جنس کی تبدیلی (لڑکی کا لڑکا اور لڑکے کا لڑکی بن جانا) اتنی عام اور معمولی بات ہے، جتنی سہل اور آسان تم سمجھ رہی ہو۔ اس لڑکی سے (خواہ تمہاری کتنی ہی چہیتی کیوں نہ ہو) شادی کی تمنا غیر قدرتی اور غیر فطرتی ہے اور لڑکی سے لڑکا نہیں بن سکتی۔ تم صرف تعلیم ہی کی طرف توجہ رکھو، بوا کے لڑکے سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انشاء اللہ تین سال بعد ضرور مناسب رشتہ ملے گا، اور ضرور ملے گا۔ ایک اور روحانی بیٹی لکھتی ہیں کہ میں آپ سے مدد چاہتی ہوں۔ میں نے بی۔ اے کیا ہے، عمر 25 سال ہے پانچ ماہ بعد شادی میری مرضی سے ہو رہی ہے۔

میرے شوہر نے۔ م کا اصرار ہے کہ شادی کے بعد جب تک چھوٹا بھائی سروس نہ کرنے لگے۔ اس وقت تک میکے میں رہوں۔ میرے روحانی باپ! میرا دل نہیں مانتا کہ میں شادی کے بعد ماموں کے پاس رہوں۔ جب میں چھوٹی تھی تو نانا اور نانی کے ساتھ پاکستان آگئی تھی، والدین ہندوستان میں ہیں۔ میری پردوش نانا اور نانی نے کی ہے اور میں ماموں کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے روحانی باپ! اگر آپ مجھے کسی اسکول میں یا کسی خواتین کی جیل میں ملازمت دلوادیں تو بے حد شکر گزار ہوں گی۔ (شاہین) بی بی! کاش میں تمہیں ملازمت دلواسکتا! اے کاش۔ مگر یہ میرے امکان میں کہاں؟ تمہیں شادی کے بعد ماموں کے گھر کے بجائے شوہر کے ساتھ رہنا چاہئے۔

وہی خلل دماغ

راحت حسین اسی خلل دماغ میں مبتلا ہیں، جس کا تذکرہ بارہا کیا جا چکا ہے۔ راحت صاحب کو انہی تمام معرکوں سے گزرنا پڑا جن سے رہروان شوق کو گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہی آشفستگی، بدعالی اور وہی زارنالی۔ وہی وصل کی آرزو اور وہی ہجر کے شکوے وہی رقیب کی دخل اندازی اور وہی آسمان کی شہید طرازی۔ اس عشق کے راستے میں لڑکی کے سر پرست حائل ہیں، میں راحت حسین کو کیا مشورہ دوں۔ انہوں نے بیٹھے بٹھائے اپنے کو راحت سے بے راحت بنالیا ہے۔ بہر حال، بھائی دیوار سے ٹکرائے گئے تو ماتھے میں درد ضرور ہوگا۔ عشق ایک ایسا مرحلہ ہے جس سے روح انسانی کو کسی نہ کسی وقت گزرنا ہی پڑتا ہے، بیشک آج راحت صاحب سخت کرب و اضطراب سے دوچار ہیں، مگر نہ کوئی کرب دائمی ہوتا ہے نہ اضطراب انسانی ذہن ہر لمحہ، کرب و اضطراب سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آخر کار اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے راحت صاحب میں یقین دلاتا ہوں کہ اگست 1973ء میں آپ کی جو کیفیت ہے وہ 1974ء میں نہ ہوگی اور آپ 1975ء میں بالکل اس مرض سے شفا یاب ہو چکے ہوں گے، بشرطیکہ آپ نے کوشش جاری رکھی۔

خدارا بچائیے

میری عمر اس وقت 32 سال کی ہے کہ دیکھنے میں مرد ہوں، مگر لہجہ عورتوں جیسے ہیں۔ مجھے یہ عادت پندرہ سال کی عمر میں پڑی۔ ہمارے والدین غریب تھے اور مجھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق۔ میں لٹ گیا۔ اگرچہ اس شوق کی بناء پر کافی پیسہ کمایا، لیکن تباہی میں بھی کسر باقی نہیں رہی۔ میرا چھوٹا بھائی بھی میرے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ حالانکہ اب اس طرح کمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ ہمارے ہوٹل چل رہے ہیں۔ میرے بھائی کی عمر بائیس سال ہے، اس وقت تو اس کے بہت سے دوست ہیں۔ بہت سے چاہنے والے ہیں، لیکن جب وہ میری عمر کو پہنچے گا تو کوئی اُسے پہچانے کا بھی نہیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے، لیکن وہ شادی سے کٹ کر رہا ہے۔ یقیناً میری طرح وہ بھی مکمل عورت بن چکا ہے۔ میں مجبور ہوں، لیکن اسے تو ان مجبوریوں پر غالب آ جانا چاہئے۔ وہ ہندو مسلم کی بھی تمیز نہیں کرتا۔ بس ایک مرد ہونا چاہئے، خواہ وہ کوئی ہو۔ خدا کے لئے ہمیں بچائیے، خدارا بچائیے (جم۔ خان پور) آپ اور آپ کا چھوٹا بھائی جس علت میں مبتلا ہیں، وہ افسوسناک ضرور ہے، حیرت ناک نہیں۔ ہم جنس پرستی ایک عام جنسی مظہر ہے اور نوے فیصدی افراد جنسی جذبے کی نشوونما کے دور میں اس انحراف اور کج روی سے گزرتے ہیں لیکن اس جنسی کج روی بلکہ غلط روی کو مستقل بنالینا سخت تکلیف دہ ہے۔ جم صاحب آپ نے اپنے خط میں اس معاملہ کی بہت سی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے، جب تک تفصیلات پیش نظر نہ ہوں۔ کوئی مشورہ دینا ممکن نہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ میری عمر 32 سال کی ہو چکی ہے، یہ نہیں لکھا کہ آپ اس علت یا علت پر غالب آچکے ہیں یا نہیں اگر آپ اس علت پر غالب آچکے ہیں تو چلئے چھٹی ہوئی۔ یہ مشغلہ اب تک جاری ہے تو اس کی تفصیلات لکھئے۔ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی دونوں ”مفعولیت“ کے مریض ہیں۔ مفعولیت بیشک ایک نفسیاتی اور جنسی مرض ہے۔ ایک آدھ مشورے سے آپ کی اصلاح ممکن نہیں، آپ کا نفسیاتی علاج معالجہ

دیر طلب بھی ہے اور دقت طلب بھی ہے! میں سب سے پہلے آپ کو خود ترغیبی کی مشق کراؤں گا۔ اسی کے ساتھ قوت ارادی کو اجاگر کرنے کے لئے عمل کرنا پڑے گا۔ تب کہیں آپ اس قابل ہوں گے، کہ اپنی جنسی کج اندیشی اور کج روی پر غالب آسکیں۔ آپ کو مجھ سے براہ راست اور باقاعدہ خط و کتابت کرنی چاہئے۔ اس قسم کی پیچیدہ اور منہجی ہوئی عادتوں کو چھڑانے کے لئے عالمی میں دو چار یا دس سطریں لکھ دینا کافی نہیں۔

عرض ہے کہ

ایم ایوب بیدزن لکھتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ سے روحانی طاقت حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔ لیکن عالمی میں آپ کے مضامین پڑھ کر یہ شوق جنون میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں اپنی روح کو مضبوط بنانے کے لئے کسی مرد کامل کی کوشش میں ہوں۔ ایک صاحب نے کہا ہے کہ سرگودھا میں ایک مرد کامل موجود ہے، آپ کی کیا رائے ہے اس کی طرف رجوع کروں یا نہ کروں! ایوب صاحب میں تو روحانی آدمی نہیں ہوں۔ نفسیات و مابعدالنفسیات کا معمولی طالب علم ہوں۔ آپ سرگودھا کے اس مرد کامل کی طرف ضرور رجوع کریں اور مجھے بھی مطلع کریں۔ کہ آپ کو اس ”پشمہ سعادت“ سے کیا ملا؟ ط۔ف۔ اپنی محبوبہ ”پ“ سے بچھڑ چکے ہیں۔ اور ”پ“ سے ملنے کے لئے ماہی بے آب و چناب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ ”پ“ کو بھلانے کی ہر چند کوشش کی مگر۔

حقیقت کھل گئی حسرت! ترے ترک محبت کی

تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

ط۔ف کی پھوپھی زاد بہن کا نام ”پ“ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نام ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ جب پ نمبر 2 (یعنی پھوپھی زاد بہن) سامنے آتی ہے تو ط۔ف۔ کو پ نمبر 1 (پچھڑی ہوئی محبوبہ) شدت سے یاد آنے لگتی ہے۔ ط۔ف کو شکوہ ہے کہ ان کے والد (جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں) اس محبت کے سبب مجھ سے سخت ناراض ہیں،

حالانکہ ہمارے والدین نے بھی محبت کی شادی کی تھی۔ ط۔ف۔ نے مشورہ طلب کیا ہے کہ میں کیا کروں؟ پیارے ط۔ف۔ جب کوئی شخص (اور تم جیسا نوخیز عاشق) شدت محبت کے دور سے گزر رہا ہو۔ تو اسے کوئی مشورہ دینا بیکار ہے، جذبہ محبت ایک میعاد بخار ہے۔ جب تک اس کی میعاد مقررہ ختم نہ ہوگی۔ (کہیں یہ میعاد ایک ہفتہ کی ہوتی ہے، کہیں ایک سال کی) محبت کے میعاد بخار میں کمی نہ ہوگی۔ اب رہا مشورہ، تو عزیز من! میرا مشورہ وہی ہے جو تمہاری تعلیم یافتہ والدہ نے دیا ہے۔ یعنی جب تک تعلیم مکمل نہیں کر لیتے ”پ“ کا نام بھی نہ لو، لیکن کیا تم اس مشورے پر عمل کرو گے؟

عجیب رقابت

مختصراً صورتحال یہ ہے کہ ایک شخص اچانک میری زندگی میں داخل ہوا اور روح کے اندر گھستا چلا گیا۔ اس شخص سے مجھے اتنی محبت تھی اور ہے کہ بیاں نہیں کر سکتی، بد نصیبی یہ کہ اس کی طرف باجی مائل ہو گئیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں دونوں نے شادی رچالی۔ میں اس عجیب رقابت پر آہ تک نہ کر سکی۔ بہن سے کیا کہتی بہنوئی سے کیا شکوہ کرتی۔ ہاں۔ چپ چپ، اداس اداس اور پیار پیار رہنے لگی۔ کون کبھی کے درد کو سمجھتا ہے والدین نے میری منگنی ایک ایسے شخص سے کردی جو شرابی بھی ہے اور جواہری بھی۔ ایک تو محبوب کی جدائی کا جان لیوا غم (واضح رہے کہ میں ان سے اب بھی محبت کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے بھلا نہیں سکتے) اور دوسری طرف یہ خوفناک اور روح فرسا رشتہ! آج کل میں میری شادی ہونے والی ہے، میں انکاری ہوں۔ حالیہ بہنوئی اور سابقہ محبوب اب تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہیں۔ بتائیے، کیا یہ شادی ہو سکتی ہے۔ مسلسل دکھ سننے کے سبب T.B میں مبتلا ہو گئی۔ اب جی چاہتا ہے کہ شادی کے دن خودکشی کر لوں۔ رئیس صاحب! وہ مجھے بھول جائیں، ورنہ لوگ کہیں گے کہ بہن کا گھر اجاڑ دیا۔ نہیں میں ان کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ زندہ درگور ہو گئی ہوں۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ (نوٹ کر لیجئے کہ میری عمر سترہ سال ہے) آہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟

مایوس تمناؤں پر سوز ہیں پُر غم ہیں
غم جن کا مقدر ہو دنیا میں وہ اک ہم ہیں

(حرماں نصیب، م۔ از گلبرگ، لاہور)

بی بی! بڑا دردناک خط لکھا ہے تم نے! یہ خط تم نے چند ہفتے قبل لکھا تھا۔
نجانے تمہاری شادی کا کیا رہا مجھے امید ہے کہ تم خودکشی کے نفرت انگیز رجحان پر غالب
ہوگی۔ جو کام چیونٹی اور چھوٹی بھی نہیں کرتے (یعنی اپنے آپ کو ہلاک کر لینا) وہ آدم زاد
کرے تو بہ تو بہ! بہنوئی سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ تم جرأت کر کے موجودہ
رشتے سے ضرور انکار کر سکتی ہو۔ ایک طرف تم میں اتنی جرأت موجود ہے کہ شادی کے روز
خودکشی پر تلی بیٹھی ہو، اور دوسری طرف یہ بزدلی کہ رشتے سے انکار نہیں کر سکتیں ابھی تمہاری
عمر صرف سترہ سال ہے، شادی کی ایسی کیا جلدی ہے۔ چار پانچ سال بعد کسی مناسب
جگہ پر ہو جائے گی۔ تم یقیناً اس رشتے سے انکار کر دو۔ محبوب اگر بہنوئی بن جائے تو محبوب
نہیں رہتا، عقل سے کام لو، بچپنا نہ کرو، یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔

بیماری نہیں خود لذتی

خود لذتی کے عادی لڑکے اور لڑکیوں کے تقریباً ساٹھ ستر خط جمع ہیں، سب کا
اصرار ہے کہ سب کو الگ الگ مشورہ دیا جائے۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں، اب پہلے یہ عرض
کروں کہ خود لذتی (اپنے جسم سے کھیل کر لذت حاصل کرنا) کوئی بیماری نہیں محض ایک
عادت ہے۔ اس عادت میں کم و بیش ہر شخص عمر کے کسی حصے میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے۔
جب یہ عادت ترک کر دی جاتی ہے۔ (اور 50 فیصدی افراد ترک کر دیتے ہیں) تو اس
کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے ہیں۔ میں خود لذتی کی عادت ترک کرانے کے لئے
S.C.T کی مشقیں کرایا کرتا ہوں۔

اندھا باپ

الف۔ بی! تمہاری مجبور یوں اور تمہارے اندھے باپ کی کارستانیوں کی
افسوسناک داستان پڑھی انہوں نے گھر بھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ تم نے لکھا ہے۔
”میں نے سوچا تھا کہ ان کو گولیاں کھلا کر مار دوں۔ اور اس کے بعد اپنی زندگی
کا خاتمہ کر لوں، تاکہ یہ روز روز کا فساد دفع ہو۔ پھر سوچا کہ آپ کی رائے لوں، اگر دیر کی
شاید تو پاگل ہو جاؤں۔ آپ کو خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ جواب جلدی دیں۔

الف۔ بی! تمہارے اندھے باپ ذہنی فتور اور دماغی خلل میں مبتلا ہیں۔ تم
اپنے بھائی پر زور ڈالو کہ وہ کسی مقامی نفسیاتی معالج سے ان کا علاج کرائیں۔ میں نے
تمہارے خط کو دو مرتبہ غور سے پڑھا۔ ان کی تمام وحشیانہ حرکات بے عقلی پر مبنی ہیں،
حقیقت وہ شعور سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں ان کی کسی حرکت کو سنجیدگی
سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

تو گنوار ہے
میں بُری طرح احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ میٹرک میں فرسٹ پوزیشن ایف
۔ اے میں سیکنڈ اور اب ایم۔ اے (معاشیات) کا طالب علم ہوں۔ کمتری کا احساس
(بی۔ اے) سے شروع ہوا، احساس کمتری کا سبب یہ ہے کہ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں،
گاؤں والا ہونا کوئی جرم نہیں۔ میں خود اسے سمجھتا ہوں۔ مگر ہر وقت یہ تصور کھائے جاتا
ہے کہ میں گاؤں والا ہوں، تو گنوار ہے۔ اس قدر عاجز ہوں کہ مرنے کی دعائیں مانگتا
ہوں مگر

مرتے ہیں آرزو میں مرنے والے

موت آتی ہے پر نہیں آتی

لہ بتائیے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ (مسعود احمد، راولپنڈی)

مسعود صاحب! احساس کمتری کا بنیادی سبب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہے کہ آپ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ معاملہ اس سے گہرا ہے جو لوگ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے بعض ظاہری اور فرضی سبب قائم کر لیا کرتے ہیں۔ مثلاً میں گاؤں کا رہنے والا ہوں، میں غریب خاندان کا فرد ہوں۔ بد صورت ہوں، یا پستہ قد ہوں، یا مجھ میں کوئی جسمانی عیب ہے۔ احساس کمتری کے یہ اسباب بظاہر سمجھ میں آتے ہیں۔ لیکن اگر نفس کی گہرائی کو ٹٹولا جائے تو اس کا بنیادی سبب کچھ اور ہی ہوگا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ بعض افراد کی ذہنی نشوونما کا سلسلہ کہیں درمیان میں انک جاتا ہے۔ بچپن کے ماحول، ماں باپ کی تربیت یا کسی اور ایسے ہی سبب سے وہ بھرپور دماغی بلوغ سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی انا (یعنی یہ احساس کہ میں ”میں“ ہوں) اپنے مکمل اظہار سے قاصر ہو جاتی ہے، اور پھر وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ نے خود لکھا ہے کہ گاؤں والا ہونا جرم نہیں۔ اکثر مشاہیر عالم دیہات اور غریب ماحول سے اٹھے ہیں۔

ان کا دیہاتی پن اور غربت مزید ترقی کی محرک ثابت ہوئی۔ رنجیت سنگھ یک چشم تھا اور چمک رو بھی تھا۔ نپولین پستہ قد تھا، گاندھی جی بد صورت تھے، سکندر گنجا تھا، رود کی اندھا تھا۔ کیا ان لوگوں کی عظمت میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ سب کے سب دیہات کے رہنے والے تھے۔ (سکندر کے علاوہ) مگر کمال کے درجہ اول پر فائز ہوئے۔ مسعود صاحب! یہ نکتہ یاد رکھئے کہ کمتری کے اسباب اگر مادی ہوں (یعنی کوئی غریب خاندان کا فرد ہو) تو نفس انسانی کمتری کے مادی اور ظاہری اسباب پر بلا تکلف غالب آ جاتا ہے۔ اور جس طرح طوفانی دھارا اپنے کٹوتہ کر بڑی قوت سے آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح انسانی ارادہ ظاہری رکاوٹوں سے ٹکرا کر اور قوی ہو جاتا ہے، لیکن اگر کمتری کے اسباب ذہنی ہوں۔ یعنی اندر سے یہ آواز آتی ہو کہ میں کمتر ہوں، تو انسان کی خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ آپ کے احساس کمتری کی تہہ میں آپ کے بچپن کے نفسیاتی تجربات کا فرما ہیں۔ بچپن میں (جب آپ کی ذہنی نشوونما

شروع ہو رہی تھی تو) کسی طرح نفس میں یہ گرہ پڑ گئی، کہ میں کمتر ہوں، کمزور ہوں حقیر ہوں۔ انسانی ذہن ہر دعوے کی خواہ وہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو، دلیل ضرور مہیا کر دیتا ہے۔ سو اس نے یہ دلیل مہیا کر دی کہ چونکہ میرا تعلق دیہات سے ہے۔ اس لئے میں شہریوں سے کمتر ہوں، لاجول دلاقوتہ کتنی بودی دلیل ہے اور کتنی مضحکہ خیز تاویل۔ برادر م بچپن کا جائزہ لیجئے، اپنی ابتدائی زندگی کو ٹٹولئے اور دیکھئے۔ کہ کمتری کا احساس کیوں شروع ہوا؟ کہاں سے شروع ہوا؟ اور کیسے شروع ہوا؟ آپ کو اپنی تحلیل نفسی (ذہن کی چھان بین) سے خود پتا چل جائے گا کہ بدی کا سرچشمہ کہاں واقع ہے؟ خود کشی کر لیں گے

ہماری ایک رشتہ دار لڑکی ہے، عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی۔ میں اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں، وہ لڑکی بھی خلوص سے پیش آتی ہے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے، میں نے ابھی اس سے اظہار محبت نہیں کیا۔ جب بھی دل کی بات زبان پر لانا چاہتا ہوں، یہ خیال آ جاتا ہے کہ اس نے گھر والوں سے کہہ دیا تو؟ ہر مرتبہ ملاقات سے پہلے یہ ارادہ کرتا ہوں۔ کہ آج یہ کہوں گا، اور وہ کہوں گا، مگر ملاقات کے وقت ہونٹ مل جاتے ہیں۔

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو یار آتا

سب کہنے کی باتیں ہیں بس کچھ نہ کہا جاتا

یہ وہ الجھن ہے جس نے مجھے زندگی سے بیزار کر رکھا ہے۔ میں ایف۔ اے کا طالب علم ہوں اور وہ لڑکی دسویں میں پڑھتی ہے (ط۔ و لاہور) میرے قابل احترام بزرگ! میرا نام (م۔ ز) ہے عمر سولہ سال۔

جب یہاں نئے نئے آئے تو ہمیں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ ہم دونوں نے کلام مجید پر ہاتھ رکھ کر وفاداری کی قسمیں کھائیں اور یہ عہد کیا کہ عمر بھر ایک دوسرے کا ہاتھ بنائیں گے۔ اب یہ مشکل پیش آ گئی ہے کہ اس لڑکی کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ میری حیثیت نہیں کہ اس کے والدین سے کچھ کہہ سکوں۔ قابل احترام

بزرگ! میں آپ کے دروازے پر کھڑا ہوں، آپ مجھے مشورہ دیں۔ اگر اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہوگئی تو ہم خودکشی کر لیں گے۔

ن احمد اکیلا

میں ایک بے قرار، بے سکون، شکستہ دل، آشفستہ حال نوجوان ہوں۔ آپ کی خدمت میں مشورے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ جناب عرض یہ ہے کہ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بُری طرح چاہتی ہے۔ ٹوٹ کر پیار کرتی ہے لیکن چند مہینے پہلے اس کی منگنی کہیں اور ہوئی۔ اب میرا یہ حال ہے کہ اٹھتے چھین نہ بیٹھتے سکون! اس کا خیال خوشبو کی طرح میرے ذہن میں بسا ہوا ہے۔ بھلانے کی جتنی کوشش کرتا ہوں اور یاد آتی ہے۔ حالات زندگی یہ ہیں کہ دو سال کا تھا والدہ مر گئیں، نانی نے پرورش کی، چار سال پہلے وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ والد نے میری ماں کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ خیر یہ تفصیل کہاں تک بیان کروں، اگر آپ یہ خط شائع کریں، تو میرا نام (ن۔ احمد) اکیلا تحریر کریں (خانوال سے) روشنی دکھائیے

میری عمر پندرہ سال ہے اور میں نویں جماعت میں پڑھتا ہوں، جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو ایک چھوٹے سے اسکول میں داخلہ لیا، وہاں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں میں کسی لڑکی سے واسطہ نہیں رکھتا۔ جب کہ دوسرے لڑکے، لڑکیوں کو خوب چھیڑتے اور ستاتے، ایک لڑکی مجھے بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ ایک روز اسکول کی چھٹی ہوئی تو سارے لڑکے اور لڑکیاں چلے گئے، میں اکیلا رہ گیا۔ یکا یک وہ لڑکی جس کا نام (ی۔ک) سمجھ لیجئے۔ میرے پاس آئی اور مجھ سے اقرار محبت کیا، وہ لڑکی میرے گھر کے قریب رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ امتحان ہوا تو میں سیکنڈ ڈویژن میں ہوا اور وہ تیسرے نمبر پر آئی۔ اسی روز وہ مجھ سے کھینچی کھینچی سی رہنے لگی،

میں نے وجہ پوچھی تو کوئی جواب نہ دیا۔ اس حادثہ کی وجہ سے میں پاگل ہو گیا، نہ کھانے کا ہوش رہا اور نہ پینے کا، گھر والوں کو پتہ چلا تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ رئیس صاحب! بتائیے اب میں کیا کروں؟ دل و دماغ بیکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے ایک روز (ی۔ک) کو کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھا۔ تو دیوانگی سی طاری ہوگئی، جی چاہا کہ میں اسے قتل کر دوں اور میں ضرور قتل کر دیتا۔ مگر دوست نے روک دیا، اب مجھے روشنی نظر نہیں آتی، روشنی دکھائیے۔ (آپ کا روحانی بیٹا غ۔ح۔ ربانی)

حسن بلائے جان

مجھے آج سے پندرہ سال قبل نواب شاہ سندھ میں چاروں طرف لڑکیاں ہی نظر آئیں۔ اس لئے مجھ میں لڑکی پن پیدا ہو گیا۔ خدا کی شان! لمبی لمبی پلکیں، خوبصورت آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ اور ستواں ناک، لوگوں نے مجھے زیبا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ میں شرمانے لگا، یہی شرم مجھے لے ڈوبی نہ جانے کس کس کا نشانہ بنا، اور مارے شرم کے فریاد نہیں کر سکا۔ اس زمانے میں ایک لڑکے ”ج“ سے محبت ہوگئی۔ آپ یقین جانتے میرے ہمدرد، کہ یہ محبت پاکیزہ اور بے لوث تھی۔ لیکن یہاں بھی اسی ہوس جنسی بھوک سے سابقہ پڑا۔ میں نے دامن بچا لیا اور اس صدمے کو بھلانے کے لئے ”ڈ“ کا سہارا لیا۔ لیکن پھر بھی گندگی اور آلودگی میں لتھڑ گیا۔ اب رئیس صاحب بتائیے۔ جاؤں تو جاؤں کہاں؟ کروں تو کیا کروں؟ خودکشی؟ لوگ کہتے ہیں یہ کفر ہے، کوئی حل بتائیے ورنہ پاگل ہو جاؤں گا۔ (آپ کا بد نصیب اور دکھیارا بیٹا، آ۔ا)

روح کی روح

میرے روحانی باپ! پہلی مرتبہ ایک الجھن لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تین سال پہلے ایک لڑکی زندگی میں داخل ہوئی اور روح بن گئی۔ وہ لڑکی قریب ترین عزیزوں میں سے ہے، ہمیں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کی مکمل

آزادی ہے، ہم ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ابھی تک ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس دن سے میں اس کی محبت میں گرفتار ہوا ہوں۔ وہی سکون غائب ہو گیا ہے، کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ نگاہوں میں ہر وقت اس کی تصویر گھومتی رہتی ہے، ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ جب کسی کام کی طرف توجہ کرتا ہوں، خیالات پریشان ہو جاتے ہیں۔ ذہن بھٹکنے لگتا ہے، توجہ کی یکسوئی بالکل ختم ہو چکی ہے۔ پڑھنا شروع کرتا ہوں تو دماغ پر نامعلوم بوجھ سا پڑ جاتا ہے اور نگاہیں مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس ذہنی انتشار کو ختم کرنے کے لئے پانچوں وقت کی نماز شروع کر دی۔ مگر دعاؤں میں اثر کہاں؟

یہ غضب کیا تری یاد نے مجھے آستیا نماز میں

ہزار مرتبہ دل کو سمجھایا کہ اگر تو تعلیم حاصل نہ کرے گا، تو اسے کس طرح پاسکے گا۔ مگر دل کہاں مانتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائیوں کا مستقبل بھی میری ذات سے وابستہ ہے یہ سب کچھ جانتا ہوں، سب کچھ سمجھتا ہوں۔ مگر اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکتا، وہی میں ہوں، وہی اس کی یاد ہے۔ اب تو خود اعتمادی بھی ختم ہو کر رو گئی ہے۔ نت نئے منصوبے باندھتا رہتا ہوں اور توڑ دیتا ہوں۔ (اعجاز احمد، لاہور)

لو میرج

میری عمر بائیس سال کی ہے، ٹیلی فون آپریٹر ہوں، وہیں ایک محترمہ بھی ملازم ہیں۔ ایک مرتبہ ہم دوپہر کا کھانا کھا کر کینٹین میں چائے پینے گئے۔ وہیں انہوں نے دبے لفظوں میں اظہار محبت اور لو میرج (عقد محبت) کا اظہار کیا۔ اس بے ساختہ اظہار شوق سے میں بھی گھبرا گیا، چائے کی پیالی ہاتھ سے گر گئی۔ میں ایک اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ یہ مشورہ دیں کہ میں ان کی طرف (کینٹین والی محترمہ) رخ کروں، یا ان کی طرف! جب کینٹین کا یہ قصہ میں نے اپنی محبوبہ کو سنایا، وہ غضب ناک ہو گئیں۔ کہنے لگیں جب آپ کے گرد لڑکیاں منڈلاتی رہتی ہیں۔ آپ مجھے کیا گھاس

ڈالیں گے؟ یہ کہہ کر وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گراری دار چاقو میرے کلیجے کے پار ہو گیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ نہ میں پہلی سے ملتا ہوں نہ دوسری سے بات کرتا ہوں بلکہ نوکری ہی سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ (عتیق احمد، کراچی)

قلبی کیفیت

کچھ دن قبل میں ”س“ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ”س“ بھی مجھے چاہتی تھی۔ ہم نے باعزت طریقے پر شادی کا پروگرام بنایا۔ لڑکی کی والدہ رضامند تھیں، اور اس کے باپ اور بھائی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا بیچ پڑا کہ باپ اور بھائی دونوں بکر گئے اور بکر گئے اور اس کو گاؤں بھیج دیا۔ جناب رئیس صاحب! آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ میری قلبی کیفیت کیا ہوگی۔ کوئی ایسا راستہ تجویز کیجئے کہ میری شادی اس لڑکی سے ہو جائے ورنہ بے موت مر جاؤں گا۔ (ب۔ رخ)

محبت کی تھیلی

میں نے اپنے خطوط کا تھیلیا کھولا، تو محبت کی تھیلی ہاتھ آئی۔ اس تھیلی کے چند خطوط کا خلاصہ حاضر ہے، ہر جذبے کی طرح عشق کے بھی دو روپ ہیں۔ ایک روپ یہ کہ: عشق سے طبیعت نے زیت کا مزا پایا
درد کی دوپائی درد لادوا پایا
دوسرا روپ یہ کہ:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

کہا جاتا ہے کہ عشق بنیادی طور پر ایک حیاتیاتی جذبہ ہے (اور کون سا جذبہ ہے جو حیاتیاتی نہیں ہوتا) یعنی زندگی اپنی بقاء کے لئے خود زندگی کی تجدید چاہتی ہے۔ زندگی کی تجدید اور افزائش کے لئے جنسی ہیجان ضروری قرار پایا، اور جنسی ہیجان کا مظہر ہے، عشق! اگر انسان کو جنسی جذبے سے محروم کر دیا جائے تو جذبہ عشق سے بھی تہی

دامن ہو جائے گا۔ گویا جنسی میلان اور شہوانی پہچان کو عشق کہتے ہیں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس عشق کو خمار خوردن گندم (گیہوں کی روٹی کا نشہ) قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ع

قیس بھوکا ہو تو لیلیٰ کو بھی گروی رکھ دے

شیخ سعدی نے کیا عجیب نفسیاتی حقیقت بیان کی ہے۔

چنان قط سالی شد اندر دشت

کہ یاراں فراموش کردند عشق

یعنی دشت میں اس قیامت کا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق و عاشقی تک بھول گئے،

حیاتیاتی نقطہ نظر سے عشق محض افزائش نسل کے جذبے یا جبلت کو کہتے ہیں۔ مرد عورت

کی طرف اس لئے راغب ہوتا ہے کہ باپ بنے اور مرد کی طرف عورت کا رجحان محض

ماں بننے کے شوق میں ہوتا ہے۔ فنی طور پر یہ بات صحیح ہے، لیکن عشق محض جسمانی ملاپ کا

طبعی تقاضا ہی نہیں ہے، اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ آپ کسی طبیب سے عشق کی

ماہیت دریافت کریں گے۔ تو جواب دے گا کہ یہ سوداوی کیفیت ہے۔ جو دماغی خلل پر

ختم ہوتی ہے ہم اب بھی نفس انسانی کے جذباتی میکا نزم سے بخوبی واقف نہیں جو ہوش

مند انسان کو قیاس اور حقیقت پسند آدمی کو فرہاد بنادیتا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ عشق حملہ

آور ہوتا ہے، تو انسان کی مکمل شخصیت اس کا جسم، اس کی روح، اس کی عقل، اس کا ضمیر،

اس کا ارادہ، اس کا تصور، غرض ہر چیز ہتھیار ڈال دیتی ہے، اور عشق آدمی کو اس طرح

دبوج لیتا ہے، جس طرح چڑیا کو شکر اور فاختہ کو عقاب! عشق انسان کو بے حد حساس، بے

حد جری اور غیر معمولی طور پر تخیل آفریں بنادیتا ہے۔ عشق کوئی حسن اتفاق نہیں، بلکہ عشق

کے عقب میں غیر معمولی واقعات کے سلسلے موجود ہوتے ہیں۔

سمجھے تھے ہم تو عشق کو اک حسن اتفاق

دیکھا تو واقعات کا اک سلسلہ ملا

عہد جوانی میں جب جسم کے جنسی غدد کا عمل تیز اور پہچان انگیز ہوتا ہے۔ تو

عشق کا وار بڑا کاری اور جان لیوا ہوتا ہے، البتہ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں عشق کی آنچ مدھم اور اس کا مزاج معتدل ہو جاتا ہے۔ تاہم میں نے ایسے بوڑھے بھی دیکھے ہیں جو اس کوچہ ملامت میں قدم رکھ کر جوانوں سے تیز دوڑنے لگتے ہیں۔ عام طور پر جذبہ عشق کا چکر پانچ سال میں مکمل ہوتا ہے۔ یہ ایک دائرے میں سفر کرتا ہے ابتداء میں شخص سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ دلچسپی کے بعد انس محسوس ہوتا ہے، پھر چاہت اور عشق، عشق کے صد ہا درجے ہیں اور اس کا آخری درجہ وہ ہے، جب طالب مطلوب سے بے نیاز ہو کر خود اپنے تراشے ہوئے پیکر خیالی میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا اب ان خطوط کی طرف توجہ کریں۔

عشق اور عقد

ط۔ و (لاہور) اظہار محبت کی جرأت سے محروم ہیں۔ وہ جسے چاہتے ہیں۔ اس سے کہہ نہیں سکتے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ ہائے مجبوریاں محبت کی۔ ایسی مجبوری کہ درو دل کا اظہار نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی نے بیزار کر دیا ہے۔ ط۔ و مجھ سے مشورہ طلب ہیں، کیا مشورہ دوں؟ بھائی! اظہار محبت کے لئے الفاظ ضروری نہیں۔ عشق پسینے کی طرح خود بخود ماتھے سے ٹپکتا ہے۔ آنسوؤں کی طرح خود بخود آنکھوں سے بہہ نکلتا ہے۔ عشق کو کبھی الفاظ کی احتیاج نہیں ہوتی۔

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی

یہ وہ نازک حقیقت ہے کہ سمجھائی نہیں جاتی

میں ط۔ و کو یقین دلاتا ہوں کہ کہے بغیر انہوں نے اپنی محبوبہ سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اب رہا رکھی اظہار محبت تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں پسندیدہ ترین عشق وہ ہے جس کا انجام عقد کی صورت میں برآمد ہو۔ (ط۔ و) لاہور کو عقد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

عاشقی قید شریعت میں جو آجاتی ہے

جلوہ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

خانہوال والے گناہ دوست؟ کی خدمت میں عرض ہے کہ تکمیل مراد میں ناکامی کے سبب خودکشی کریں، تمہارے دشمن! تم کیوں خودکشی کرو گے؟ پیارے م۔ ز ابھی تمہاری عمر صرف سولہ سال کی ہے، نہ ابھی تم جسمانی طور پر بالغ ہوئے نہ عقلی طور پر۔ ابھی تمہیں مزید ساٹھ ستر سال زندہ رہنا ہے۔ ان ساٹھ ستر سالوں میں تم نہ جانے کتنوں سے عہد وفا باندھو گے اور کتنے پیان وفا توڑو گے تمہاری مثال اس مسافر کی سی ہے۔ جو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھا کر منزل کا ارادہ ترک کر دے۔ بیٹے! سولہ سال کی عمر کا عشق بچہ ہوتا ہے اسے عشق نہیں کہتے، طفلانہ ضد کہتے ہیں۔ انشاء اللہ جب تم عشق میں مبتلا ہو گے۔ (اور وہ وقت کئی سال بعد آئے گا) تب ہم تمہیں مشورہ دیں گے کہ لیلیٰ کو جیتنے کے لئے قیس کو کیا کرنا چاہئے۔ فی الحال تو یہ سب کچھ ناپختہ جذبات کی شعبہ بازی ہے۔ نہیں! م۔ ز (خانہوال) میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا ہرگز نہ اٹھانا۔

آئیے اب دوران۔ احمد اکیلا کا حال پوچھیں، بھائی! تم نے بڑی کٹھن زندگی گزاری ہے۔ دو سال کے تھے کہ ماں جنت کو سدھار گئیں۔ نانی نے پرورش کی، باپ نے دوسری شادی کر لی۔ ایسے محروم محبت بچے کی جو ذہنی کیفیت ہوگی۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ آخری افتاد یہ پڑی کہ جس کو صنم کدہ عشق کی دیوی قرار دیا تھا، وہ کسی اور بت خانے میں سجائی جانے والی ہے، عزیز دوست! غالب کا یہ شعر سنو۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بھائی! جہاں اور صدمہ ہے جہاں اور ظلم برداشت کئے ہیں، وہاں ایک یہ بھی سہی۔ سنا بھی ہے دیکھا بھی ہے، گزری بھی ہے کہ بعض اوقات ناکامی محبت کی ضرب انسانی شخصیت کو نئے عظیم روپ میں ڈھال دیتی ہے۔ کوئی عشق کے معجزے سے دلی اللہ

بن جاتا ہے۔ کسی کو ناکام عشق شاعر و فن کار بنا دیتا ہے کوئی زندگی کے اس شعبہ میں ناکام رہ کر اس کی تلافی کسی دوسرے شعبہ حیات میں کر لیتا ہے، تمہیں بھی یہی کرنا چاہئے۔ ن۔ احمد اکیلا آپ مجھے لکھیں کہ آپ کو کن کن چیزوں سے شوق ہے؟ شاعری سے؟ ادب سے؟ اداکاری سے؟ مصوری سے؟ سیاست سے؟ تجارت سے؟ کھیلوں سے؟ عشق کے صدمے سہنے کے بعد آپ کن کن چیزوں سے دل بہلاتے ہیں۔ لکھئے تاکہ کوئی مشورہ دے سکوں!

میرے روحانی بیٹے۔ غ۔ ح۔ ربانی!

ابھی تو تمہاری عمر صرف پندرہ سال کی ہے۔ ابھی سے تم (ی۔ ک) کے چکر میں کہاں پڑ گئے؟ تم کہو گے کہ میں اس چکر میں کہاں پڑا ہوں۔ مجھے تو اس چکر میں زبردستی ڈالا گیا ہے، میں تو پھنس کر رہ گیا ہوں۔ برخوردار! یہ عذر تمہارا صحیح ہے، لیکن تم نے اپنے کو رئیس امر و ہوی کا روحانی بیٹا قرار دیا ہے۔ بے شک تم میرے روحانی بیٹے ہو۔ تم نے اپنی جو کیفیت لکھی ہے (نہ اٹھتے چین نہ بیٹھتے سکون) بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے یہ کیفیت! میاں میں تمہارے درد کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ:

طبیعت کو کچھ روز ہوگا قلق

سنجھتے سنجھتے سنبھل جائے گی

عنقریب تم ایک اور حادثہ عشق سے دوچار ہونے والے ہو اور مجھے معلوم ہے کہ نیا زخم کھا کر تم پرانے زخم کی تکلیف بھول جاؤ گے۔ لیکن بھیا! ہمیں تو پندرہ سال کے بچوں کی عاشقی پسند نہیں۔ ابھی تو تمہاری عمر کھیلنے کی ہے۔ (ی۔ ک) کے معاملے کو بھی ہاکی کا ایک میچ سمجھو، ہار گئے تو ہار گئے۔ دوسرے راؤنڈ میں جیت جاؤ گے۔

اور (1) تم نے لکھا ہے کہ میرا حسن میرے لئے بلائے جان بن گیا یقیناً بن گیا ہوگا۔

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے؟ جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

پیارے بچے! حسن صورت تو تم نے ورثے میں پایا ہے، یہ خداداد عطیہ ہوا۔
اب ”حسن سیرت“ پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ ”ذ“ ہو یا ”ذ“ یہ سارے چکر عارضی ہیں۔
عقیل احمد (ٹیلی فون آپریٹر) آپ فی الحال نہ تو ان کا انتخاب کریں نہ ان کا۔
وقت حالات کا کردگار اور واقعات کا پروردگار ہوتا ہے۔ دیکھیں، مستقبل کیا دکھاتا ہے؟
ب۔ خ اس مضمون کو پڑھیں۔ وہ انشاء اللہ بے موت نہیں مرے گے ”س“
نہ سہی ”ش“ سہی۔

اک حسین تازہ ہے ہر لمحہ مقصود نظر
حسن سے مضبوط بیان وفا رکھتا ہوں میں

☆☆☆

اگیا بیتال

جناب! یوں ہوا کہ آج سے تقریباً آٹھ مہینے قبل میرے چچیرے بھائی رحیم
نے مجھے سوتے سے جگا دیا اور کہا کہ چچا کے پیٹ میں درد ہے۔ ذرا میرے ساتھ شہر کے
ڈاکٹر کے پاس چلو، میں اٹھا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ گاؤں سے شہر تک کا راستہ کافی
دیران اور سسنان تھا۔ پہاڑ ہیں، اونچے اونچے درخت ہیں۔ اکیلے آدمی کو کافی ڈر لگتا
ہے۔ ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے جب مجھے دو تین باتوں کا جواب نہیں ملا۔ تو میں
نے مڑ کر دیکھا رحیم غائب تھا اور ایک اونٹ میرے برابر چل رہا تھا، میں ڈر کر بھاگا۔
ایک ایک اونٹ اوجھل ہو گیا۔ دیکھا کہ بکری آگے آگے چل رہی ہے۔ میں پیچھے مڑ کر گاؤں
کی طرف بھاگنے لگا۔ عین اسی جگہ تھوڑے فاصلے پر رحیم کھڑا تھا، میں ڈر کر اس سے چٹ
گیا۔ رحیم نے کہا، ڈرتے کیوں ہو۔ میں اونٹ کو دیکھ کر چھپ گیا۔ تم کو آواز دی، تم نے
سنا ہی نہیں، وہ کوئی مست اونٹ تھا۔ میں نے کہا اور وہ بکری کہاں سے آگئی۔ تب رحیم
کی سمجھ میں بات آئی۔ کہنے لگا، یا رکوئی بری چیز ہمارے پیچھے پڑ گئی۔ چلو بھاگو، رحیم آگے
آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے، اس بار میں نے دیکھا کہ رحیم کے سر پر ایک روشنی سی چمکی
اور وہ بکری بن گیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا اور میں کہاں ہوں؟ جب ہوش آیا تو
میں نے اپنے گھر میں پایا، بستی کی بہت عورتیں گھیرے بیٹھی تھیں۔ گاؤں والوں نے کہا
کہ ہم تمہیں جنگل سے اٹھا کر لائے ہیں۔ تم وہاں پر بے ہوش پڑے تھے، میں کئی ماہرین
نفسیات سے ملا۔ وہ میرا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں کہ تم وہم کے مریض ہو گئے ہو۔ اور
مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس واقعے کی وضاحت کریں گے۔ (شفیق پرویز سید، گاؤں
مرزا۔ تحصیل ضلع کیسبل پور)

شفیق پرویز سید صاحب! نفسیاتی نقطہ نظر سے آپ بیشک ”فریب نظر“ کا شکار
ہوئے تھائی میں انسان کی قوت واہمہ واقعی تیزی سے کام کرنے لگتی ہے اور پھر رات کا
وقت، ایسا خوف ناک جنگل، پہاڑی راستہ، سسنان ماحول، اور بھوتوں، چڑیلوں کی

ہزاروں کہانیاں حافظے میں جمع! ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر آنکھوں کو غیر حقیقی شکلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ممکن ہے کہ جو آپ نے دیکھا۔ وہ سب کا سب واہمہ کارگزاری ہو۔ میں خود اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر آپ کا مشاہدہ صحیح ہے اور واقعی طلسمی اونٹ اور آہنی بکری آپ نے دیکھی۔ تو یوں سمجھئے کہ ”اگیا ہتال“ سے آپ کا چلیا ہو گیا۔ اگیا ہتال ان چملا دوں کو کہتے ہیں۔ جو جنگل اور بیابانوں میں نظر آتے ہیں اور اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔ خیر چملاوے سے بھی کوئی ڈرنے کوئی وجہ نہیں۔ یہ صرف ڈرا سکتے ہیں، نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ صحرائین لوگ ان چملا دوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے نظاروں پر حقارت سے نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ بے ہوش کیوں ہو گئے۔ اونٹ کے سامنے جم کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ فضا میں تحلیل ہو جاتا۔ امید ہے کہ آپ اس ذہنی حادثہ پر غالب آچکے ہوں گے۔

☆☆☆

مرچو

اے مالک کل میرے والدین پر رحم فرما

مقام قذافی

جناب رئیس صاحب! میں ایک دن آپ کی تصانیف کے صحرا میں گھوم رہا تھا۔ ریت ہی ریت تھی۔ پھر ایک طرف مجھے گلہائے رنگ رنگ شکفتہ نظر آئے ہیں۔ ان کی طرف بڑھا، ایک پھول بہت نمایاں تھا۔ میں نے اُسے:

کب میرا نشین اہل چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں

گنگناتے ہوئے سنا، یہ پھول غنچوں کو بے ثباتی کا درس دے رہا تھا۔ یہ پھول آپ ہی تو ہیں۔ جو ہم نوجوانوں بلکہ پوری قوم کے ہمدرد بن کر ابھرے ہیں۔ سولہ سترہ سال کی عمر TURNING POINT کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نقطے پر بہت سی دلکش راہیں نکلتی ہیں۔ جناب میں اُسی ”عبوری نقطے“ پر کھڑا ہوں، مجھے ماں نے باپ کی طرح پالا، لیکن باپ کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ ایک شاعری پسند، افسانہ نگار، میڈیکل کا طالب علم اور اسلام کا پرستار ہوں، میں کرئل قذافی کو اپنا ہیرو سمجھتا ہوں۔ ملک کے گوشے گوشے کو جنت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہوں۔ میں جہالت کو ختم کرنے کے لئے گاؤں گاؤں بہتی رہتی گھونٹنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے اقبال کے شاہین سے دلی محبت ہے، انسان کو انسانیت کا درس دینا چاہتا ہوں۔ غرض میں اس ملک میں اسلام کا بول بالا کرنے کے درپے ہوں۔ عریاں اور نیم عریاں عورتوں کو دیکھ کر (خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم پاکستانی ہوں یا غیر پاکستانی) خون کھولنے لگتا ہے۔ مشورہ دیجئے کہ ”مقام قذافی“ کیسے حاصل کروں؟ کیا میں شاعری، افسانہ نگاری اور موسیقی ترک کر دوں؟ میں خود شعر نہیں کہتا، شعر خود بخود اُٹھنے لگتے ہیں۔ یہی حال افسانہ نگاری کا ہے، ایک غزل لکھی ہے اور ایک افسانہ ”چھٹ جائیں گے اندھیرے“ مکمل کیا ہے۔ یہ افسانہ ایک جنگی قیدی کی بیوی کی ذہنی کشمکش کا آئینہ دار ہے، میڈیکل کے شعبے کا انتخاب اس لئے کیا کہ کبھی حال لوگوں کا حال دیکھا نہیں جاتا۔ ہسپتال کے برآمدے اُف خدایا! مقام قذافی کو پانے کے لئے سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ دنیا کی عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات کا مطالعہ دل پسند مشغلہ ہے۔

آج کل عربی کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ کہ قرآن پاک کی ہدایات سے براہ راست مستفید ہو سکوں۔ (داور اسلام، 18، لاج روڈ، لاہور)

داور اسلام صاحب! آپ واقعی یاد اور اسلام ہیں۔ آپ کے خط، بے حد دلچسپ اور آپ کے نوجوان دولہ انگیز عزائم کا آئینہ دار ہیں۔ میاں! اگر آپ کو کرل قدانی بنا ہے تو شاعری، افسانہ نگاری اور موسیقی کو خیر باد کہہ دیجئے۔ مشورہ ہے کہ آپ خصوصیات کے ساتھ اسلامی تاریخ اور سیاسیات کا مطالعہ کیجئے۔ مشاہیر زمانہ کی سوانح حیات پر غور کیا کریں، اپنا طرز زندگی بدل دیں۔ سخت کوشی اور سخت جانی کی عادت ڈالیں اور مجھے برابر حالات سے مطلع کرتے رہیں۔

کتنی عجیب لڑکی

اس وقت میری عمر سترہ سال ہے، فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ یہ واضح کرتی چلوں کہ مالی طور پر پریشانی نہیں۔ البتہ ہم لوگ اس سے قبل تنگ دستی میں مبتلا تھے۔ میں دم کی مرلینہ ہوں، ہر وقت یہ وہم رہتا ہے کہ میرے ہاتھ ناپاک ہیں اور اگر کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو وہ بھی نجس ہو جائے گی۔ پہلے بھی یعنی بچپن میں بھی سوئے سے پہلے میں ہاتھ پاؤں دھویا کرتی تھی۔ لیکن اب وہم جنون کے درجہ تک جا پہنچا ہے، ہر مرتبہ نہانے میں تقریباً دو تین گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ جس وقت مجبور ہو کر ہاتھ دھوتی ہوں، تو یہ خواہش بے ساختہ ہوتی ہے، کہ کوئی ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے اس حرکت سے باز رکھے، کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں گھر والوں کو تنگ کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچا رہی ہوں۔ جب گھر والے تنگ آ کر غصہ کرنے لگتے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے، گہرا ذہنی سکون محسوس ہوتا ہے۔ گھر میں سوائے امی اور ایک بھائی کے میری کسی سے بول چال نہیں۔ میرا رویہ بھائی بہنوں کے ساتھ سخت ہے۔ کسی کی بے عزتی کر دینا تو معمولی سی بات ہے بچپن میں شاید مار پڑتی ہو، اب کوئی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ جب گھر والے میرے ساتھ عنایت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مقصد سے یہ

مہربانیاں کر رہے ہیں۔ رئیس صاحب! جو مجھ سے اچھی طرح ملتا ہے، وہ مجھے اپنا سب سے بڑا دشمن نظر آتا ہے۔ ان تمام ادہام اور شبہات کے باوجود میں غیر معمولی ذہین ہوں، ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں۔ کلاس کی چند لڑکیاں میری اچھی دوست ہیں۔ وہ میری عادتوں کے باوجود ترک تعلق پر تیار نہیں بلکہ جب میں روٹھ جاتی ہوں تو وہ مجھے طرح طرح سے مٹاتی ہیں اور ان کے منانے سے مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ میں خود اپنے کو نہیں سمجھ سکی کہ میں کیا ہوں؟ انتقام کا جذبہ بے حد شدید ہے۔ کالج سے واپس آ کر سارا دن آرام کرتی ہوں، گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے۔ کمرہ بند کر کے سوتی ہوں، کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہیں سکون تو مجھے گھر سے باہر ہی ملتا ہے۔ اگر مجمع کے درمیان زیادہ دیر بیٹھی رہوں تو مردرد ہونے لگتا ہے۔ جب رات کے کھانے کے بعد سب لوگ باتیں کرنے کے لئے بڑے کمرے میں جمع ہوتے ہیں تو شدت سے جی چاہتا ہے کہ ان کے درمیان جا کر کوئی ایسی حرکت کر دوں کہ یہ سب بے مزہ بلکہ بد مزہ ہو جائیں۔ تعجب ہے اتنی بری حرکتوں کے باوجود کوئی مزا نہیں دیتا، ڈانٹا نہیں، یہ کیا بات ہے؟ یہ تو بری بات ہے چینی کا کوئی برتن ہاتھ میں آتا ہے تو دل کہتا ہے کہ اسے زور سے زمین پر دے ماروں۔ توڑ پھوڑ سے مجھے قلبی سکون ملتا ہے۔ رئیس صاحب! مجھ میں خود اعتمادی نام کو نہیں۔ بال کی کھال نکالنا اور بات کے پیچھے پڑ جانا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ رئیس صاحب! یہ ہیں میری شخصیت کے بکھرے ہوئے اوراق۔ (ث۔خ)

باریک بحث

دیکھا آپ نے؟ کتنی عجیب لڑکی نے کتنے عجیب انداز سے تحلیل نفسی (یعنی ذہن پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کی تفصیل) بیان کی ہے۔ یہ لڑکی (ث۔خ) پاکی ناپاکی کے جبری وہم میں مبتلا ہے۔ بار بار ہاتھ پاؤں دھوتی ہے، مگر نجاست کا وہم ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ گھر والوں کو ستانے کے لئے یہ سب ڈھونگ رچا

رہی ہوں۔ (یعنی وہم کے علاوہ مردم آزاری کی بھی مریض ہیں) گھر والوں کے ساتھ رویہ بہت بُرا ہے۔ جب کوئی اچھا برتاؤ کرتا ہے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مقصد سے یہ مہربانیاں کر رہا ہے۔ انتقام کا جذبہ بے حد شدید ہے اعصابی حساسیت اس قدر کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ایسا لگتا ہے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ توڑ پھوڑ سے قلبی سکون ملتا ہے، گویا ہماری مریضہ جبری وہم، مردم آزاری، آدم بیزاری (مجمع میں بیٹھتی ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے) شکوک و شبہات انتقام طلبی، تشدد پسندی اور سخت اعصابی حساسیت کا شکار ہے، بظاہر یہ سب ذہنی حالتیں الگ الگ ہیں۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی عارضے کی مختلف شکلیں ہیں۔ ث۔ رخ کی نشوونما میں جو نیزہ اور کبھی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا سبب ابتدائی تربیت ہے، بچہ جس طرح چلنا اور بولنا سیکھتا ہے اسی طرح سوچنا اور صحیح سوچنا اور حقیقت پسندانہ طور پر سوچنا۔ یہ سب ذہنی تربیت کے مختلف مراحل ہیں۔ بچہ جب سوچنا شروع کرتا ہے تو اس کی سوچ کے دائرے میں مختلف خواہشیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کھانے کی خواہش، کھیلنے کی خواہش، چاہے جانے کی خواہش، ناز کرنے اور ناز اٹھانے کی خواہش، ان ساری خواہشوں کی جگہ میں ایک اور خواہش کا درخشاں ہوتا ہے اس خواہش کے اعلانیہ اظہار کو برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ خواہش انسانی جبلت کے قدرتی تقاضے کے تحت بروئے کار آتی ہے کیا ہے وہ خواہش؟ جنسی عمل کے ذریعہ تسکین نفس کی خواہش! آج سے نہیں۔ صدیوں سے مختلف اسباب کی بناء پر جنس اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں کو ناپاک سمجھا جاتا رہا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ جنسی اعضاء فضیلت کے اخراج کا بھی ذریعہ ہیں یعنی بدرو کا کام بھی دیتے ہیں۔ ان اعضاء میں ایک قسم کی بو ہوتی ہے اور غلاظت سے ہمیشہ ان کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ (میں نے اس مرض پر اپنی کتاب ”جنس و جنسیات“ میں مفصل گفتگو کی ہے) ذہنی نشوونما کے کسی نہ کسی مرحلے پر ث۔ رخ کے نفس میں جنسی جذبہ بیدار ہوا، اور چونکہ پہلے سے ذہن میں یہ تصور کا فرما تھا کہ یہ ناپاکی کی بات ہے اس لئے نفس میں جنسی تصور کے ابھرنے کے ساتھ ہی ناپاکی کے تصور

نے اسے دیوبچ لیا۔ اور ث۔ رخ لاشعوری طور پر محسوس کرنے لگیں کہ ان کا جسم نجس ہے۔ یہ بڑی باریک بحث ہے، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ ہم سماجی تربیت اور مذہبی تعلیمات کے پیش نظر جو شعور میں راسخ ہیں۔ جان بوجھ کر ایسی خواہش نہیں کرتے، نہیں کر سکتے جو سماجی ضابطوں، اخلاقی قدروں اور مذہبی ضابطوں کے خلاف ہوں۔ معاشرے ہوں۔ معاشرے نے جنسی عمل پر زبردست پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ آزاد جنسی اختلاط (یعنی بے روک ٹوک شہوت رانی) کے سبب جس طرح فرد کی ذہنی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح سماج میں جو افراد سے ہی مل کر بنا ہے، افراتفری پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہب نے بھی حرام کاری کو شیطانی عمل قرار دیا ہے صدیوں کی تعلیم و تربیت کے سبب جنسی جذبے اور جنسی خواہش کو شجر ممنوعہ قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ذہن کی بالائی تہیں اس عقیدے سے استحکام پاتی ہیں۔ لیکن ذہن کی بالائی تہوں کے نیچے حیوانی جبلت بدستور کار فرما ہے۔ یہ حیوانی جبلت (مثلاً جنسی تسکین کی خواہش) جب بھی ذہن کی سطح پر نمودار ہوگی۔ اپنا روپ بدل لے گی، وہ کسی اور جذبے کی شکل اختیار کر لے گی۔ تاکہ ضمیر کی لعن طعن سے محفوظ رہے۔ انسان بدستور جائے ث۔ رخ کا جذبہ ناپاکی کے وہم میں بدل گیا۔ یہی نہیں چونکہ تسکین نفس سے محروم ہیں۔ لہذا سکون قلب کی دوسری تدبیریں اختیار کر لیں۔ مثلاً سنا کر دکھ دے کر آسودگی حاصل کرنا۔ یا مردم آزاری اور آدم بیزاری، پھر ان کے نفس میں اس قدر بیجان برپا ہے کہ اعصاب برقی تاروں کی طرح حساس ہو گئے ہیں۔ لگھتی ہیں کہ دروازہ کھٹکھٹانے سے دماغ پر ہتھوڑے پڑنے لگتے ہیں۔ یہ شدید اعصابی حساسیت کہ سوئی کی چھن کو بھالے کے زخم کی طرح محسوس کرنا علامت محسوس ہے۔ اس بات کی کہ نفس بڑی طرح بیجانی اور طوفانی بن گیا ہے، میں ث۔ رخ کو S.C.T کی مشقوں کا مشورہ دوں گا ہی۔ بلکہ یہ بھی کہوں گا، انہیں اپنی تحلیل نفسی کی بھی ضرورت ہے۔ وہ خود اپنے ذہن کی چھان بین کریں انہیں اپنے سے تحریری طور پر سوال کرنا چاہئے کہ وہ ناپاکی کے وہم میں کیوں مبتلا ہو گئی ہیں اس ”کیوں“ کا

جواب ان کے اندر پہلے سے موجود ہے۔ وہ خود اس "جواب" کو اپنے اندر ٹٹول کر نکالیں۔ اگر اس کوشش میں ناکامی ہو تو میری طرف رجوع کریں۔ ب۔ س۔ خ کا بہترین علاج مشق تنفس نور اور خود نویسی ہے۔

بے وفا شوہر و محبوب

ایک اور دکھیا خاتون لکھتی ہیں (خط مورخہ 24 اپریل، جمہرات) مجھے ایک لڑکے سے محبت تھی۔ یہ فوج میں کیپٹن تھا۔ محبت کی عمر صرف دو سال تھی، یہ دو سال جنت میں گزرے دو سال کے بعد اس لڑکے نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر لی اور مجھے ایسا لگا کہ مجھے جنت سے زمین پر بیٹھ دیا گیا ہے۔ وہ لڑکا میرا ہے، میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ گھنٹوں بیڑھیوں پر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ کچھ مدت بعد والدین نے مجھے ایک کلرک سے بیاہ دیا۔ افسوس کہ میرے سہاگ کی پہلی رات جلتے انگاروں کے بستر پر تڑپتے گزری سرتاج اول تو حجلہ عروسی میں آنے کو تیار ہی نہ تھے، زبردستی دھکیل کر لائے گئے۔ تو الگ بیٹھے رہے، بڑے روکھے پھیکے لہجے میں گفتگو کی۔ وہ رات زندگی کی سب سے بُری رات تھی۔ شوہر جیسے آئے تھے ویسے ہی سدھار گئے۔ دوسرے دن سے لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، عاجز آکر طلاق لے لی۔ طلاق بھی بڑی مشکل سے ملی۔ ہاں یہ عرض کر دوں، کہ طلاق سے پہلے وہی لڑکا وہی بے وفا محبوب ملنے آیا، اور یہ ٹھیک فرمائی کہ ذرا سوچ سمجھ کر طلاق لینا۔ اب میں سروں کر رہی ہوں، شوہر کو بھی بھول چکی ہوں، محبوب کو بھول چکی ہوں۔ لیکن میں نے تسکین جسم و نفس کے لئے بڑی گندی عادتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ خدا کے لئے مجھے ان عادتوں سے نجات دلوائے۔ (ناظم آباد)

عقد ثانی

بی بی تم نے بیوفا محبوب اور ناکارہ شوہر کی جو کہانی سنائی ہے وہ ہر عورت سے نہیں تو اکثر عورتوں سے سنی جاسکتی ہے۔ نہ محبت میں ناکامی کوئی عجوبہ چیز ہے اور نہ

ازدواجی زندگی میں ناکامیابی کوئی تعجب انگیز سانحہ! بی بی! مت سمجھو کہ تقدیر نے صرف تم کو ہی اپنا ہدف بنایا ہے۔ نہ جانے کتنی روحیں زخم خوردہ ہیں اور زخم بھی اسی قسم کے جن کی اذیت تم سہم رہی ہو یا سہم چکی ہو۔ الحمد للہ کہ تم نے بے وفا محبوب اور ناکارہ شوہر کو بھلا دیا۔ میں اس صبر و ضبط پر تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ تم نے چند گندی عادتوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن چار صفحے کے اس خط میں گندی عادتوں کی تفصیل نہیں لکھی، خیر تفصیل کی ضرورت بھی نہیں۔ میرا بزرگانہ مشورہ ہے کہ عقد ثانی عیب ہے، نہ عقد ثالث، اور نہ ہی کسی پر یہ پابندی لگائی جاسکتی ہے کہ وہ صرف ایک ہی قسم کی غذا کھایا کرے؟ دوسری تمام غذائیں ممنوع ہیں۔ تو عزیزہ جو سہولتیں ہم اشتہا کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں۔ وہ شہوت کے سلسلے میں کیوں نہیں روا رکھی جاسکتیں، کیا مسلمان عورت کو شریعت نے اس امر کی اجازت نہیں دی؟ تو جو چیز شرعاً جائز ہے، وہ رسماً کیوں جائز نہ ہوگی۔ کیا ہمارے رسم و رواج احکام قرآن اور ہدایات حدیث پر فوقیت رکھتے ہیں؟ نہیں تم عقد ثانی ضرور کر لو، اور پھر مجھے مطلع کرو۔

ل۔ م۔ کا بیان فرما۔۔۔۔۔ آمین

میری حالت بے حد قابل رحم ہے۔ کثرت افکار نے بوڑھا کر دیا ہے، بال سفید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شادی کو پندرہ برس میں ایک دن بھی سکون کا سانس نہ لے سکی۔ آٹھ سال بعد خدا نے ایک بچی دی، وہ بھی گھر کے پریشان کن حالات سے متاثر ہے۔ شوہر سخت بد مزاج واقع ہوئے ہیں۔ کبھی ایک محبت کا جملہ ان کی زبان سے ادا نہیں ہوا، بات بات پر جھڑکیاں، گالیاں دیتا، یہ ہے ان کا شعار۔ ان پندرہ سال میں دس سال میں نے میکے میں گزارے، لیکن بڑی تکلیف سے! مالی مجبوریوں کے سبب پھر شوہر کی طرف واپس آگئی، ذہنی مریضہ ہوں۔ آدم بیزار ہوں۔ کہیں آنے جانے کا سوال ہو تو اختلاج قلب ہونے لگتا ہے۔ سخت احساس کمتری میں دبی پڑی ہوں، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو جسم میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کی موت کا تصور ذہن پر

چھایا رہتا ہے۔ یہ تصورات مجھے دیمک کی طرح چائے جا رہے ہیں۔ خدا را کچھ تجویز کیجئے، کہ میں کیا کروں؟

دو سوال

ل۔ م دعائیں۔ ازدواجی زندگی تو صرف پندرہ سال قبل شروع ہوئی ہے۔ ان پندرہ برسوں سے قبل تمہاری ذہنی حالت کیا تھی؟ میرا خیال ہے کہ ہر نفسیاتی معالج کو اپنے مریض سے دو سوال ضرور کرنے چاہئیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ تم جس ذہنی الجھن میں مبتلا ہو، تمہارے خیال میں اس ذہنی الجھن کا سبب کیا ہے؟ یقین کیجئے ہر نفسیاتی مریض کو لاشعوری طور پر علم ہوتا ہے۔ یعنی کسی نہ کسی طرح وہ جانتا ضرور ہے، گو مانتا نہیں۔ کہ اس کی فلاں نفسیاتی پیچیدگی کا سبب فلاں اور فلاں ہے۔ مریض اپنی ذہنی پیچیدگی کا تجزیہ کتنی ہی پیچیدگی سے کیوں نہ جانے، باخبر معالج اس کے الجھاؤ سے واقف ہو سکتا ہے دوسرا سوال ہر نفسیاتی مریض سے یہ کرنا چاہیے کہ تمہارے خیال میں اس ذہنی اور نفسیاتی الجھن کا علاج کیا ہے۔ ہر کوئی مریض معالج سے گفتگو کرتے وقت ایسے اشارے دیتا چلا جاتا ہے۔ (گو وہ اشاروں کی اہمیت اور معنویت سے واقف نہ ہو) جن سے معالج کا سیاق تشخیص (مرض کا سبب کیا ہے) اور مناسب تجویز (مرض کا علاج کیا ہے) کر سکتا ہے۔ ل۔ م نے اپنی جن پریشانیوں کا ذکر کیا ہے؟ ان کے اسباب لاشعوری طور پر انہیں معلوم ہیں۔ درحقیقت وہ اس شادی سے مطمئن نہیں۔ وہ جس قسم کی گرجوش محبت کی توقع اپنے شوہر سے رکھتی تھیں وہ انہیں نہ مل سکی۔ قہر بالائے قہر یہ کہ شوہر بھی بیوی کی طرف آسودہ خاطر نہیں۔ پھر کیا کیا جائے؟ ل۔ م تم ایک مرتبہ تکلیف کرو۔ میں غیب داں نہیں کہ تمہاری ابتدائی زندگی (شادی سے قبل) کے حالات بیٹھے بیٹھے معلوم کر سکوں۔ اگر تمہاری نظر سے یہ مضمون گزرے، تو نہایت اختصار کے ساتھ ان دونوں سوالوں کا جواب دو۔ (1) تمہارے خیال میں اس خوف اس بے اعتمادی اور اس احساس کمتری کا سبب کیا ہے۔ یا کیا ہو سکتا ہے؟ اور (2) تم ان کمزوریوں پر کس طرح غالب آ سکتی ہو۔ ان دونوں

سوالوں پر غور کرتی رہو۔ جواب خود بخود اندر سے نکل آئے گا، ہمیشہ مختصر خط لکھا کرو۔ (یہ نصیحت سب حضرات کے لئے ہے)

نسل نو کے امراض

ابراہیم شیخ، بہادر خان، پیارے میاں، تسلیم احمد، شراحہ، جمال الدین حیدر سید، وحید جاوید، یاد علی، ذوالفقار نقوی، صابر حسن، نوید میاں، رئیس احمد ظاہر، صالح محمد (وغیرہ وغیرہ) تم سب کے خطوط کا مضمون مشترک ہے۔ تم سب نے ایک ہی مرض کا ذکر کر کے اس کا علاج دریافت کیا ہے۔ تم سب کی عمر سولہ سترہ سے لے کر بیس سال تک ہے۔ میں نے تم سب کے خطوط اس ڈھیری میں سے منتخب کئے ہیں، جو غیر شادی شدہ افراد کے خطوط پر مشتمل ہے۔ اچھا اب سنو۔ یہ کوئی مرض نہیں، جس میں تم مبتلا ہو، نہ یہ بخار ہے، نہ جاڑا، نہ زکام، نہ کھانسی خدا نخواستہ کوئی مہلک بیماری! تم خود لذتی کا لفظ اس طرح ڈر ڈر کر زبان پر لاتے ہو۔ جیسے کسی نے منہ میں انگارہ ٹھونس دیا ہے، یا ہونٹوں کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ نہیں تمہاری جان کی قسم کوئی ایسی بات نہیں۔ تمہیں ایک عادت لگ گئی ہے۔ تم میں سے کئی لاکھوں نے جنسی کج رویوں کو ”نسل نو کے امراض“ لکھا ہے۔ حالانکہ اس تمام میں بوڑھے اور بچے سب ننگے ہیں۔ جنسی کج روی باوا آدم سے لے کر آج تک ہمارے کردار میں داخل ہے۔ بنی آدم کی کوئی ایسی نسل وجود میں نہیں آئی جس نے ہمیشہ جنسی اور ذہنی طور پر نارمل اور معتدل زندگی بسر کی ہو، نہ مستقل قریب میں اس کا کوئی امکان ہے، سوال یہ ہے کہ اس عادت کو کیوں ترک کیا جائے۔ اس سلسلہ میں تمہیں چند احتیاطیں کرنی پڑیں گی۔ ایسی کتابیں مت پڑھو جن سے نفس میں ہیجان (اہال) پیدا ہو۔ ایسی گفتگو میں حصہ نہ لو، جن سے تمہارے جذبات بھڑک اٹھیں۔ ایسی تصویریں (فلم، ٹی وی، اخبارات و رسائل) مت دیکھو جن سے دماغ میں کوئی شعلہ بھڑک اٹھے۔ صبح سویرے اٹھو، غسل کرو۔ اس کے بعد ٹیلے نکل جاؤ۔ کسی پارک میں جاگھسے، کسی میدان میں دوڑنے لگے، روزانہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، اپنے جسم کو

دیکھو، باز و بھرے بھرے ہیں یا نہیں، سینہ چوڑا ہے یا نہیں۔ آنکھیں چمکدار ہیں یا نہیں، چہرے پر ہوائیاں تو نہیں اڑ رہیں۔ تمہاری شخصیت کا انحصار تمہارے جسم کی خوبصورتی اور اعضاء کے تناسب پر ہے۔ خود لذتی سے لازمی طور پر ذہنی کمزوری پیدا ہوتی ہے اور ذہنی کمزوری لامحالہ جسم پر اثر انداز ہوتی ہے اور آدمی اپنے کو مذہال سمجھنے لگتا ہے۔ بچو! باحوصلہ اور بہادر لڑکے اور لڑکیاں وہ ہیں جو ہر نقصان رساں عادت کو ایک دم ترک کر دیں۔ ”بھئی اب تو ہم یہ نہیں کریں گے۔“ یہ کہا، گردن کو جھکا، دل میں عہد کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس قید سے آزاد ہو گئے۔ مگر شاید تم یہ نہ کر سکو۔ یہاں تو قدم قدم پر ایسے مناظر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہ خواہواہ جی مچلنے لگے۔ تم خود لذتی کے بھوت سے کتنے خوف زدہ ہو گئے۔ اس بھوت کی لمبائی چوڑائی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ان عادتوں سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں، ڈرے اور مرے۔ ان عادتوں کی وجہوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے تم دلیری کے ساتھ اس موضوع پر غور کرو۔ ہر مرتبہ خود لذتی سے قبل اور بعد کا غور کر بیٹھ جاؤ اور ان تمام ذہنی کیفیات کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کر دو۔ جن سے اس عمل سے قبل تم دوچار ہوئے تھے اور فارغ ہونے کے بعد جن کا احساس ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ چند ہی روز میں تم میں اتنی قوت مقابلہ پیدا ہو جائے گی کہ خود لذتی اور ہم جنس پرستی اور دوسری جنسی کج رویوں کے بھوت کا مقابلہ کر سکو۔ پیارے یہ نسل نو کے امراض نہیں، یہ ان کی عادات ہیں۔

تائے کا لڑکا

تمہارے تائے کے لڑکے جن سے تمہاری منگنی ہوئی تھی۔ تمہارے لفظوں میں ایک روحانی اور پراسرار شخصیت کے مالک ہیں۔ منگنی میں رکاوٹ اس لئے پڑی کہ وہ تایازاد بھائی ہندوستان میں تھے اور تم پاکستان میں، تمہارے والد ماجد کا اصرار تھا۔ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آجائیں، تاکہ شادی کی رسم بخیر و خوبی انجام پائے۔ مگر وہ (تایازاد بھائی) اپنے حالات سے مجبور تھے، چنانچہ یہ نسبت کھٹائی میں پڑ گئی۔ تم نے لکھا

ہے کہ ابتداء میں میرے منگیتر نے یہ فیصلہ کر لیا تھا، کہ وہ کہیں شادی نہ کریں گے۔ لیکن چند سال بعد بڑے بھائی نے انہیں راضی کر لیا۔ تم نے (ع۔ص) لکھا ہے کہ اس خبر سے سب کو حیرت ہوئی اور میں روتے روتے بے حال ہو گئی۔ (سچ سچ اتنی پرانی منگنی کا اس طرح ٹوٹ جانا دردناک سانحہ تو ہے) تاہم تم نے یہی مناسب سمجھا کہ جہاں ان کی شادی ٹھہری ہے، وہیں ہو جائے اور اب اس رشتہ کو کوئی قطع نہ کرے۔ چنانچہ تم نے خطوط کے ذریعہ انہیں مجبور کرنا شروع کیا۔ کہ وہ ضرور بالضرور شادی کر لیں اور کسی موہوم مستقبل کے سہارے اپنی جوانی ضائع نہ کریں۔ اس کے جواب میں تمہارے سابق منگیتر (تایازاد بھائی) نے لکھا ہے کہ ذہنی طور پر میں اپنے کو مجرم سمجھتا ہوں۔ حالانکہ میں نے دانستہ کوئی جرم نہیں کیا، میں بالکل بے خبر رہا، وقت گزرتا رہا، یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ اٹھا تو پتہ چلا کہ جرم سرزد ہو گیا ہے، میری نظروں میں قتل اتنا بڑا جرم نہیں جتنا بڑا یہ جرم کہ کسی کے جذبات و احساسات کا خون کر دیا۔ اسی طرح خط و کتابت جاری رہی۔ کچھ دن بعد وہ اعزاء کے طلب کرنے پر پاکستان آئے۔ تم نے لکھا ہے کہ ہم سب نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ اگرچہ وہ اپنے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر ان کا حال عجیب تھا۔ اس قدر نادم تھے، کہ خدا کی پناہ (حالانکہ یہ ندامت بے سبب تھی۔ منگنی کے ٹوٹنے میں ان کا قصور نہ تھا، کوتاہی تو ہماری ہی طرف سے ہوئی تھی) اب میں ان کی منسوبہ نہیں، بے پناہ محبت کرنے والی بہن تھی، ہاں عرض کر دوں، کہ ہندوستان میں ان کا صرف رشتہ طے ہوا تھا، ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہم سب نے اصرار کیا تھا کہ آپ شادی کر لیں۔ کہنے لگے کہ جب تک ع۔ص کی شادی کہیں نہ ہو جائے گی۔ میں ہرگز ازدواجی زندگی اختیار نہیں کر سکتا، چند روز کے بعد وہ کراچی سے ہندوستان واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے خط لکھا کہ پہلے صرف ایک ہی تمنا تھی کہ تم لوگوں کو دیکھ لوں اور اپنی صورت دکھاؤں، خیال تھا جب یہ تمنا پوری ہو جائے گی۔ (تمہیں دیکھ لوں گا تم سے مل لوں گا) ایک طرح کا سکون میسر آ جائے گا، یہ کسے علم تھا کہ چند روز کی ملاقات

عمر بھر کا روگ بن جائے گی۔ ایک تمنا تو پوری ہوگئی، تمہیں دیکھ لیا۔ مگر اس کے ساتھ دل میں ہزاروں خواہشیں جاگ اٹھیں (اور بہت سی باتیں لکھنے کے بعد تم نے لکھا ہے کہ) انہوں نے بادل ٹھوس شادی کر لی اور اب وہ ایک ناکام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ع۔ ص ہماری زندگیوں افسانوں اور ناولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تم نے جو سچے واقعات لکھے ہیں۔ ان کو ترتیب دیا جائے، تو ایک مؤثر ناول بن سکتا ہے (بی بی! تمہارا خط چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ میں اس کا جواب چھ لفظوں میں دوں گا، ان کی شادی ہو چکی ہے۔ (حق تعالیٰ انہیں سکون قلب عطا فرمائے) اب تم بھی ازدواجی زندگی اختیار کرنے کی طرف توجہ دو۔

غم فراق کا تنہا علاج دوری ہے
دل حزیں! یہ کنارہ کشی ضروری ہے

☆☆☆

صوبائی تعصبات

آپ کی یہ بی بی آپ کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ایک عظیم ہستی سے مخاطب ہوں۔ (نہیں بی بی! یہ تمہارا حسن ظن ہے، کوئی انسان عظیم نہیں عظمت میں تمام عالم انسانیت کا حصہ ہے۔ ہم سب شریک ہیں) آہ ہم نے بہاریوں کو بھلا دیا۔ مجھے بنگلہ دیش کے بہاریوں کی عظمت کا احساس یکا یک ہوا۔ ایک عزیزہ ہسپتال میں داخل تھیں۔ مجھے ان کی تیمارداری کے لئے دو تین روز ہسپتال میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ صبح و شام دو ڈاکٹر آتے تھے، صبح کے آنے والے مغربی پاکستان کے رہنے والے اور شام کی ڈیوٹی بجالانے والے بہاری۔ مغربی پاکستان کے بزرگ نے کبھی مزاج نہیں پوچھا آئے۔ رپورٹ پڑھی، کچھ اندراجات کئے اور چلے گئے۔ میں چونکہ میڈیکل کے سال اول میں ہوں، اس لئے ڈاکٹروں کی بہت قدر کرتی ہوں۔ جب بھی یہ مغربی پاکستانی ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے آتے تھے میں احتراماً کھڑی ہو جاتی۔ وہ ذرا بھی توجہ نہ کرتے شام کو بہاری ڈاکٹر آتے۔ سلام میں پیش قدمی کرتے، الغرض ان کا اخلاق بے مثل تھا۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر سے پوچھا، آپ بہاری ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں پاکستانی ہوں، میں اپنے سوال پر بے حد شرمندہ ہوئی، رئیس صاحب! کیا بات ہے کہ دوسروں کو غمزہ دیکھ کر غمزہ ہو جاتی ہوں۔ اب یہ کیفیت حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے اور میں اس سے سخت پریشان ہوں۔

اکیس مرتبہ

تمہارا خط بہت طویل تھا، میں نے اس کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور وہ حصہ بھی چھاپ دیا ہے۔ تم نے جس کی نہ چھاپنے کی تاکید کی تھی۔ سبب یہ ہے کہ اس خط کا سب سے جاندار کلڑا بھی بہاری بنگالی مسئلہ ہے۔ فطرت نے اس قسم کی کوئی تفریق اور تقسیم نہیں کی یہ بہاری ہے وہ بنگالی ہے، یہ ہندوستانی ہے، وہ پاکستانی ہے، یہ گورا ہے، وہ کالا ہے،

یہ امیر ہے، وہ غریب، یہ حبشی ہے وہ امریکی، یہ مومن ہے وہ کافر، یہ دیواریں بدنصیب آدم زاد نے اپنے ہاتھوں کھڑی کی ہیں۔ آؤ۔ ان دیواروں کو ڈھادیں۔ مجھے امید ہے کہ تم زندگی بھر اس قسم کی تفریقوں اور تقسیموں کے خلاف جنگ آزما رہو گی۔ اب رہیں تمہاری ذہنی حالتیں! تو اس عمر میں یہ پراگندہ خیالی یہ دماغی تلاطم، یہ شورش انگیزی اور یہ شدید اثر پذیری ہوا ہی کرتی ہے اس کو زیادہ اہمیت نہ دو، سونے سے قبل، جب نیند آنے لگے، تو حسب ذیل فقرہ کم سے کم (21) مرتبہ دہراؤ۔ فقرہ دہراتے نیند آجائے۔ تو بہتر ہے، فقرہ زبانی یاد کرلو۔ ”میں اپنی تمام الجھنوں پر غالب آکر صحت و طاقت کا مجسمہ بنتی چلی جا رہی ہوں۔“

مانچسٹر سے

حال ہی میں آپ کا مضمون ”وہم اور تکرار خیال“ نظر سے گزرا، میرا خیال بھی یہی ہے۔ میں اکثر اپنے ہوش میں نہیں رہتی، یوں تو دنیا کے سارے کام دھندے کرتی ہوں مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ میرے اندر دو رو ہیں۔ کبھی یہ احساس کہ بالکل کھوکھلی ہو گئی ہوں اور روح بدن سے غائب ہو گئی ہے، میں اپنے سے خوفزدہ رہتی ہوں، خود کو دیکھ کر ڈر جاتی ہوں۔

اپنے ہاتھ پاؤں کو حیرت سے دیکھتی ہوں۔ کبھی جینے کی تمنا ہوتی ہے، کبھی موت کی۔ گاہے گاہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے یا دل نوج رہا ہے، جی ہر وقت گھبراتا ہے، خود سے پوچھتی ہوں۔ یہ میں ہوں، کون ہوں، رونے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ میرے ساتھ کوئی اور ”نادیدہ روح“ ہے یہ تمام حرکتیں کرا رہی ہے۔ میری عمر تقریباً بائیس سال کی ہے، شادی کو دو سال ہو گئے ماں نہیں بنی، ماں بننے کی خواہش نہیں۔ بہت جلد مر جاؤں گی، تو کیوں بچے جنوں؟ رئیس صاحب! آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بچپن میں بے حد اثر پذیر تھی۔ زمانہ طالب علمی کی ذہن ترین لڑکیوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔ لیکن اب

جو لکھا پڑھا تھا ریاض نے اُسے آہ دل سے بھلا دیا جاہل مطلق بن کر رہ گئی ہوں جی ہاں۔ رئیس صاحب میں اپنے سے خوفزدہ رہتی ہوں۔ خوف میرا تعجب ہے۔ آہ، میں خوف اور تعجب کی مریض ہوں۔ شاید میں اپنے مرض کو پہچانتی ہوں۔ اپنا علاج خود کر سکتی ہوں مگر کس طرح؟ بے حد حساس، بد مزاج اور احساس کمتری کی مریضہ ہوں۔ میں کس طرح اپنے جذبات و خیالات پر ایک دم قابو پا سکتی ہوں؟ قوت فیصلہ کا پتہ ہی نہیں گزری ہوئی باتیں گھڑی گھڑی ذہن میں آتی ہیں ہمیشہ والدین کی محبت سے محروم رہی، بچپن والد اور والدہ کی لڑائی میں گزرا۔ اس طرح میری شخصیت ٹوٹ پھوٹ گئی، میں ریزہ ریزہ اور پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ تقریباً بارہ برس کی تھی گرمیوں کی ایک دوپہر کو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ ٹیٹھی شطرنج کھیل رہی تھی کہ پیاس لگی۔ پانی کے مٹکے کے قریب گئی، دیوار پر چھپکی نظر آئی۔ امی سے کہا کہ گھر میں چھپکلیاں بہت ہو گئی ہیں، کچھ ان کا بندوبست کرنا چاہئے۔ چھوٹی بہن نے کہا بارہ بجے ہیں، یہ شیطان کا خاص وقت ہے، ہوشیار رہنا میں بننے لگی۔ پانی پیا تو گلے میں خراش محسوس ہوئی، متلی ہوئے گی، اُلٹیاں آنے لگیں۔ سب حیران تھے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے، میرا کہنا تھا کہ چھپکلی نکل گئی ہوں۔ الغرض کئی مہینے تک بیمار رہی، جب میٹرک میں تھی تو ازراہ حماقت ہیڈ مسٹریس سے دشمنی مول لے لی۔ ہیڈ مسٹریس عملیات میں ماہر تھیں روجوں کو بلایا کرتی تھیں۔ کہتی تھیں جسے اپنے مردہ عزیزوں سے بات کرنا ہو میرے پاس آئے۔ وہ ادھیڑ عمر کی شادی شدہ عورت تھیں، خیر اس نے مجھے بددعا دی کہ ”تو عمر بھر تڑپتی رہے گی“ بددعا نشانے پر لگی اور میں اب تک تڑپ رہی ہوں، شاید عمر بھر تڑپتی رہوں۔ جب فرسٹ ایئر میں آئی تو میری پرنسپل (جو نفسیات میں ایم۔ اے تھیں) کہنے لگیں۔ لڑکیو اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تم خود کیا ہو؟ دیکھو۔ روح میں ڈوب کر سوچو۔ تمام لڑکیاں ہنسنے لگیں، میں بھی اس سوچ میں پڑ گئی کہ میں کیا ہوں؟ اس روز سے اب تک سوال میرے اندر گھوم رہا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مر جاؤں گی اور جب مرنے کی

خواہش کرتی ہوں، تو خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ رئیس صاحب! کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ مجھے شخصیت کی از سر نو تعمیر کس طرح کرنی چاہئے۔ ازراہ کرم میری رہنمائی کیجئے۔ میں اس ملک (انگلستان) میں اکیلی ہوں۔ ذہنی پریشانی سے نجات پاؤں۔ تو اس قابل ہو سکتی ہوں کہ دوسروں کے کام آسکوں۔ اگر میں اپنے کو نہ سنبھال سکی تو ہو سکتا ہے کہ میرے شوہر مجھے پاگل خانے میں داخل کرادیں، اور میری دعا یہ ہے کہ میں پاگل خانے جائے بغیر ٹھیک ہو جاؤں۔ میرا نام ”ن“ سے شروع ہوتا ہے اور والدہ کے نام کا پہلا حرف بھی ”ن“ ہی ہے یہ تفصیل اس لئے لکھ دی ہے، شاید استعارے میں اس کی ضرورت محسوس کی جائے۔ (از MANCHISTER. 14)

دو روحیں

نہیں تم پاگل خانے نہیں جاؤ گی۔ ہم تمہیں پاگل خانے نہیں جانے دیں گے، تم پاگل نہیں ہو، ہم نے استعارہ بھی کیا اور استعارہ بھی۔ استعارے میں غیبی قوتوں سے سوال کا جواب حاصل کیا جاسکتا ہے اور استعارے میں ذہن سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ خدا سے بھی مدد مانگی اور اپنے سے بھی کمک طلب کی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ نہ تم پر آسیب کا اثر ہے نہ جن کا نہ تم پر کوئی عمل کرایا ہے، نہ جادو، تم نفسیاتی مریضہ اور ”شیزوفریا“ کی شکار ہو۔ شیزوفریا کو مانجھ لیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مرض میں انسانی ذہن دو، کبھی تین، کبھی چار حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ ”محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر دو روحیں ہیں“ بے شک دو روحیں ہیں۔ تمہاری شخصیت پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے، شخصیت کا ایک حصہ دوسرے حصے سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ جب تم پر منفی (تخریبی) شخصیت غالب آتی ہے۔ تو تم محسوس کرتی ہو کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس سے ڈر جاتی ہو، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں بالکل کھوکھلی ہو گئی ہوں، کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ میرے ساتھ کوئی نادیدہ روح ہے جو مجھ سے یہ تمام حرکتیں کر رہی ہے۔ کون ہے وہ نادیدہ روح جو ان حرکتوں پر ابھارتی ہے؟ وہ تمہاری شخصیت۔ تمہارے

ذہن تمہارے نفس کا وہ باغی حصہ ہے جو تمہاری گرفت سے آزاد ہو کر من مانی کرنے لگتا ہے۔ جب تمہارے ذہن کا مثبت یعنی حقیقت پسند رخ ابھرتا ہے تو پھر تم اپنے کو ملامت کرنے لگتی ہو۔ اور ہاں بی بی! تمہارے خط میں ایک عجیب فقرہ نظر سے گزرا، لکھتی ہو کہ ”میرا خوف میرا تعجب ہے۔“

بظاہر اس فقرے کے کوئی معنی نہیں۔ مگر اس قسم کے بے معنی فقرے بے حد بامعنی ہوا کرتے ہیں تم نے لکھا ہے کہ میں خوف اور تعجب کی مریضہ ہوں۔ سچ ہے، مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ تم نے پوچھا ہے کہ میں کیا کروں؟ تم صرف S.C.T کی مشق تنفس نور کرلو۔ اس سلسلہ میں براہ راست خط و کتابت ضروری ہے۔

☆☆☆

مرچو

امین